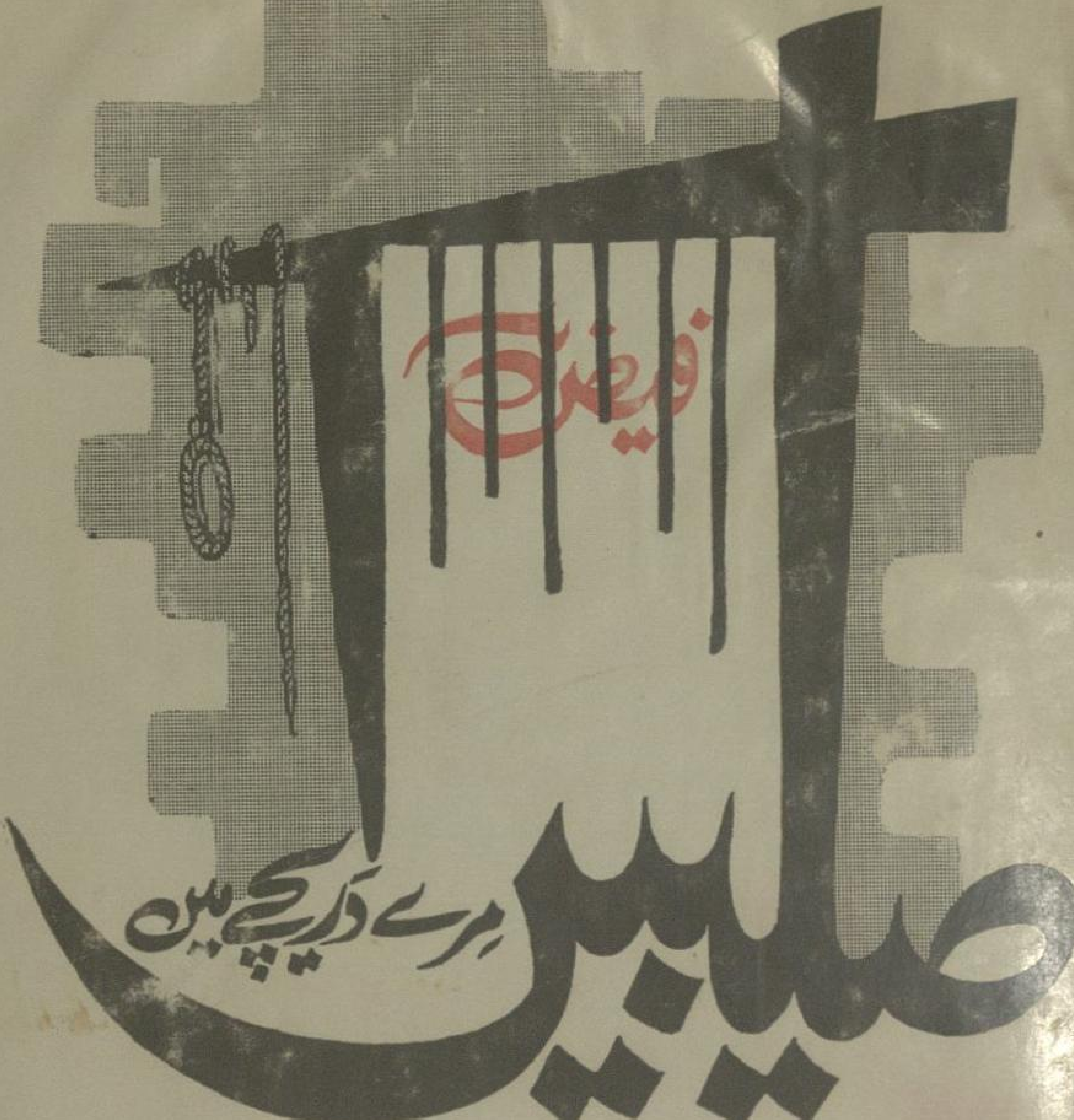
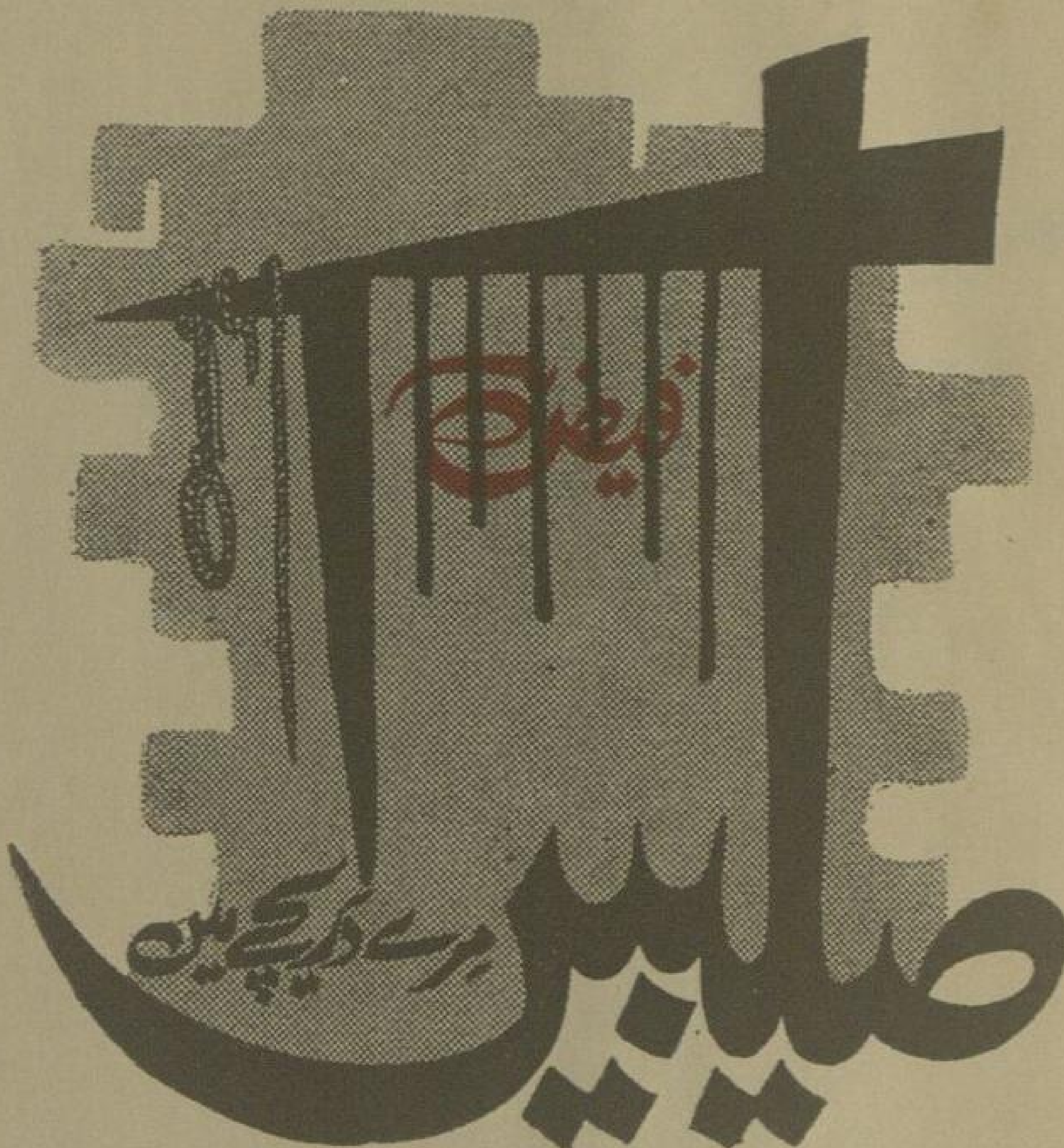

فیض
صلیبیں
مرے دریچے میں


فیض
صلیبیں
مرے دریچے میں

صلیبیں مرے دریچے میں

ایّامِ اسیری کے ۱۳۵ خطوط

مرتّب
مرزا ظفر الحسن

قیمت ـــــــ ۱۱ روپے
ضخامت ـــــــ ۲۲۴ صفحے

ناشر

پاک پبلشرز لمیٹڈ

وکٹوریہ چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ (سابق وکٹوریہ روڈ) کراچی

مشہور آفسٹ پریس۔ کراچی

فہرست

چھیمی اور میزو کے نام

گزارشِ احوالِ واقعی

اس کتاب میں جو خطوط شامل ہیں وہ تو میں نے ہی لکھے تھے لیکن یہ کتاب نہ میں نے لکھی ہے نہ چھپوائی ہے، اسے لکھوانے اور چھپوانے کے واحد ذمہ دار ادارۂ یادگارِ غالب والے مرزا ظفر الحسن ہیں۔

اب سے چند ماہ پہلے مرزا صاحب نے تقاضا شروع کیا کہ میں اپنی سرگزشت یا تجرباتِ زندگی وغیرہ کے بارے میں کچھ لکھوں، وہ اصرار کرتے رہے اور میں ٹالتا رہا آخر پیچھا چھڑانے کی خاطر میں نے یہ خطوط بیوی سے لے کر ان کے حوالے کئے کہ ان میں کانٹ چھانٹ خود ہی کر لیجیے، اس کے بجائے وہ نہ صرف ان خطوط کی اشاعت کے درپے ہو گئے بلکہ ان کے ترجمے پر بھی مجھ ہی کو مامور کر دیا۔ بات یہیں تک رہتی تو مضائقہ نہ تھا اس لئے کہ ہمیں کام چوری کے بہت سے گر یاد ہیں لیکن یہ حضرت کاغذ قلم سنبھال سر پر سوار ہو گئے کہ آپ ترجمہ لکھوائیے میں لکھتا ہوں۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی ادبی تصنیف نہیں ہے، نجی خطوط ہیں جو قلم برداشتہ لکھے گئے ہوں۔ کسی مربوط اور سنجیدہ بحث کی تلاش بے کار ہے، صرف اتنا ہے کہ جیل خانے میں دفع الوقتی کے بہت ہی محدود ذرائع میں سے ایک ذریعہ خط و کتابت بھی ہے اس لئے کوئی حکایت لذیذ ہو یا نہ ہو اسے خواہ مخواہ دراز کرنے کو جی چاہتا ہے، موسم کی بات ہو، کسی کتاب کا تذکرہ ہو یا داخلی محسوسات کا بیان ہو لیکن یہ سب قصے تفصیلی فکر و تجزیے کے بغیر بیشتر سطحی سے انداز میں لکھے جاتے ہیں جن سے لکھنے والے کی افتادِ طبع کے بارے میں شاید کچھ واقفیت حاصل ہو سکے لیکن اِن موضوعات کے بارے میں زیادہ بصیرت بہم نہیں پہنچ سکتی۔

اس کے علاوہ ایسے خطوط میں تسلسل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ٹیپ کے مصرعے کی طرح کچھ باتیں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ کتابی صورت میں یہ تکرار شاید اچھی نہ لگے۔ اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ خطوط اردو میں نہیں انگریزی میں لکھے گئے تھے، ایک زبان کے منفرد الفاظ کا ترجمہ کچھ ایسا مشکل کام نہیں اور مفہوم کی ادائیگی میں بھی کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی لیکن انگریزی کا روزمرّہ کا لہجہ اور ہے اردو کا اور۔ ہر زبان کی طرح انگریزی کے روزمرّہ محاورے، تلمیحات، ضرب الامثال کہاوتیں وغیرہ وغیرہ اسی زبان سے مخصوص ہیں اور بہت سی محنت اور تلاش کے بغیر انھیں اُردو میں منتقل کرنا محال ہے لیکن مرزا ظفر الحسن نے محنت اور تلاش کی مہلت ہی کب دی ہے۔ جیسے قلم برداشتہ یہ خطوط لکھے گئے تھے ویسے ہی "منھ زبانی" ان کا ترجمہ کیا گیا ہے اور زبان و بیان کی ان کوتاہیوں کی ذمّہ داری بھی مرزا صاحب ہی کے سر پر ہے۔

مجھے ان خطوط کی اشاعت کا ایک ہی جواز نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ ہمارے ہاں بہت سے لوگوں کے لئے قید و بند کوئی غیر متوقع سانحہ یا حادثہ نہیں بلکہ معمولاتِ زندگی میں داخل ہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ ہمارے شعبۂ عمرانیات میں "حبسیات" بجائے خود ایک موضوعِ تحقیق ٹھہرے، اس صورت میں شاید خطوط طویل اسیری کے نفسیاتی تجربے کا ایک آدھ پہلو اُجاگر کرسکیں۔

فیض احمد فیضؔ

کتاب اور صاحبِ کتاب کی کہانی

" جناب فیض احمد فیضؔ کو فیضؔ صاحب لکھنا مجھے اتنا ہی ناگوار معلوم ہوتا ہے جتنا کہ غالب کو غالبؔ صاحب یا اقبال کو اقبالؔ صاحب کہنا۔ بلکہ مجھے تو یہ اِن کے لئے بدگوئی اور اپنے لیے بدذوقی محسوس ہوتی ہے اس لیۓ میں فیضؔ ہی لکھوں گا جس میں احترام بھی ہے اور پیار بھی"۔

اوپر کی تحریر فیضؔ کی سوانح حیات "عُمرِ گزشتہ کی کتاب" کی ابتدائی سطریں ہیں جو میں آجکل لکھ رہا ہوں اور جسے میں اَپنے لئے ایک اعزاز سمجھتا ہوں۔ فیضؔ کی ہر تخلیق چاہے وہ شعر ہو، نثر یا نجی مکتوبات کی صورت میں، بلاشبہ ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ ایلس فیضؔ کے نام لکھے ہوئے خطوط جو ایک طرف فیضؔ کے فکر و نظر کے نقش ہائے رنگ رنگ ہیں اور دوسری طرف خود ان کے خط (۲) کے مطابق "پرائیویٹ نہیں پبلک" ہیں کتابی صورت میں ضرور شائع ہوں۔

یہی خیال آج سے اٹھارہ سال پہلے ایلس نے ظاہر کیا تو فیضؔ نے اپنے خط (۷۹) میں جواب دیا تھا "کاش ایسے قِصّوں کا فیصلہ کرنے کے لئے اے ایس بی (پطرس بخاری) یہاں ہوتے۔ بہر صورت اگر انہیں چھپوانے کا فیصلہ کرو تو یہ اردو میں چھپنے چاہئیں"۔ چنانچہ ایلس نے فیصلہ کیا کہ خطوط چھپیں اور اردو ہی میں چھپیں تاکہ حق دار کو حق مل جائے یعنی شعری تخلیقات کی طرح نثری تخلیقات بھی ادب کے قبضے میں آجائیں۔ البتہ "بہ شرکتِ ایلس"۔ "بہ شرکتِ ایلس" کی تفصیل یہ ہے۔

اپنی جان سے زیادہ عزیز اور قیمتی سمجھ کر ان خطوط کو بیس سال تک حفاظت کے ساتھ

رکھنا اور اب ان کی اشاعت کی اجازت دینا ایلس فیض کا ایک احسان ہے۔ کسی فرد یا ادارے پر نہیں بلکہ ادب پر۔ نہ صرف خط محفوظ رکھے بلکہ ہمیشہ ضرورت مند مدیروں کو جب بھی انہوں نے مانگا، ان کی نقلیں ٹائپ کر کے دیں۔ خط ملتے ہی اُن پر تاریخ لکھ دی۔ فیض خط پر اکثر صرف دن ہی لکھا کرتے تھے اور جو کبھی کبھار تاریخ درج کی بھی ہے تو مہینہ ندارد۔ قسم لے لیجیے جو کبھی سال لکھا ہو۔ بعض خطوں پر تو نہ دن لکھا ہے نہ تاریخ اور نہ سال۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات تو سنسر والے بھی فیض کی تقلید میں دن تاریخ گول کر گئے۔ صحبتِ سنسر نے فیض میں "سنسر" کی صلاحیت پیدا نہ کی یہ فیض کا پہلا کمال اور صحبتِ فیض نے سنسر کو صالح بنا دیا یہ فیض کا دوسرا کمال تھا۔ ایسے خطوط پر اگر وصول ہوتے ہی ایلس پابندی کے ساتھ تاریخ نہ لکھتیں تو بیس سال گزر جانے کے بعد آج اور آج کے بعد آنے والے برسوں میں اس سے کیسی اُلجھن ہوتی اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں۔ خطوط کی اشاعت میں ایلس نے اس لئے کوئی غیر معمولی دلچسپی نہیں لی کہ وہ ان کے نام لکھے گئے ہیں یا ان کے شوہر کے لکھے ہوئے ہیں بلکہ وہ دل سے یہ محسوس کرتی تھیں کہ شاعر کی یہ تحریریں بھی ادب کی جان ہیں۔

خطوط کا مجموعہ "صلیبیں مرے دریچے میں" کس طرح وجود میں آیا اسے میں فیض کی سوانح کا جزو سمجھتا ہوں۔ اس لئے اس کا ریکارڈ رکھنا ضروری ہے۔ فیض کی ساٹھویں سالگرہ (ہفتہ ۱۳ فروری ۱۹۷۱ء) کے دوسرے دن فیض کی خودنوشت سوانح عمری (مجوزہ) کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم تینوں یعنی فیض، ایلس فیض اور میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اُن خطوط کا ذکر چھڑا جو فیض نے ایلس کو اپنی اسیری کے زمانے میں لکھے تھے۔ ایلس خطوط کا ایک پلندہ لے آئیں جو بیس سال تک انہوں نے بڑی حفاظت سے سنبھال رکھا تھا۔ فیض نے مجھ سے کہا "تم یہ خط گھر لے جاؤ۔ انہیں غور سے پڑھو، اس کے بعد کوئی بات کریں گے۔"

خط اتنے دلچسپ اور فکر انگیز تھے کہ میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔ دوسرے دن میں نے رائے دی کہ انہیں شائع ہو جانا چاہیے اور بہت جلد۔ یعنی مارچ ۱۹۷۱ء

ہیں کیونکہ اب سے بیس سال پہلے مارچ ہی میں فیض گرفتار کیے گئے تھے (۹ مارچ ۱۹۵۱ء)
البتہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اگلا ہی مہینہ مارچ ہے، نہ اتنی جلد خطوط کا ترجمہ ہو سکے گا اور نہ کوئی ایک
کاتب ان تمام خطوط کی کتابت کر سکے گا اس لئے اپنے طور پر سوچ لیا کہ مجموعہ جون ۱۹۷۱ء میں شائع
ہو سکتا ہے۔ اُس وقت بھی بیس سال کی شرط پوری ہوگی کیونکہ پہلا خط جون میں لکھا گیا تھا (۷ جون
۱۹۵۱ء)، خودنوشت سوانح عمری کا قصہ پس منظر میں چلا گیا۔ فیض کہنے لگے "پہلے اس مجموعے سے نپٹ
لیں اس کے بعد خودنوشت سوانح کے متعلق غور کریں گے کہ کیا ہو سکتا ہے۔" ایلیس نے الگ سے
مجھ سے کہا فیض کی نیت نیک نہیں معلوم ہوتی نہ جانے خودنوشت کب شروع ہو۔ تم نے جو
فیض کی سوانح عمری کا منصوبہ بنایا ہے اس پر کام کرتے رہو۔ البتہ ــــــ فیض کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے کہا ــــــ خطوط کے ترجمے کے سلسلے میں اس شخص پر کبھی رحم نہ کھانا۔

لگے ہاتھوں بے رحمی کی بات بھی کر لیں۔ میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ فیض کی شخصیت
کا سب سے بڑا جوہر اُن کی شرافت ہے۔ شرافتِ نفس، شرافتِ ذہن اور شرافتِ زبان۔ میں اوروں
کے مقابلے میں یہ بات زیادہ اعتماد کے ساتھ اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ خوش قسمتی سے مجھے فیض کا قرب
حاصل ہے اور شاعر نہ سہی "شخص" کچھ حد تک میری دسترس میں ہے۔ اپنے متعلق بات کرتے ہوئے
فیض کو سخت اُلجھن ہوتی ہے۔ مجھے بھی ہوتی ہے مگر اس سے کہ فیض اپنی بات کرتے ہوئے
کیوں کتراتے ہیں۔ نہ جانے اپنا نفس کس کونے کھدرے میں چھپا کر رکھ دیا ہے۔ اور ذہن، تو وہ
آئینے کی طرح شفاف ہے۔ شرافتِ نفس اور شرافتِ ذہن کی مثالیں آپ کو خود ان خطوط میں جا بجا
ملیں گی۔ مزید تفصیل کے لئے فیض کی سوانح کا انتظار کیجیے۔

شرافتِ زبان دیکھیے کہ آج تک "پاجی" سے زیادہ بُرا لفظ فیض کی زبان سے نہیں سُنا
گیا۔ اپنے خط (۹۷) میں ایلیس کو مشورہ دیتے ہیں "لوگوں کے بارے میں کچھ زیادہ فصیح اسمائے
صفت کا استعمال تم اگر کم کر دو تو اچھا ہے۔ ان سے خفگی اور برہمی سمجھ میں تو آتی ہے لیکن اس سے
کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" زبان کے تعلق سے فیض نے جو اشارہ کیا ہے اس پر وہ خود بڑی سختی سے

عمل کرتے ہیں۔ شاعر کے ساتھ بے رحمی کا برتاؤ تو وہ ہمارے مشاعرے باز حضرات کرتے ہی رہتے ہیں۔ لندن میں ہوں یا ماسکو میں، لاہور گئے ہوں یا ڈھاکہ آپ ہر مشاعرے کے اعلان میں فیض کا نام ضرور پائیں گے۔ ٹیلی فون کر دیا کہ کل رات مشاعرہ ہے ضرور آئیے مشاعرہ شروع ہونے کے بعد خود آدھمکے کہ جلدی چلئے محفل آپ کے انتظار میں ہے وغیرہ۔ یہ تو ہوا شاعر کا حشر۔ رہا ایلس والے "شخص" پر رحم نہ کھانے کا مسئلہ یعنی طبیعت موزوں ہو یا نہ ہو فیض سے بہ جبر خطوط کا ترجمہ کرانا تو یہ میری سکت کے باہر اور خود میری مرضی کے خلاف بات تھی اس لئے ایلس کے اصرار کے باوصف جب بھی فیض مجھ سے کہتے آج چھٹی کرو تو میں اُن ہی کے الفاظ میں کہتا "ٹھیک ہے"۔ حالانکہ مجھے یہ اعتماد تھا کہ اگر میں اصرار کرتا تو وہ اپنی شرافت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ترجمہ کرنے بیٹھ جاتے۔ چونکہ ایلس بنیادی طور سے اُستانی ہیں اس لئے فیض کو دیئے ہوئے "ہوم ورک" پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ اچھی اُستانی بے رحم نہیں ہوتی اور ایلس تو اچھی اُستانی ہی نہیں اچھی رفیقِ حیات بھی ہیں۔

مجموعے کے سلسلے میں طریقہ کار یہ رہا کہ فیض پہلے پورا خط پڑھ لیتے، اُس کے بعد اُس کا ترجمہ مجھے لکھواتے، میں اُسی رات بیٹھ کر وہ ترجمہ صاف خط میں لکھ دیتا، دوسرے دن فیض اُس پر نظرِ ثانی کرتے، نظرِ ثانی کے بعد وہ ترجمہ ٹائپسٹ کو دے دیا جاتا، ٹائپ ہو جانے کے بعد فیض اس پر آخری نظر ڈالتے اور پھر وہ کاتب کے پاس بھیج دیا جاتا۔ کتابت شدہ خطوط آجاتے تو سحر انصاری پروف کی تصحیح کرتے۔ اس طرح ترجمے، نقل نویسی، ٹائپ کتابت اور پروف ریڈنگ کے پانچ محاذوں پر پابندی اور تیزی کے ساتھ کام شروع ہو گیا۔

فروری سے مئی تک کی مدت میں فیض کو چار مرتبہ لاہور جانا پڑا جس سے بیس پچیس دن ضائع ہو گئے۔ پھر مختلف کالجوں کی تقریبات شروع ہو گئیں۔ کبھی سر سید گرلز کالج کی لڑکیاں اُنھیں پکڑ لے گئیں، کبھی گرامر اسکول کی طالبات اُن کے گھر دھرنا دے کر بیٹھ گئیں

کہ فیض صاحب آپ کو ہمارے اسکول چلنا ہی پڑے گا، یوم اقبال بھی ہوا، امتیاز علی تاج اور نیاز فتح پوری کی برسی بھی، عبداللہ ہارون کالج کے فرائض، ادارہ یادگارِ غالب کی مصروفیات، مشاعرے، عشائیے، عصرانے، ظہرانے، حاجت مندوں کی مدد کے لئے دوڑ دھوپ، صبح، دوپہر، شام کے ملاقاتیوں کی ریل پیل، ایک ہفتے تک ایلس کی علالت تین چار مرتبہ سخت گرمی کی لہر کا آنا، چند ایک میری غیر حاضریاں، غرض ان تمام آفات کے باوجود فیض اپنے محاذ پہ ڈٹے رہے یا یوں سمجھئے کہ ایلس نے اُن پر پہرہ بٹھا رکھا تھا۔ ایلس میں مقناطیس کی کوئی خاصیت ضرور ہے کیونکہ خود میں بھی دو ایک دن کے لئے چاہتا تو بھی کام سے جی نہ چرا سکتا تھا۔ ہر غیر حاضری پر ایلس مجھ سے کہتیں "کل تم بہت یاد آئے"۔

کام کی رفتار حوصلہ شکن ہی رہی ہے۔ جس طرح دھوبی سے کپڑوں کا حساب لیتے ہیں اُس طرح ہر تیسرے چوتھے روز ایلس پوچھ لیتیں آج کتنے خط ہوئے، ابھی کتنے باقی ہیں اور میں اُن سے جواباً کہتا مجموعہ جون میں ضرور شائع ہوگا۔ البتہ دل ہی دل میں ڈرتا تھا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو؟

ایک دن میں نے ذرا دبے لفظوں میں کہا وقت کم اور کام زیادہ ہے اس لئے ترجمے کی رفتار تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پر فیض کہنے لگے کہ سارے خطوط شائع کرنے کی کیا ضرورت ہے صرف سو خط چھاپو۔ میں نے جواب دیا خط تو ایک بھی کم نہ کریں البتہ ان میں جو غیر ضروری اور غیر اہم باتیں ہیں وہ حذف کر دیں تو ضخامت اور محنت کم ہو جائے گی۔ اس پر فیض نے کہا تو پھر تم تمام خطوط پڑھ کر حذف ہونے والے حصّوں پر نشان لگا دو، ترجمہ کرتے وقت انہیں چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ میں نے خطوط کے نسبتاً غیر اہم اور توضیح طلب حصّوں پر سرخی سے نشان لگا دیئے۔

محققینِ فیض، خاص مزاج رکھنے والے نقّاد اور عام قاری ضرور جاننا چاہیں گے کہ کس قسم کی باتیں حذف کی گئی ہیں۔ اِس لئے یہ سب تفصیل سے بتا دینا ضروری ہے۔

توصاحبو سنو حذف شدہ حصّے کیا ہیں۔

(۱) القاب و آداب، خیر خیریت کی باتیں، دُعا سلام اور پیار۔ القاب و آداب کے سلسلے میں یہ بتا دوں کہ اصل خطوط انگریزی میں ہیں اس لئے ایلس کو ڈارلنگ، سویٹ ہارٹ، ڈیرسٹ، ڈیر وائف، بی لویڈ، مائی لو اور ڈیر لو سے مخاطب کیا ہے۔ اپنی بچیوں چھیمی اور میزو کو MY PIGEONS اور FUNNY FACES لکھا ہے۔

بعض خطوط کی آخری سطر فرانسیسی زبان کا کوئی جملہ ہوتی تھی معلوم نہیں سنسر والے اس کا مفہوم معلوم کر لیتے تھے یا اسے فیض کی غلط انگریزی سمجھ کر ٹال جاتے تھے۔

(۲) معذرت۔ یعنی جواب دیر سے دیا، ایلس کی سالگرہ بھول گئے، اپنی شادی کی سالگرہ یاد نہ رہی وغیرہ۔ یوں تو فیض نے معذرتیں تھوک کے بھاؤ کی ہیں مگر کہیں کہیں ان کے قلم سے کچھ اس قسم کی معذرت بھی نکل گئی ہے کہ میں نے پچھلے خط میں فلاں بات کا وعدہ کیا تھا مگر معذرت خواہ ہوں کہ پورا نہ کر سکا۔ اس معذرت کے حوالے سے پچھلے دو چار خط پڑھ ڈالئے آپ کو فلاں بات کا وعدہ ملے گا ہی نہیں جس کے پورا نہ کرنے کی معذرت چاہی ہے۔ جب میں نے اس قسم کی معذرتوں کا ذکر کر کے بتایا کہ ایسے وعدوں کا کوئی حوالہ پچھلے خطوط میں نہیں ہے تو سُنی اَن سُنی کر دی فیض کو سُنی اَن سُنی کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو خط (۹۴)۔

اگر یہ غائب دماغی ہے تو ایک مزیدار بات سُنئے۔ ایک مرتبہ فیض کا وہ خط جو چھیمی کے نام تھا لاہور پہنچ کر غلطی سے ایلس کے خط کے ساتھ منٹگمری جیل فیض کے پاس لوٹ آیا۔ اس قصے پر فیض نے ایلس کو لکھا "خوشی کی بات ہے کہ خاندان میں ہم ہی اکیلے غائب دماغ نہیں ہیں" (خط ۱۰۱)

(۳) اُن لوگوں کے تذکرے جن کے نام خطوط میں موجود ہیں مگر واقعات کی تفصیل فیض کو یاد نہیں رہی۔

(۴) مقدمے کی دفتری نوعیت کی باتیں۔

(۵) روزمرّہ کی ضروریات کے لئے فرمائشیں کہ تولیہ ساتھ لاؤ، سوئٹر بھیج دو وغیرہ۔

(۶) حساب کتاب اور بہت سے غیر اہم گھریلو معاملات والے حصّوں پر خطِ تنسیخ پھیرنا پڑا۔

(۷) کچھ اور متفرق اور غیر اہم باتیں۔

خطوط کی ضخامت کم ہو جانے کے باوجود اپریل کے تیسرے ہفتے تک ترجمے کی رفتار تیز نہ ہو سکی تو میں نے ایلیس کی موجودگی میں اس کا تذکرہ کیا۔ فیضؔ کہنے لگے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ بقیہ خطوط کا ترجمہ تم کرو اور میں ان پر نظرِ ثانی کر دوں؟ ایلیس بھی دل سے چاہتی تھیں کہ کتاب جلد چھپ جائے اس لیے انھوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا ظفر تم ترجمہ کرو۔ میں نے معذرت چاہی اور کہا میں فیضؔ کی طرح ترجمہ نہیں کر سکتا۔ مگر جب دونوں میاں بیوی نے بہت اصرار کیا تو میں نے تکمیلِ محبّت کے لیے حامی بھر لی کہ اچھا کوشش کرتا ہوں۔ نہ صرف ایمانداری کے ساتھ کوشش کی بلکہ توقع کے مطابق ناکام بھی ہُوا جس کی مجھے یوں خوشی ہے کہ اگر چند ایک خطوط کے ترجمے پیش کر دیتا اور فیض انہیں خدانخواستہ منظور کر لیتے تو آپ کو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند برداشت کرنا پڑتا۔ دو تین دن بعد اپنی شکست کا اعلان کرتے ہوئے میں نے مثال دی کہ میں انگریزی محاورہ KICK UP A ROW استعمال کر چکا ہوں اور خُون خرابے کا مفہوم بھی جانتا ہوں مگر ترجمے کے وقت شائد میرا قلم خون خرابہ نہ لکھتا۔ اسی طرح FOOT FALL OF THE DAWN کا ترجمہ "صبحِ فردا کی آوازِ پا" GOOD LORD کا "لاحول ولاقوۃ" اور RAZOR'S EDGE کا ترجمہ "پُل صراط" صرف فیضؔ کا حق ہے۔ اس کے علاوہ میں نے کہا یہ خطوط جس زبان کے طالب ہیں وہ زبان میں جانتا ضرور ہوں مگر لکھتا نہیں اور میرا اسلوب تحریر بالکل مختلف ہے۔ جیسا کہ مجھے یقین تھا فیضؔ نے سگریٹ کا کش چھوڑتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے"۔

ترجمہ نہ کرنے کی معذرت چاہنے اور اس کے قبول ہو جانے کے باوجود اتنا ضرور عرض کروں گا کہ مطبوعہ متن یا ترجمے میں میرا بھی تھوڑا بہت حصّہ ہے! اور وہ اس طرح کہ فیضؔ جب مجھے ترجمہ لکھواتے تو پوری پابندی کے ساتھ جملے کے آخری الفاظ "ہے"، "ہوگا" وغیرہ بین السطور

کی طرح " بین اللّب " چھوڑ دیتے تھے اور وہ چھوڑے ہوئے الفاظ میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اس لئے ہر سطر کے آخر میں آپ کو "تھا، تھی، تھے۔ گا، گی، گے۔ ہوتا، ہوتی، ہوتے" وغیرہ ملیں گے وہ سب کے سب میرے ہیں، فیضؔ کے نہیں ہیں۔ ہونٹ فیضؔ کے ہلتے قلم میرا چلتا اس لئے سمجھ لیجئے میں فیضؔ کا "پلے بیک سنگر" ہوں۔

اختصار کے ساتھ ہی سہی مگر ان خطوط میں موضوعات کا بے انتہا تنوع ملے گا۔ محبت، پیار، حسن، زندگی، مطالعہ، شاعری، باغبانی، وقت، حرص، خود پسندی، خود فراموشی خود بینی، شکایتیں، حکایتیں، کاہلی، کاروبار وغیرہ۔ ادیبوں اور ادب پاروں پر فیضؔ کا تبصرہ۔ مثال کے طور پر نیتشے ایک پاجی، آسکر وائلڈ ایک ادبی سارق۔ عجیب و غریب خبریں ملیں گی مثلاً فیضؔ کی بلی نے بچے دیئے ہیں۔ شکرے کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ یا پندرہ آدمیوں کے لئے ڈیڑھ من حلوہ آیا تھا وغیرہ۔ عید اور کرسمس کی پارٹیاں، مشاعرے، درسِ قرآن، درسِ غالبؔ، درسِ شیکسپیئر، ملاقاتیوں اور مدّاحوں کے خلوص کا ذکر، پرانی یادیں اور نئے ادبی منصوبے۔ موسم کا ذکر کیا تو لکھا گرمی بھنگ کا ایک تند و تیز پیالہ ہے۔ بارش کی بات کی تو لاہور اور دلی کو یاد کرنے لگے۔ زندگی کی جد و جہد میں بشاشت اور خوش طبعی کی ضرورت، دردِ جگر اور شکستِ دل کا مداوا، نیکو کار نظامِ حیات کی تشریح۔ جیل کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خود غرضیاں کاہلی اور سہل انگاری کا جواز۔ غرض جتنے خط اس سے زیادہ باتیں۔ ہر بات نئی اور نکھری ہوئی۔

میں بطورِ خاص جن امور کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ان میں فیضؔ کا فلسفہ، زندگی اور اس کے سفر کے متعلق فیضؔ کا تصوّر، خوش دلی کے متعلق فیضؔ کی رائے، ایلس سے فیضؔ کی محبت اور اُن کے لئے احسان مندی کے جذبات، سیمی اور میزی کو بڑا ہوتا ہوا دیکھ کر اور سُن کر ان کے متعلق فیضؔ کے تاثرات ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو فیضؔ کے ذہن و زندگی پر پوری طرح نہ سہی مگر پہلی مرتبہ روشنی ڈال رہی ہیں۔ فیضؔ کی ادبی

حیثیت پر لکھا جاتا رہا ہے مگر شخصیت پر بالکل نہیں لکھا گیا ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ شخصیت پر لکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک اہم سنگِ میل کا کام دے گی۔ اگرچہ یہ مجموعہ کوئی ایسا تناور درخت نہیں ہے کہ فیض کی شخصیت کے تمام پہلو اس کے زیرِ سایہ پل جائیں۔ پھر بھی میرا ایقان ہے کہ شخصیت کے وہ گُل ہائے رنگ رنگ جو اب تک ہماری نظروں سے بالکل پوشیدہ تھے اِسی سے کھلیں گے۔ یہیں سے مہکیں گے۔

فرنگی کی قید کے متعلق تو آپ جانتے ہیں۔ وہی حسرت موہانی والی بات۔ ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقّت بھی۔ فرنگن کی قید کا حال مجھ سے سُنئے۔ یعنی فیض اور ایلس والی بات۔ سمجھ لیجئے ایلس نے فیض سے کہا ہوگا۔ چکّی میں پیسوں گی مشقِ سُخن تم کرو۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ مئی کے پہلے اتوار اور اس کے بعد کے ہر اتوار کو ایلس نے فیض کو اور مجھے اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں یہ پروگرام بتا کر بند کر دیا کہ ترجمہ شروع کرو، گیارہ بجے کافی آئے گی، ایک بجے کھانا ملے گا، تین بجے چائے بھیجوں گی، اور پانچ بجے تم لوگ اپنا کام ختم کر لوگے تو چائے کی ایک اور پیالی۔ ہمیں خدا حافظ کہا اور ٹھنڈا کمرہ چھوڑ کر خود گرم کمرے میں چلی گئیں۔ جاتے جاتے کہنے لگیں فیض تمہیں اپنے نئے مجموعے (سروادیٔ سینا) کے لئے کچھ نظمیں بھی تو لکھنی ہیں۔ ایلس کے جانے کے بعد ترجمہ شروع ہوا۔ کچھ دیر بعد فیض کہنے لگے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اِن خطوط کے متعلق پڑھنے والوں اور خریداروں کی کیا رائے ہو۔ میں نے جواباً کہا مجھے یہ کتاب آپ کے کلام کے مجموعے کے مقابلے میں زیادہ اہم معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد ترجمہ لکھتے لکھتے مجھے مشتاق احمد خاں گرمانی کی دوصورتیں والی کہانی یاد آگئی جو خط (۶۹) کے فٹ نوٹ میں درج ہے۔ کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ اُمیدوار کے فوج میں بھرتی ہونے سے جہنّم میں جانے تک کے چھ مرحلوں میں سے ہر ایک مرحلے پر "دوصورتیں" پیدا ہوتی ہیں۔ نواب گرمانی کی بیان کردہ ان دوصورتوں والی کہانی کی طرح آپ تصور کرلیں میں نے فیض سے کہا ہوگا کہ مجموعہ چھپ جانے

کے بعد دو صورتیں ہو گی - ایک صورت تو یہ کہ لوگ کتاب نہ خریں مگر کالے چور کی طرح چُرا کر پڑھیں۔ دوسری صورت یہ کہ خریدیں۔ اگر نہ خریدیں مگر چُرا کر پڑھیں تو ٹھیک ہے۔ اور اگر خریدیں تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک صورت یہ کہ کتاب نہ پڑھیں، اُسے اپنی الماری میں سجا کر رکھیں، لوگ مستعار مانگ کرلے جائیں اور کبھی واپس ہی نہ کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پڑھیں۔ اگر نہ پڑھیں اور الماری میں سجا کر رکھیں تو ٹھیک ہے مستعار مانگ کر پڑھنے والوں کا بھلا ہو گا۔ اور اگر پڑھیں تو پھر دو صورتیں ہو گی۔ ایک یہ کہ سمجھے بغیر نکتہ چینی کریں۔ دوسری صورت یہ کہ سمجھ کر تنقید کریں۔ بغیر سمجھے نکتہ چینی کریں تو ٹھیک ہے کوئی سمجھ دار آدمی اس نکتہ چینی کا جواب ہی نہ دے گا۔ اور اگر سمجھ کر تنقید کریں تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک یہ کہ ناقد کا ذوق خراب ہے۔ دوسری صورت یہ کہ ناقد کا ذوق اچھا ہے مگر اس کے دل میں چور ہے۔ اگر ناقد کا ذوق بُرا ہے تو بُرا ہے کوئی کیا کر سکتا ہے۔ دوسری صورت میں ذوق اچھا ہے مگر اُس کے دل میں چور ہے تو چور کے تعلّق سے بھی دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو وہ کالا چور جو کتاب چُرا کر پڑھتا ہے اور دوسری صورت میں دل کا چور۔ پہلا چور تو ٹھیک ہے کہ اس نے کتاب چُرا کر پڑھی ہے۔ دوسری صورت میں جو دل کا چور ہے تو وہ پہلے چور سے کچھ ایسا زیادہ بُرا تو نہیں۔ آخر اس نے بھی تو کتاب پڑھی ہے اس لئے اس کتاب کو ضرور چھپنا چاہیے۔

خریدنا، پڑھنا اور سمجھنا خریدار کا داخلی معاملہ ہے جس میں ہم مداخلت نہیں کر سکتے اور کتاب فروخت کرنا پبلیشر کا خارجی معاملہ ہے جس میں ہم اعانت نہیں کر سکتے۔

جون ۱۹۷۱ء

مرزا ظفر الحسن

حیدرآباد جیل

خط (۱) ۷ جون ۱۹۵۱ء

تا

خط (۹۲) ۱۹ جون ۱۹۵۳ء

خطوط کی تعداد بہ لحاظ ماہ و سال

مہینہ	۱۹۵۱	۱۹۵۲	۱۹۵۳	جملہ
جون	۳	۵	۲	۱۰
جولائی	۲	۴	×	۶
اگست	۴	۳	×	۷
ستمبر	۳	۲	×	۵
اکتوبر	۲	۵	×	۷
نومبر	۳	۶	×	۹
دسمبر	۲	۵	×	۷
جنوری	×	۳	۷	۱۰
فروری	×	۴	۲	۶
مارچ	×	۳	۶	۹
اپریل	×	۳	۳	۶
مئی	×	۵	۵	۱۰
جملہ	۱۹	۴۸	۲۵	۹۲



فیضؔ اور ایلس فیضؔ



فیض جناح ہسپتال کے سبزہ زار پر



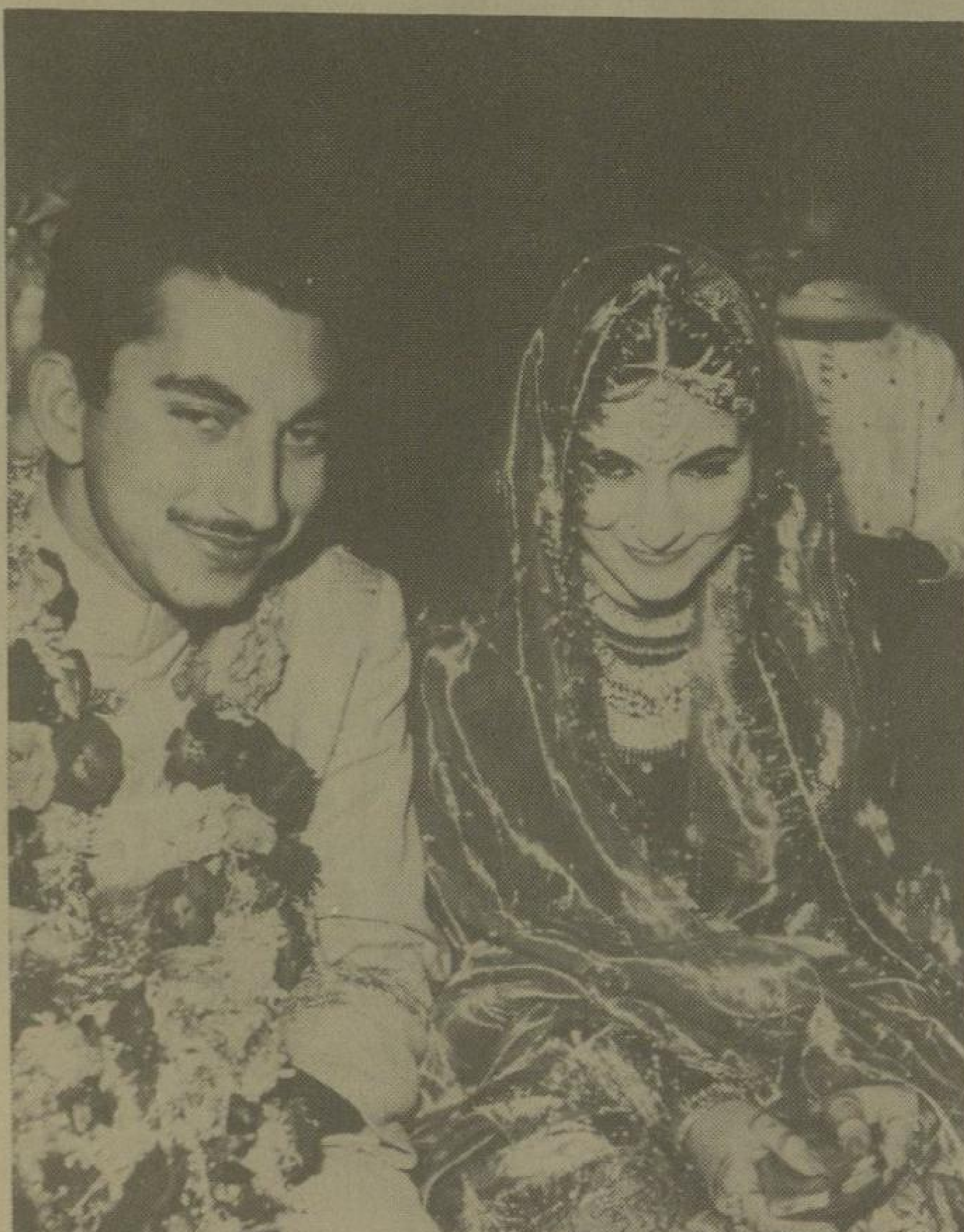
فیض کی رہائی کے بعد گھر آنے پر



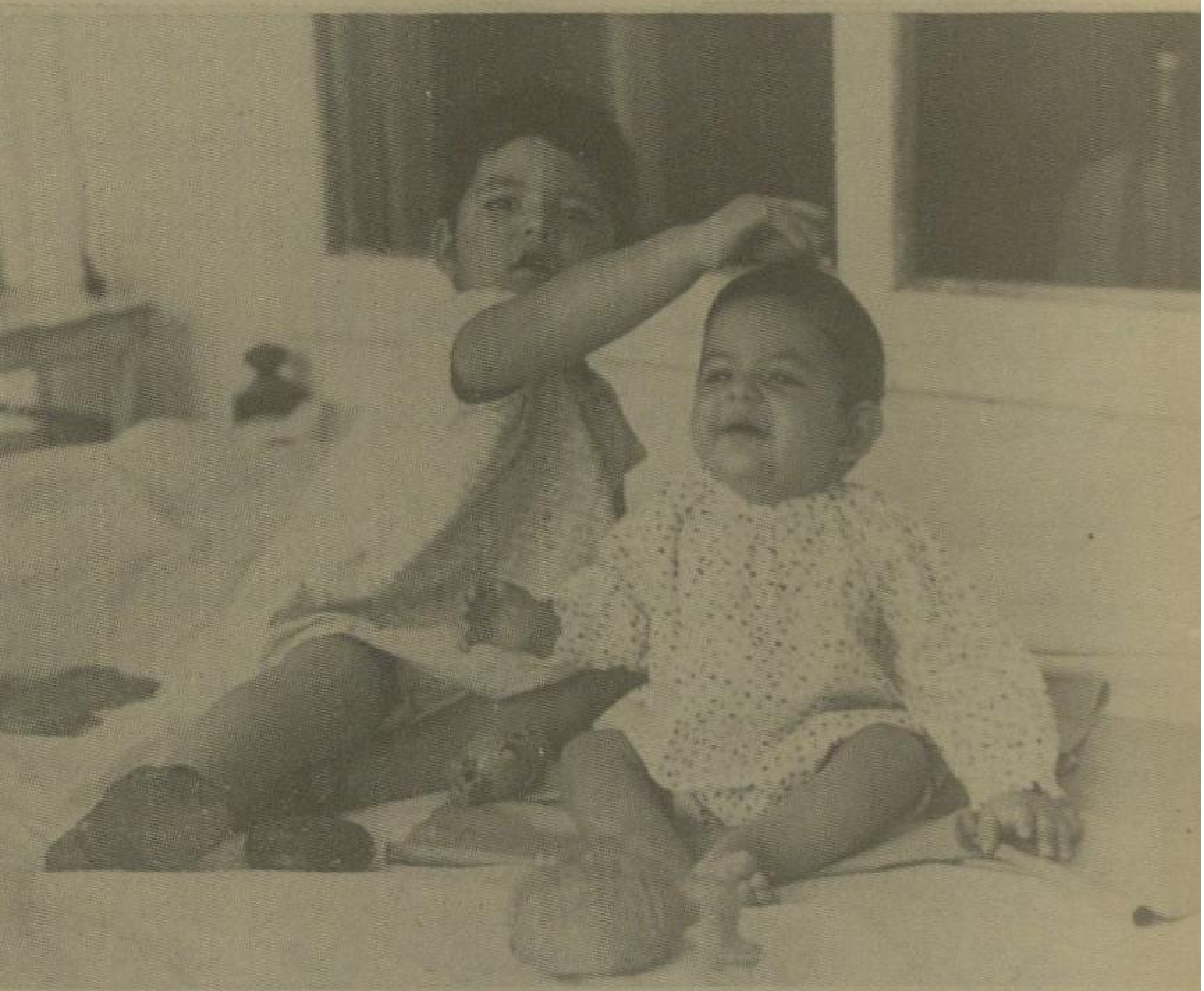
چھیمی اور میزی شیکسپیئر کے ڈرامے میں (دائیں سے دوسرے، تیسرے نمبر پر)



چھمی اپنے دولہا کے ساتھ



میزی اپنے دولہا کے ساتھ



فیضؔ کے نواسے علی مدیٰ اور یاسر

۷ جون ۱۹۵۱ء (۱)

تمہیں پہلے نہیں لکھ سکا جس کا افسوس ہے لیکن یہاں ہر کام بہت دھیرے دھیرے ہوتا ہے اور خط لکھنے کے لئے کاغذ آج ہی ہاتھ آیا ہے۔ میں اور دوسرے ساتھی چار تاریخ کی صبح کو اسپیشل ٹرین سے یہاں پہنچے۔ ہم نے جس ٹھاٹھ سے سفر کیا دیکھنے کی چیز تھی۔ صرف بینڈ باجے کی کسر رہ گئی ورنہ جلو میں اور تو سب کچھ تھا۔ گاڑی پہ سوار ہوتے ہی یوں محسوس ہوا کہ سب پریشانیاں دور ہو گئی ہیں۔ سفر کا لطف، دنیا کو دوبارہ دیکھنے کی لذت، پُرتکلف کھانا۔ بہت سی نعمتیں یکبار ہاتھ آ گئیں۔ اس دور دراز دن کے بعد جب مجھے اچانک گھر سے لے گئے تھے پہلی بار مزے کا کھانا اس سفر کی دوپہر میں نصیب ہوا۔ بھنا ہوا مرغ، پلاؤ، فروٹ کاک ٹیل اور آئس کریم۔ (افسوس کہ بھوک نہیں لگ رہی تھی) اور اس پر اضافہ دنیا کی سب سے عزیز چیز یعنی انسانوں کی صحبت جس سے اتنے دن محروم رہے! ان سب باتوں کی وجہ سے دل دوبارہ پُرسکون ہے، اب تمہیں بتانے میں کچھ حرج نہیں کہ یہ تین چار دن جو لاہور میں گزرے، ایامِ اسیری کے سب سے اذیت ناک دن تھے۔ جب مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اپنے چاہنے والوں کو کسی ایسی چیز کی خاطر دکھ اور اذیت پہنچانا جو خود کو بہت عزیز ہو لیکن ان کے لئے کچھ معنی نہ رکھتی ہو غلط اور ناجائز بات ہے۔ اس نظر سے دیکھو تو آئیڈیل ازم یا اصول پرستی بھی خود غرضی کی ایک صورت بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ اپنے کسی اصول کی دھن میں آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسروں کو کیا چیز عزیز ہے اور اس طرح اپنی خوشنودی کی خاطر دوسروں کا دل دکھلاتے ہیں۔ اس زمانے میں دل و دماغ پر اور بھی کئی باتوں کا انکشاف ہوا۔ اپنے بارے میں بھی، دوسروں کے بارے میں بھی۔ اپنے میں ایسی بہت سی کمزوریاں نظر آئیں جن کا وجود پہلے گمان میں نہ تھا۔ دوسروں میں کمینگی اور عالی حوصلگی کے ایسے پہلو دکھائی دیئے جو پہلے معلوم نہ تھے۔ اس سارے تجربے کے لئے دل احسان مند ہے۔ خیال ہے کہ جب یہاں سے نکلیں گے تو غالباً اپنی

شخصیت پہلے سے زیادہ مکمّل اور منظّم ہو گی۔ مَیں نے یہ بھی اچھّی طرح محسوس کر لیا ہے کہ آدمی کے لیے مناسب یہی ہے کہ جو کچُھ وہ ہے اُس پر قناعت کرے اور جو کچُھ وہ نہیں ہے وہ کچُھ بننے کی کوشش میں وقت اور محنت ضائع نہ کرے۔ اِس طرح کی کوشش سے حماقت اور خود فریبی کے علاوہ کچُھ حاصل نہیں۔

ہاں تو جیسے میں کہہ رہا تھا جب سے مَیں یہاں پہنچا ہوں خوف و خطر کا قطعی کوئی احساس دِل میں باقی نہیں رہا۔ (اگرچہ یہ احساس پہلے بھی کچھ ایسا زیادہ نہ تھا، وہ اس وجہ سے کہ نہ صرف مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی جسے اخلاقی طور سے گناہ کہہ سکیں بلکہ کوئی ایسا ارتکاب بھی نہیں کیا جسے رسمی یا قانونی طور سے جرم ٹھہرایا جا سکے) اَب تو یوں ہے کہ اگر کوئی یاد نہ دلائے تو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم جیل خانے میں ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے یہاں ہیں اور اگر یہاں سے باہر جانے کو جی چاہے تو کوئی ہمیں روک بھی نہیں سکتا۔ جیل میں ہمارا گھر اچھّا خاصا ہے۔ کھانے پینے کو کافی ملتا ہے۔ گرمی کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ اسیری کے سَب سے بُرے دِن کٹ چکے ہیں اِس لیے کہ اَب اور کچُھ بھی ہو، نہ قیدِ تنہائی کا سامنا باقی ہے، نہ پولیس کی تکلیف دہ پوچھ گچھ کا ڈر ہے اور اپنی جان اور ناموس دونوں سلامت ہیں۔ اَب تمہاری اور بچّوں کی تصویریں سامنے رکھ کے میں خوشی سے مُسکرا سکتا ہوں، تمہاری یاد سے پہلے کی طرح دِل نہیں دُکھتا اور یہ یقین پہلے سے بھی زیادہ مُحکم ہو چلا ہے کہ زندگی خواہ کچھ بھی دکھائے بالآخر بہت خوبصورت شے بھی ہے اور بہت حسین بھی۔

(۲)

۱۴ جون ۱۹۵۱ء

اُمید ہے تمہیں میرا گزشتہ خط مل چکا ہو گا۔ ان خطوط کو اتنے ہاتھوں سے گزرنا ہوتا ہے کہ ان کے پہنچنے میں تاخیر یقینی ہے اس لیے اگر میرے خطوط کی رسید میں لمبا وقفہ آجائے تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تنہائی اور زباں بندی کے عالم میں بہت دِن گزارنے کے بعد آدمی

اپنے بارے میں بہت زیادہ باتونی ہو جاتا ہے (شاید میرا گزشتہ خط بھی ایسا ہی تھا)۔ اس لئے جو خرافات میں لکھ بھیجوں اُس پر توجہ صرف کرنے کی ضرورت نہیں، مقصود صرف اس خواہش کا اظہار ہے کہ بہت زمانے سے باتیں نہیں کیں اس لئے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اِن خطوط کے ذریعہ ہماری بات چیت پرائیویٹ نہیں پبلک ہوتی ہے۔

گرفتاری کے بعد مَیں نے ابھی ابھی چھٹی[1] نظم ختم کی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گزشتہ تین برس میں جتنا کچھ لکھا تھا اِن تین ماہ میں اس سے دوگنا لکھ چکا ہوں۔ لیکن اب یہ شاعرانہ کیفیت ختم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس جگہ اِتنا شور و غل، ہنسی مذاق اور خوش گپیاں رہتی ہیں کہ یکسوئی سے غور و فکر کرنا محال ہے، اس کے علاوہ اَب ہم مقدمے کی تیاری میں مصروف ہیں اور فرصت کا وقت بہت کم ملتا ہے۔ بہر صورت اپنے گُم شدہ جذبہ واحساس کا کچھ حصّہ میں نے دوبارہ برآمد کر لیا ہے اور یقین ہے کہ یہ قِصّہ پاک ہو چُکے تو دوبارہ باقاعدگی سے لکھ سکوں گا۔

موسم گرما ہو چلا ہے لیکن زیادہ تکلیف دہ نہیں ہے۔ لاہور میں تو آگ برس رہی ہوگی۔ بچّے اِسے کیسا محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی خیریت کا حال لکھو اور یہ بھی بتاؤ کہ تمہاری آمدنی اور اخراجات کی کوئی صورت بن گئی ہے یا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا ہاتھ بہت تنگ ہوگا لیکن ہم نے اِس سے زیادہ تنگ دستی کے دن بھی دیکھے ہیں، اور جیسے وہ گزر گئے یہ بھی بیت جائیں گے۔

---

[1] تمہارے حسُن کے نام (سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسُن کے نام) اس سے پہلے کی پانچ تخلیقات یہ تھیں (۱) روشن روش ہے وہی اِنتظار کا موسم (۲) تم آئے ہو نہ شبِ اِنتظار گزری ہے۔ (۳) تمہاری یاد کے جَب زخم بھرنے لگتے ہیں (۴) شفق کی راکھ میں جل بُجھ گیا ستارۂ شام (۵) قطعات، متاعِ لوح وقلم چِھن گئی تو کیا غم ہے۔ اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے۔

۲۴ جون ۱۹۵۱ء (۳)

۱۶ تاریخ کا لکھا ہوا تمہارا پہلا خط ملا۔ بہت خوشی ہوئی ؛ مجھے تعجب ہے کہ تمہیں میرا خط اَب تک نہیں ملا۔ یہ خط نو یا دس تاریخ کو سنسر ہو جانا چاہیئے تھا۔ جب بھی یہ خط ملے مجھے تاریخ سے مطلع کر دینا تاکہ ہم یہاں کسی سے خون خرابہ کر سکیں۔ انشورنس وغیرہ کے کاغذات تمہیں پندرہ تاریخ کو رجسٹری کر دیئے تھے اور اب تک پہنچ جانے چاہئیں۔

یہ سُن کر اطمینان ہوا کہ تم اور بچے اچھی طرح ہو۔ اور اس مصیبت نے تم لوگوں کو دل برداشتہ نہیں کیا۔ مجھے تم لوگوں پر ناز کرنے کے لئے رہائی کے دن تک انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ناز تو مجھے اب بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جدائی کے دُکھ کے علاوہ دِل میں اور کسی پریشانی کا وجود نہیں۔ انسانی ذہن بھی عجیب چیز ہے۔ گزشتہ تین ماہ سے خیال ہر وقت اس مقدمے میں اُلجھا رہتا تھا لیکن اب جو مقدمہ شروع ہوا ہے تو اس کی کارروائی میں ذرا سی بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ مَیں بار بار دِل کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ معاملہ بہت سنگین ہے اور اس کے بارے میں بہت سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے لیکن دِل پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت ہی مہمل اور بے حقیقت ناٹک کھیلا جا رہا ہے جو ایک دِن ایسے ہی اچانک اور بے وجہ ختم ہو جائے گا جیسے کہ شروع ہوا تھا۔ میری گرفتاری اور اسیری کی طرح اس کا بھی نہ کوئی سبب ہے نہ جواز۔

ویسے میں بالکل صحت مند اور خوش ہُوں البتہ پڑھنا لکھنا یا کام کرنا ذرا مشکل ہوتا جا رہا ہے اس لئے کہ ہمارے ساتھی ہر وقت ہنسی، مذاق اور غُل غپاڑے سے آسمان سر پر اُٹھائے رکھتے ہیں۔ جیسے میں نے شاید پہلے لکھا تھا یہاں بہت سے اچھے لطیفے سُننے میں آئے جو کبھی ملیں گے تو سُنائیں گے۔ لیکن ایک ہمارے مرکزی وزیر صاحب کا لطیفہ سُن لو۔ حکایت ہے کہ کسی تقریب میں ہمارے کچھ مذہبی قسم کے ایک وزیر صاحب کے قریب ایک مسلمان لڑکی فراک پہنے بیٹھی تھی۔ وزیر صاحب نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی

صاحب سے کہا" دیکھو ہماری لڑکیاں ایسی بے حیا ہوتی جارہی ہیں کہ اپنے اعضائے نہانی کا ستر ڈھانپنے کا بھی خیال نہیں کرتیں"۔ اُن صاحب نے کہا" یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بے چاری نے گھٹنوں سے نیچے تک تو فراک پہن رکھی ہے"۔ وزیر صاحب نے فرمایا "اِس سے کیا ہوتا ہے مُسلمان لڑکی کے اعضائے نہانی اُس کے ٹخنوں تک پہنچتے ہیں"۔ دوسرے لطیفے بدقسمتی سے ایسے خط میں نہیں لکھے جاسکتے جو بہت سے ہاتھوں سے گزرتا ہے۔

موسم اب گرم ہو چلا ہے لیکن ہوا چلتی رہتی ہے اِس لئے کچھ ایسا ناخوشگوار بھی نہیں۔ البتہ اِس کا رنج ہے کہ اَب کے اپنے محبوب شہر لاہور کے بادل نظر نہیں آئیں گے اور نہ بارش کے بعد مہکتا اور مُسکراتا ہوا سبزہ دکھائی دے گا۔ خیر۔ کبھی نہ کبھی۔

اماں[1] اور بھائی[2] طفیل کا پتہ بھیج دو تاکہ میں اُنھیں خط لکھ سکوں۔ اور لندن میں اپنی اماں اور[3] ابّا کا بھی۔ ہم لوگ مقرّرہ تعداد سے زیادہ خط نہیں لکھ سکتے لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آنے والے خطوط پر کوئی پابندی نہیں بشرطیکہ اُن میں سیاسی معاملات وغیرہ کا ذکر نہ ہو اس لئے جُملہ دوستوں کو اطلاع کر دو کہ جو بھی ہمیں لکھنا چاہے اُس کے خط کے لئے ہم چشم بہ راہ ہوں گے۔

ہمارا مقدّمہ غالباً بہت دن چلے گا اِس لئے میرا خیال ہے کہ تم لوگ جولائی کے اواخر تک آسکو تو آجاؤ۔ اُس وقت تک موسم کچھ معتدل ہو جائے گا اور سفر زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوگا۔ بہر صورت اپنی سہولت اور اپنی گرہ میں مال دیکھو۔ بے وجہ زحمت اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ انسپکٹر جنرل قید خانے جات لاہور کو ٹیلی فون کر کے پوچھ لو کہ شاہی قیدی کی حیثیت میں اگر ہمارے الاؤنس کا کچھ پیسہ بچا ہو تو تمہیں بھجوادیں۔

۱؎ فیض کی والدہ ۲؎ فیض کے بڑے بھائی طفیل احمد خاں ۳؎ مسٹر و مسز جارج

۲ جولائی ۱۹۵۱ء (۴)

بہت دن اِنتظار کے بعد دو دن ہوئے تمہارا خط اور چھیمی اور میزو کے شاہکار وصول ہوئے۔ مجھے شبہ ہو چلا تھا کہ شاید میرے خطوط تمہیں نہیں پہنچے۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم خیریت سے ہو اور بہت قلیل تنخواہ میں کم از کم تمہاری دال روٹی چل رہی ہے۔ غربت اور سختی کے دن ہم نے پہلے بھی بہت دیکھے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جب ہم ساتھ تھے اور اب یہ سارا بوجھ اکیلے تمہارے کندھوں پر ہے۔ خیر ہمیں اب بھی اتنا کچھ میسّر ہے کہ شکر ادا کرنا چاہیئے۔ مثلاً مجھے تو اب اس سے پہلے کبھی ایسا سکونِ قلب میسّر نہیں ہوا۔ کم از کم اس طرح کا سکون جو اس وقت ہے اب تو یوں لگتا ہے کہ جیسے دُنیا میں کسی سے کوئی شکایت ہی نہیں رہی بلکہ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ یہ جیل خانہ ختم کرنے سے پہلے ہم کہیں ولی اللہ نہ بن جائیں۔ اس لئے کہ اب کوئی بات، کوئی چیز بُری ہی نہیں لگتی۔ سارے جھوٹ، سارے فریب، وہ ساری تہمتیں جن پر پہلے دل کڑھا کرتا اب یاد کرو تو صرف ہنسی آتی ہے اور ایک طرح سے دِل خوش ہوتا ہے۔

جیسا کہ تم تصوّر کر سکتی ہو۔ لکھنے کی کوئی خاص خبر یا واقعہ یہاں ہمارے پاس ہے نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہم سب لوگ خوش ہیں مصروفیت کافی ہے اس لئے کہ عدالت اور وکیلوں سے صلاح مشورے میں کئی گھنٹے گزر جاتے ہیں، آج کل رات کو کھانے کے بعد میں اپنے ساتھیوں کو غالب کی شاعری کا درس دیتا ہوں اور بہت لُطف آتا ہے۔ اپنی بڑائی کی بات نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ میں بہت اچھا اُستاد ہوں اور مجھے مُدرّسی چھوڑ کر کبھی فوج میں نہیں جانا چاہیئے تھا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب اس مقدمے وغیرہ کی بکواس ختم ہو گی تو صرف پڑھنے لکھنے کا کام کروں گا۔ فی الحال مجھے اور کتابیں درکار نہیں ہیں لیکن کچھ

---

(۱) فیض کی بڑی لڑکی۔ پورا نام سلیمہ سُلطانہ۔ شادی کے بعد بیگم سلیمہ ہاشمی (۲) چھوٹی لڑکی۔ پورا نام مُنیزہ گُل شادی کے بعد بیگم مُنیزہ ہاشمی۔

رسائل بھیج سکو تو اچھا ہے۔ عید کے لئے عدالت غالباً چار دن بند رہے گی اور نوازش[1] صاحب تم سے ملنے آئیں گے۔ جو کچھ بھجوانا ہو اُن کے ہاتھ بھجوا دو۔ وہ بہت ہی اچھے آدمی ہیں اور مجھے بہت پسند ہیں۔ میں ہر روز اخبار میں موسم کا حال دیکھتا ہوں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ تم لوگ کس حال میں ہو۔ لاہور میں تو اس وقت بہت خوفناک گرمی ہوگی۔ یہاں موسم ایسا بُرا نہیں ہے۔ ہماری مصیبت گرمی نہیں ریت اور آندھی ہے۔ بنّے[2] کو آخر کار اپنے گھر والوں کا ایک خط ملا ہے۔ سب لوگ خیریت سے ہیں۔

(۵)

۲۳ جولائی ۱۹۵۱ء

میں تمہارے خیریت سے گھر پہنچنے کی اطلاع کا منتظر ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ ہماری ملاقات اس قدر مختصر تھی لیکن آج کل ہر چھوٹی بڑی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ بہر صورت تمہیں دیکھنے کے بعد دل پہلے سے زیادہ مطمئن ہے۔

تمہارے جانے کے بعد یہاں کا موسم یکایک بہت ہی ناخوشگوار ہو گیا تھا۔ گرمی اور حبس سے دم گھٹنے کی کیفیت تھی لیکن کل رات سے کچھ بہتر ہے۔ آج کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے دکھائی دے رہے ہیں اور کم کم ہوا چل رہی ہے۔ یہاں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ بارش نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مُلک میں بارش خوبیٔ آب و ہوا ہی نہیں ہم لوگوں کی نفسیاتی ضرورت بھی ہے

آج کے اخبار میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ امروز اور پاکستان ٹائمز کے دوست رہا کر دیئے گئے ہیں۔ میری طرف سے سب کو پیار پہنچا دینا۔

میں نے کتابوں کی جو فہرست بھیجی تھی اُس میں ایک عربی کتاب کا اضافہ کر دینا جو مجھے درکار ہے اور دستیاب ہو سکے تو باقی کتابوں کے ساتھ بھجوا دینا۔ کتاب کا نام ہے

---

[1] صاحبزادہ نوازش علی۔ جنھوں نے فیض کی جانب سے وکالت کی۔ [2] سجّاد ظہیر

دیوان الحماسہ اور مُصنّف کا نام ہے ابو تمام۔ اس کے علاوہ جتنے اردو دیوان مل سکیں بھجوا دو۔ گھر میں بہت سے ہوں گے۔ نذیر یا کسی اور دوست سے کہو کہ انتخاب کر دیں۔

یہاں زندگی حسبِ معمول گزر رہی ہے اور کوئی خاص بات لکھنے کی نہیں۔ امّاں کا ایک خط آیا ہے جس پر کوئی پتہ درج نہیں اس لئے مہربانی سے ملفوفہ خط انہیں بھجوا دو۔

۲ اگست ۱۹۵۱ء

(۶)

یہ سُن کر بہت پریشانی ہوئی کہ تمہیں گھر خالی کرنے کا نوٹس دیا گیا ہے .... سنسر نے کاٹ دیا...... ہو نہ ہو یہ محض کسی مسخرے کی حرکت ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اب تک معاملہ سُلجھ گیا ہوگا۔ میں نے اس سلسلے میں عدالت کو درخواست دی ہے اور اطلاع یہ ہے کہ عدالت والے حکومتِ پنجاب کو لکھ رہے ہیں۔ مجھے بے تابی سے یہ معلوم کرنے کا انتظار رہے گا کہ فیصلہ کیا ہوا۔ اگر گھر چھوڑنا ہی پڑا یا اس قسم کی حرکتیں جاری رہیں تو میرا مشورہ ہے کہ کسی مقامی مسلمان مالک مکان کا گھر کرائے پر لے لو۔ بہر صورت جیسے تم نے لکھا ہے یہ بھی اچھا ہے کہ ساری مصیبتیں ایک ہی بار روبرو آ جائیں اور سب سے ایک ہی بار نپٹ لیا جائے۔ تمہیں اس بارے میں کتنی پریشانی ہوگی میں جانتا ہوں اور تمہاری مشکلات کے خیال سے دل دُکھتا ہے لیکن صبر اور ہمّت کے سوا کوئی چارہ نہیں اور مجھے معلوم ہے کہ تم میں اُن کی کمی نہیں۔

اب یہاں موسم خوشگوار ہے اور مجھے اُمید ہے کہ لاہور میں گرمی کے زیادہ بُرے دن گزر چکے ہوں گے۔ تمہارے آنے کا انتظار ہے۔ جب بھی سہولت ہو آ جانا۔

آج کل ہم وزن کم کرنے کی فکر میں ہیں اور شام کو ڈیک ٹینس قسم کا بہت تیز کھیل کھیلتے ہیں۔ مصروفیت بہت ہے اور خط لکھنے کا وقت صرف ہفتے کے آخر میں چھٹی کے دن ملتا ہے۔ یہ خط کچھ بے ہنگم سا ہے جس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔

۱؎ ڈاکٹر نذیر احمد سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور

وجہ یہی عدیم الفرصتی۔ لیکن تمہارے خیال سے غافل نہیں ہوں اِس لیئے اپنا دِل مضبوط رکھو۔ یہ سَب کچھ بہت جلد گزر جائے گا۔

(۷)

۱۷ اگست ۱۹۵۱ء

کل تمہارا خط مِلا۔ یہ سُن کر اطمینان ہوا کہ مکان کی صورتِ حال ایسی تشویشناک نہیں ہے جیسا کہ خدشہ تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ اس بارے میں حکمِ امتناعی شائد ہو جائے اور تمہیں گھر چھوڑنا نہ پڑے۔ عدالت کے دفتر سے پتہ چلا کہ ججوں نے زوردار سفارش لکھی ہے۔ اور اگر اخبارات نے میرے حق میں (بلکہ تمہارے حق میں) کوئی کلمۂ خیر لکھا ہے تو میری گرفتاری کے بعد فِضا بہت بَدل چکی ہوگی۔ میری طرف سے خلیلؔ[1]، نظامیؔ[2] اور اُن سَب دوستوں کا اِنتہائی شُکریہ ادا کر دینا جنھوں نے اِس آڑے وَقت میں تمہارا ساتھ دیا ہے۔

اَب رسائل کے بارے میں تردد کی ضرورت نہیں۔ افتیؔ[3] کافی اَنبار چھوڑ گئے ہیں جو بہت دنوں تک چل جائے گا۔ البتہ فرانسیسی کی کچھ اَبتدائی کتابیں اور لغات بھجوا دو۔ بنّے نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں فرانسیسی پڑھائیں گے۔ یہاں دماغی کام میں کچھ زیادہ جی نہیں لگتا لیکن اپنی سی کوشش ضرور کریں گے۔ مجھے پڑھنے کا ایک لیمپ بھی چاہیئے اگر گھر میں کوئی زائد لیمپ ہو تو بھجوا دو۔

شائد ہم یہاں تم سے زیادہ آرام دہ زندگی گزار رہے ہیں لیکن ایک بات پر رشک آتا ہے اور وہ ہے تمہاری برسات۔ یہاں صرف ایک دفعہ بارش ہوئی ہے لیکن اس کا لاہور کی برکھا سے کیا مقابلہ۔ خیر شائد یہ بھی ٹھیک ہی ہے۔ اَچھّا مینہہ برسے تو اس سے اچھّی یادیں تازہ ہوں گی اور یہاں یادوں سے زیادہ لَو لگانا اچھّا نہیں، البتہ یہاں کے بے رنگ اور یکساں موسم میں خرابی یہ ہے کہ وہ انبساط اور اہتزاز جس سے شعر کی اُمنگ پیدا ہوتی ہے دل کو میسّر

---

[1] لاہور کے ایک صحافی [2] حمید نظامی مرحوم مدیر نوائے وقت لاہور [3] میاں افتخار الدین مرحوم

نہیں آتا۔ یہ مقدمہ تو شیطان کی آنت ہے۔ نہ جانے کب تک چلے اس لئے تم اپنے آرام اور پیسوں کے مطابق ملاقاتوں پر راشن مقرر کرو۔ بچّوں کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے لیکن تمہارے یا اُن کے آرام کی قیمت پر نہیں۔

بدقسمتی سے میرے ذہن میں کوئی ایسی تجویز نہیں جس سے تمہاری مالی امداد کی کوئی صورت نکل سکے۔ لیکن سُنا ہے کہ کراچی اور بعض دوسرے شہروں میں میری کتاب کی مانگ ہے اور اس کی اشاعت کے لئے پُرانے یا کسی نئے ناشر سے معاملہ طے کرلو۔ البتہ یہ احتیاط لازم ہے کہ کتاب ہمارے اپنے پریس میں چھپے۔ نذیر[1] یا صوفی[2] صاحب اس بارے میں مشورہ دے سکیں گے۔ یہاں کوئی نئی بات بتانے کی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ بارک میں ایک اور نفر کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ محمد حسین عطا ہیں (تم انہیں نہیں جانتی ہو)۔ اب ہمارے ہاں عجیب و غریب طائفہ جمع ہے جس میں پٹھان، پنجابی، کشمیری، یوپی والے، اسلامی سوشلسٹ، نیشنل سوشلسٹ، کمیونسٹ، ایک عدد قادیانی اور کچھ بالکل غیر سیاسی لوگ شامل ہیں۔ میرا شمار نہ جانے کس زمرے میں ہے۔ (اگرچہ میں جانتا ہوں کہ سی آئی ڈی کی فائلوں میں اپنی تشخیص کیا ہے) یہ بہت ہی خوش دل مجمع ہے اور سب ہی بہت اُچھے لوگ ہیں۔

اِمتحان میں تمہارے نتائج کا سُن کر بہت خوشی ہوئی۔ موجودہ حالات میں تمہارے فرسٹ کلاس کو بہت بڑھیا فرسٹ کلاس سمجھنا چاہیئے تم نے نمبر بھی مجھ سے زیادہ حاصل کئے ہیں۔ جو اپنی جگہ ایک کارنامہ ہے۔ اس کا تاسف ضرور ہے کہ تمہاری مزید تعلیم کے بارے میں اس وقت ہم کوئی منصوبہ نہیں بنا سکتے لیکن اُمید ہے کہ تم ایم اے فائنل کے لئے اپنی تعلیم جاری رکھ سکو گی۔

کچھ معلوم نہیں کہ یہ خط تمہیں کب تک ملے گا اس لئے اپنی سالگرہ کی مبارکباد

---

[1] نقشِ فریادی [2] صوفی غلام مصطفٰی تبسّم

ابھی سے قبول کرو۔ آئندہ تمہیں سالگرہ کا تحفہ بھیجنا کبھی نہیں بھولوں گا۔

(۸)

۱۸ اگست ۱۹۵۱ء

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تمہارے گھر کا معاملہ آخر طے ہو گیا۔ اس بات پر تھوڑی سی ندامت ہوتی ہے کہ ان سب قصّوں سے نپٹنے کے لئے میں نے تمہیں اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن شاید یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔ مشکلات کا سامنا کرنے اور ان پر قابو پانے کی صلاحیت صرف ایک ہی طریقے سے حاصل ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ آدمی عملی طور سے یہ کر کے دیکھے۔ بہر حال اپنا حوصلہ بحال رکھو اس لئے کہ ابھی ہمیں بہت دن جینا ہے اور بہت کچھ دیکھنا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب ہماری جوانی کی عمر نہیں ہے اور ضعیفی سے پہلے کے یہ چند سال بہت قیمتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اپنے پاس بہت وقت پڑا ہے۔ اپنے یہاں مجھے اس بات پر ہنسی بھی آتی ہے اور تھوڑا سا تاسف بھی ہوتا ہے کہ ہمارے نوجوان ساتھی ہم سے بالکل اس طرح پیش آتے ہیں جیسے ہم کوئی بڑے بوڑھے سفید ریش بزرگ ہیں۔ خاص طور سے ایک نوعمر کپتان[1] نے جسے ہم قرآن کا درس دیتے ہیں بالکل پیر بنا رکھا ہے۔ ہماری برادری میں فوجی عہدوں کی کوئی پروا نہیں کرتا اور ہر کسی کو اپنا کام خود کرنا پڑتا ہے لیکن ہمیں یہاں بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ پانی کا گلاس یا سگریٹ کی ڈبیہ اُٹھانے کے لئے خود بستر سے اُٹھنے کی زحمت برداشت نہیں کرنی پڑتی۔ کوئی نہ کوئی بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ لائل پور جیل[2] میں ہم نے جتنی اچھی عادتیں سیکھی تھیں اب چھوٹتی جا رہی ہیں اور اپنی فطری کاہلی واپس آ رہی ہے۔

افتی نے تم سے بالکل غلط کہا ہے کہ میں انہیں کمزور نظر آ رہا تھا بات یہ ہے کہ ہماری ملاقات رات کو کافی دیر میں ہوئی اور کچھ کھنچے کھنچے سے ماحول میں، شاید اس سبب سے انھیں کچھ مغالطہ ہوا ہو، انہیں خیال تھا کہ مجھے اُن سے شکایت ہے اس لئے انھوں نے آتے ہی اپنے عذر بیان کرنے شروع کئے جس سے ہمیشہ ہماری طبیعت اُلجھتی ہے۔ چنانچہ جس

---

[1] سابق کپتان خضر حیات   [2] یہ قیدِ تنہائی کا زمانہ تھا

ہنسی خوشی سے ملاقات ہونی چاہیئے تھی نہ ہو سکی جس کا افسوس ہے۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ ہم ہرگز بھی نحیف و نزار نہیں ہیں بلکہ لائل پور جیل میں جو دس پونڈ وزن گھٹایا تھا وہ دوبارہ بڑھ رہا ہے۔ یہاں رنج دہ بات صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ ریت اور مٹی کی وجہ سے سب لوگ گنجے ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہاں سے باہر آنے تک ہماری سب "سیکس اپیل" ختم ہو چکی ہوگی، یہ بہت المناک واقعہ ہوگا۔ اس کے بعد ہم پر تہمتیں تراشنے والے بیچارے کیا کریں گے۔ آخر ایک بوڑھے گنجے بزرگ کے بارے میں کوئی کیا اسکینڈل ایجاد کر سکتا ہے۔

کتابیں پہنچ گئی ہیں۔ یعنی عدالت میں پہنچ گئی ہیں اور غالباً دو چار دن تک مل جائیں گی۔

میزی کے لیئے — ابا کی طرف سے سالگرہ مبارک

(۹)

۲۸ اگست ۱۹۵۱ء

تمہارا ۲۳ تاریخ کا لکھا ہوا خط بچوں کی تصاویر سمیت آج ملا۔ تمہارے بچے کتنے خوبصورت ہیں اور کتنے بڑے نظر آنے لگے ہیں۔ یہاں اور باتوں کے علاوہ سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ میں انہیں اپنے سامنے بڑے ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اگرچہ تمہاری نگرانی میں انکی تربیت کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں ہے۔ اُن کی تربیت میں میرا تو اتنا ہی حصّہ ہو سکتا تھا کہ انہیں خوش رہنا سکھاؤں اور اُن کی خوب ناز برداری کروں۔ اگر وہ خود غرض، کم ظرف اور حریص نہ بن جائیں (اور مجھے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوگا) اور اگر اُن میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ کیا چیز باعزّت ہے اور کیا نہیں ہے تو وہ جیسے بھی اپنی زندگی بسر کریں ٹھیک ہے۔ ہمارے دوست سُرجیت سنگھ[1] نے کہا تھا "PEACE COMES FROM WITHIN"۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو میں انہیں بتاتا کہ اس کے صحیح معنی کیا ہیں۔ اَب صحیح طور سے پتہ چلا ہے کہ اگر اپنے دِل میں جُرم و گناہ کا کوئی احساس نہ ہو تو آدمی عذاب

---

[1] گورنمنٹ کالج، لاہور میں ساتھی تھے اور بعد میں آل انڈیا ریڈیو شملہ میں ملازم ہو گئے۔

اور دُکھ درد، سب مفارقتیں، سب سختیاں، سب صعوبتیں، غرض وہ سب کچھ برداشت کرسکتا ہے جو باہر سے اُس کی ذات پر نازل ہوں۔ صرف گناہ کا احساس، خطا کاری کا احساس یا اپنے آپ سے دغا کرنے کا احساس ایسی چیز ہے جس کا کوئی مداوا، کوئی علاج نہیں ہوسکتا اِسلئے کہ یہ داخلی چیز ہے اور اس کا احساس زندگی بھر اپنے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے خلاف اگر اپنی نیکی اور بے گنہی پر یقین ہو جیسا کہ اس مصیبت میں مجھے اور تمھیں ہے تو سب بے وجہ کی تکالیف و حادثات شعر کی اِصطلاح میں سمندِ شوق کو تازیانے کا کام دیتے ہیں۔

کتاب کے بارے میں یہ ہے کہ اس کا آخری ایڈیشن چوتھی طباعت تھی جس میں کچھ تصحیح کا کام باقی ہے۔ اگر تم خود چھپوا سکو تو اچھا ہے بشرطیکہ کوئی دوست اُس میں امداد کرسکے۔ انتساب پر غالباً آجکل کوئی قضیہ نہیں ہوگا اس لئے کہ آجکل ہمارے سب دوست (خواتین و حضرات دونوں) یہ ثابت کرنے کی فکر میں ہوں گے کہ اُن کی ہم سے کبھی آشنائی نہ تھی۔

گزشتہ ہفتے سے پاکستان ٹائمز ملنا شروع ہوگیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی بچھڑا ہوا بچّہ دوبارہ آملا ہے۔ اَب جب کہ میرا خون پسینہ اس کی اشاعت پر صرف نہیں ہو رہا ہے اور میں اسے الگ تھلگ ہو کر دیکھ سکتا ہوں تو یہ خاصا بھلا اخبار معلوم ہوتا ہے۔ البتہ بلاک کی چھپائی کچھ اچھی نہیں ہے۔ کسی کی سرزنش ہونی چاہیئے۔

(۱۰)

۹ ستمبر ۱۹۵۱ء

آج اتوار ہے۔ صبح آنکھ کھُلی تو روزمرّہ کی طرح اپنی بارک کی بے رونق دیواروں[۱] در چارپائیوں کے حجم غفیر کے بجائے ایک نرم و نازک پودے پر نظر پڑی جو ہوا میں جھوم رہا تھا۔ اس

۱۔ نقشِ فریادی۔

کے مہین پتّوں میں سے دُور کہیں ایک آدھ ستارہ جھانک رہا تھا اور ایک بہت بڑا سفید پرندہ مروارید رنگ آسمان کی جانب محوِ پرواز تھا۔ یہ عجوبہ اس لئے ہوا کہ دو دن پہلے ہمیں کچھ اور رعایتیں دی گئی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ اَب ہم اگر چاہیں تو باہر کھُلے میں سو سکتے ہیں۔ پہلی دو راتیں تو میں نے بارک کے اندر ہی گزار دیں۔ دِل میں اَبْ بھی کچھ نازک مقام ایسے ہیں جن سے کوئی یاد چھُو جائے تو دُکھنے لگتے ہیں۔ اِس لئے صحرائے سندھ کے گداز آسمان اور پچھلے پہر کے اُداس چاند کو دیکھنے سے ڈر سا لگتا تھا۔ لیکن کل رات ہمارے بارک روم میں کچھ ایسی کھگدڑ مچی کہ آخر مجھے بھی باہر آنا پڑا۔ باہر کی نامانوس فضا سے بار بار نیند اُچٹتی رہی لیکن یہ بے خوابی بُرا سودا نہیں تھا، صرف اس وجہ سے نہیں کہ باہر رات کا منظر کچھ اور ہوتا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اَبْ موسم بھی بَدل چکا ہے اور گرمیوں کی اُکتا دینے والی یکسانیت کے بجائے ہوا، روشنی اور آسمان دِن رات میں کئی بار دل تڑپا دینے والے رنگ بَدلتے ہیں۔ خاص طور سے شام ڈھلے جَبْ پہلے پہل ستارے طلوع ہوتے ہیں تو آسمان کے نظارے سے محض وسعت اور فاصلے ہی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اس میں رنگ و حرکت کے اُتار چڑھاؤ سے ایسے گوناگوں نقشے بنتے ہیں کہ دِل خوش ہو جاتا ہے۔ آج کل بہت شدّت سے اپنی زندگی کا سَب سے دلکش بسیرا یاد آ رہا ہے۔ یعنی دہلی میں لودھی روڈ والا گھر اور بارش کے بعد گرد و پیش کا سماں، پٹھان مقبروں کے گرانڈیل گنبد، وہ ہمارے گھر کے سامنے کا طلسمی پُل اور اُسے چومتی ہوئی کہکشاں کی کمان۔ اس دَرد کی چبھن دل میں نہ ہو تو آدمی کبھی پوری طرح محسوس ہی نہ کر پائے کہ زندگی کس قدر مہربان اور کتنی حَسین ہے۔

افسوس کہ ہم نے کبھی گاؤں میں چھُٹّیوں کے دِن ساتھ نہیں گزارے ورنہ میں تمہیں کچھ اور بھی پُرانی یادوں میں شریک کر سکتا۔ جو آج کل یہاں چھُٹّیوں کی صبحیں دِل میں جگاتی رہتی ہیں۔ جیل خانے کے صحن میں چارپائیوں کی قطار اور لپٹے ہوئے بستروں کے انبار، اونچی اونچی دیواروں پر تیز روشنیاں اور لانبے سائے، ہر طرف غنودگی اور کسلمندی کی سی فضا تیز رو ہوائیں

پتّوں کی سرسراہٹ پر بہتے ہوئے پانیوں کی آواز کا دھوکا، اِن سب باتوں سے اپنے گاؤں میں چھٹیوں کے وہ بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں جب ہم بہت چھوٹے تھے اور ریل اسٹیشنوں پر جانے کا فیشن ابھی نہیں چلا تھا۔ یہاں آس پاس کسی طرح چند بھینسیں اور رہٹ کی رُوں رُوں پیدا ہو جائے تو گاؤں کا منظر مکمّل ہو جائے۔

میں جیل خانے کی رعایتوں کی بات کر رہا تھا۔ ہمیں ایک ریڈیو سیٹ بھی مل گیا ہے۔ آرام کرسی، میز کی لیمپ اور کچھ اور ساز و سامان کا بھی وعدہ ہو چکا ہے۔ اب تو ہم میں سے بعض کو یہ فکر لاحق ہو گئی ہے کہ یہاں سے نکلے تو یہ معیارِ زندگی کیسے قائم رکھ سکیں گے۔

تاثیر[1] کا مسوّدہ جب بھی ملا میں صاف کر کے بھجوا دوں گا۔ کرس[2] اور بچّے کیسے ہیں۔ اخبارات میں کرس کا نام بار بار نظر آتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑی خدائی فوجدار ہو گئی ہیں، یہ بھی دیکھا کہ بیگم عرفان اللہ کی تصویر آخر کار پاکستان ٹائمز میں چھپ ہی گئی اور وہ بھی بہت نمایاں طور سے۔

اور کوئی نئی خبر نہیں ہے سوائے اس کے کہ عید کے لئے بڑے پیمانے پر ایک ضیافت کا اہتمام ہو رہا ہے پہلی دفعہ تمام اسیروں کے بیوی بچّے یہاں جمع ہوں گے اور ہمیں اجازت مل گئی ہے کہ اس دن ہم سب مل کر کھانا کھا سکیں۔ چنانچہ آج کل مُرغ قورمہ اور بریانی کے سوا دوسرا موضوع گفتگو نہیں۔

(۱۱)

۱۹ ستمبر ۱۹۵۱ء

چھٹّی کا ہفتہ ختم ہونے کو ہے اور کل سے ہم پھر اپنی روز مرّہ دفتری مشقت شروع کریں گے (اپنی عدالت کو ہم دفتر کہتے ہیں)۔ اس ہفتے میں ہمارے ہاں دو عدد سوشیل تقریبات منعقد ہوئیں۔ پہلی تو دوسرے گھر میں رات کے کھانے کی دعوت تھی جس پر میں اور ایک اور

---

[1] ڈاکٹر محمد دین تاثیر [2] بیگم تاثیر کا نام شادی سے پہلے کرسٹابیل جارج تھا۔ کرس مخفف ہے کرسٹابیل کا۔ بیگم تاثیر اور بیگم فیض سگی بہنیں ہیں۔

صاحب مدعو تھے۔ یہ تقریب اس خوشی میں منعقد ہوئی کہ بریگیڈیئر لطیف خاں کو ان کی بیگم نے کافی بنانے کا ایک پرکولیٹر اور کچھ آم اور پھل بھیجے تھے۔ اپنے کو یہ تاثر دلانے کے لئے ہم باہر کھانے پر جا رہے ہیں۔ ہم نے نہا دھو کر پُر تکلّف لباس پہنا اور دیر تک گپ کرتے رہے۔ دوسری شاندار تقریب وہ عید پارٹی تھی جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ اس میں پہلی بار مجھے بچّوں کی ہنسی کی دلکش موسیقی کا احساس ہوا۔ اگرچہ اس سے پہلے مجھے بچّوں کا شور و غُل بالکل اچھّا نہیں لگتا تھا۔ بہت جی چاہا کہ تم بھی یہاں ہوتیں لیکن شاید اچھا ہی ہوا کہ تم نہیں تھیں۔ اس قسم کی ملاقات کا انجام ہمیشہ درد و حسرت کا خمیازہ ہوتا ہے۔ مجھے تمام وقت یہ خیال ستاتا رہا کہ مسرّت اور خود فراموشی کے چند لمحے گزر جانے کے بعد ان بے چارے بیوی بچّوں کے دل میں رنج و فراق کا گھاؤ اور بھی گہرا ہو جائے گا۔ لذّت پرستی کے فلسفے میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ اگر وقتی لذّت کے بعد اس لذّت سے زیادہ دُکھ اُٹھانا پڑے تو اس لذّت سے گریز کرنا چاہئے۔ اس سوال کا حل مشکل اس لئے ہے کہ اس لذّت اور درد کا تناسب پہلے سے دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہم زندگی کی چھوٹی موٹی تفصیلات میں اتنے اُلجھے رہتے ہیں کہ اخلاق و فلسفے کے بے کار مسائل سے اُلجھنے کے لئے نہ وقت ہے نہ دماغ۔ مثال کے طور پر ابھی کچھ دن پہلے ہمیں ایک ریڈیو سیٹ عنایت ہوا تھا اور سب لوگ اس میں ایسے ہی منہمک رہتے ہیں جیسے جیسی اپنے فلمی گانوں میں۔ پھر ہمارے وارڈ کی کالی بلی نے دو تین بہت نازک سفید اور سیاہ بچّے دیئے اور سب لوگ پرورش اطفال کے پیچیدہ مسائل میں غرق ہو گئے۔ اس کے بعد عید کے کھانے کی تفصیلات پر بحث و تکرار شروع ہوئی۔ ان کے علاوہ بیسیوں مسائل اور بھی ہیں مثلاً کوٹھریوں کے پردے کیسے ہوں گے؟ پڑھنے کی میزیں کب ملیں گی؟ صبح کی چائے کس وقت آئے گی وغیرہ وغیرہ اور اس تمام مدّت میں یکساں دنوں کی ساکن سطح پر یاد کے سائے لمبے ہوتے جا رہے ہیں اور وقت کی نبض دیکھتے دیکھتے سُست رفتار ہوتی جا رہی ہے۔ اب دن چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں اور صبح جب ہم چائے کے لئے اُٹھتے ہیں تو رات کا اندھیرا کچھ کچھ باقی ہوتا

ہے۔ نہ جانے کتنے سالوں کے بعد شب کے خاتمے پر اندھیرے میں پو پھٹنے کا سماں اور چاند کے ہلکے نقرئی رنگ کو روپہلی بنتے دیکھا ہے۔ جیل کی دیواروں کے باوجود یہ سب کچھ حسین ہے اور ایسے لمحوں میں زندگی کی سب بے وفائیوں کے باوجود اس کا شکرانہ ادا کرنے کو جی چاہتا ہے۔

آج تاثیر کی کتاب[1] ملی۔ دو تین دن میں جو کام درکار ہے ختم کر کے واپس بھجوا دوں گا۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ زیادہ سکونِ قلب اور اطمینانِ خاطر میسّر ہوتا تاکہ اس پر کچھ زیادہ توجہ دے سکتا۔ بہرصورت اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔ تاثیر کی نظموں کا کیا ہو رہا ہے۔ اگر مسوّدہ تیار ہے تو کیا وہ بھی اس کتاب کے ساتھ نہیں چھپ سکتا۔ حمید[2] احمد خاں اس کے لئے سوانحی خاکہ لکھ سکتے ہیں۔ اور کسی تمہید یا دیباچے کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے۔

(۱۲)

۲۴ ستمبر ۱۹۵۱ء

سالگرہ مبارک اور تمہیں ایسے بہت سے دن دیکھنے نصیب ہوں، اب کے یہ دن خوشی کا دن نہیں تھا لیکن جو کچھ ہم پر گزری ہے اس کے سبب سے آئندہ ایسے سب دن پہلے سے بھی زیادہ بھرپور اور بیش قیمت ہوں گے۔ شاید "ہم پر گزری ہے" کے بجائے" جو کچھ تم پر گزری ہے" لکھنا چاہیئے اس لئے کہ مجھ پر تو کچھ ایسی نہیں گزری، صرف یہ خیال آتا ہے کہ جس کی خاطر تم نے اتنا دکھ سہا اُسے ہم سے کوئی بہتر شے ہونا چاہیئے تھا اور جو قیمت تم نے اس رفاقت کی ادا کی ہے اُس کا کچھ بہتر معاوضہ دیا جانا چاہیئے تھا، اتنے زمانے کے بعد اپنی کوتاہیوں کے لئے معذرت کرنا کچھ بے کار سی بات ہے خیر! سُدھرنے کی کوشش تو کر دیکھنا چاہیئے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ ایک خاص عمر کے بعد انسان بنیادی طور سے اپنے آپ کو بدل نہیں سکتا اور اپنی اصلاح کے بارے میں زیادہ خوش فہمی فضول ہے لیکن یہ بھی ہے کہ جب تک چند کڑی آزمائشوں سے گزرنا نہ پڑے اپنی ذات کے جھوٹ سچ کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ نہ اپنی اصلی شخصیت

---

[1] ڈاکٹر تاثیر کا مختصر ناول کنول [2] سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی

اور اُس شخصیت کے درمیان فرق واضح ہوتا ہے جو دکھاوے کے لئے آدمی دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

تم نے پوچھا ہے کہ تمہارے لئے ساتھ کیا لاؤں؟ تم خود آجاؤ اور اُن دو ہنستے ہوئے چہروں کو ساتھ لیتی آؤ۔ اس سے زیادہ اور مجھے کیا چاہیئے۔ لیکن یہ بالکل اچھا نہیں لگتا کہ تم میرے لئے اِتنا خرچ کرو جب تمہارے پاس اپنے لئے اتنا کم ہے۔ اگر بچّوں کا بہت اصرار ہو تو میرے لئے (بلکہ ہمارے لئے، اس لئے کہ یہاں قاعدے کے مطابق کسی کو اکیلے کچھ ہضم کر جانے کی اجازت نہیں ہے) کچھ مٹھائی اور چاکلیٹ لیتی آنا۔

میں نے کنول ختم کر لی ہے اور مسوّدہ براہِ راست کرس کو بھیج دیا ہے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۵۱

(۱۳)

گزشتہ کچھ دن بہت گرمی پڑی اور بہت گرم موسم رہا۔ آج پہلے دن کچھ بہتر ہوا ہے اور ہوا دوبارہ چلنے لگی ہے۔ یہاں عجب قصّہ ہے کہ اگر گرد و غبار کی مصیبت سے بچو تو گرمی کا عذاب ہے اور اگر بادِ صبا سے لُطف اندوز ہونا چاہو تو ریت سے مُنہ سر اَٹ جاتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ یہ خط ابھی تک ڈاک میں نہیں گیا۔ وجہ یہ تھی کہ میں کنول کا دیباچہ ختم کرنا چاہتا تھا تاکہ اِسی خط کے ساتھ بھیج سکوں۔ مسوّدے کی تصحیح کا کام تو مَیں نے دو ہفتے پہلے ختم کر دیا تھا لیکن دیباچہ جب سے اَٹکا ہوا تھا۔ دماغ اور قلم دونوں نے بغاوت کر رکھی تھی اور کچھ لکھا ہی نہیں جاتا تھا۔ اَب کہیں جا کر اس سے فراغت ہوئی ہے اور میں نے دونوں چیزیں کرس کو بھیجدی ہیں۔ اُن سے کہو کہ مجھے رسید سے مطلع کر دیں۔

آج رات ہمارے ہاں مشاعرہ ہے۔ دیکھیں ہمارے سپاہی نوجوان کیا لکھ کر لاتے ہیں۔ لُطف رہے گا۔ کل مجھے انہیں شاعری پر لیکچر دینا ہے۔ مقدمے کے سلسلے میں بھی کافی کام رہتا ہے، اور جتنا کاہل بننے کو جی چاہتا ہے اِتنی فراغت میسّر نہیں آتی۔ مجھے احساس ہے کہ جُدائی کا یہ زمانہ توقع سے زیادہ طویل اور تکلیف دہ ہوتا جا رہا ہے لیکن اس خیال سے کچھ ڈھارس

ہوتی ہے کہ جو دن گزرتا ہے اُس سے نجات اور تجدیدِ ملاقات کی منزل ایک دن اور قریب آ جاتی ہے۔ اور سفر کا رُخ اسی منزل کی جانب ہے نہ کہ اُس کے مخالف۔ تمہاری نظر میں کوئی ایسا دوست ہے جس سے چیخوف کے ڈرامے مانگ کر بھجوا سکو؟ میں THREE SISTERS دوبارہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ کالج کے زمانے میں پڑھ کر دل پر بہت اثر ہوا تھا اُس کے بعد دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

بنّے کو ایک خط محمودؔ[1] اور رشیدہؔ[2] کا ملا ہے۔ یہ لوگ اب ڈیرہ دون میں مقیم ہیں میں تمہارے ساتھ اگلی چھٹیاں ان کے خوبصورت گھر میں منانے کا خیالی پروگرام بناتا رہتا ہوں۔ یعنی اگر ہم انگلستان نہ جا سکے تو۔

(۱۴)

۳۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء

آج تمہارا خط ملا، بڑی راحت ہوئی۔ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ دُعا ہے کہ تمہیں (بلکہ ہمیں) یہ دن کئی بار دیکھنا نصیب ہو۔ ان دس برس میں ہم نے بہت سا سُکھ دیکھا ہے اور تھوڑا سا دُکھ بھی۔ لیکن ہم نے یہ تمام دن دیانت داری اور سکونِ خاطر سے گزارے ہیں اور زندگی میں سب سے اہم بات یہی ہے، تو آؤ ان بیتے ہوئے دنوں کا شکرانہ ادا کریں، یہ دس برس ایسی دولت ہیں جسے کبھی فنا نہیں اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اگر کسی کا عقبیٰ یا آسمانی احکامات پر ایمان نہ ہو تو نیکی اور اخلاق کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ جو لمحہ حق و صداقت کی پرورش میں گزرے وہ بجائے خود خوشی کا ایسا خزینہ بن جاتا ہے جسے کوئی رہزن لوٹ نہیں سکتا۔ نہ کوئی جابر ضبط کر سکتا ہے۔ شاید مذہبی اصطلاح میں توشۂ آخرت کے صحیح معنی یہی ہیں۔

---

[1] صاحبزادہ محمود الظفر

[2] رشید جہاں۔ صاحبزادہ محمود الظفر کی بیگم۔ دونوں میاں بیوی فیضؔ کے دوست تھے۔

تم نے اپنے گھر کی تنہائی کا ذکر کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تنہائی کتنی کڑی اور جدائی کے یہ لمحے کتنے گراں ہیں۔ ان کو دل سے دھویا تو نہیں جا سکتا لیکن ان کا بوجھ اس تصوّر سے کم ضرور کیا جا سکتا ہے کہ بیتے ہوئے دن کیسے اچھے تھے اور آنے والے دن کتنے بہتر ہوں گے۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ جب سے جیل خانے کا دروازہ بند ہوا ہے میں کبھی ماضی کے پیرہن کو تار تار کر کے اسے مختلف صورتوں میں دوبارہ بنتا رہتا ہوں اور کبھی آنے والے دنوں کو دامِ تصوّر میں مُقیّد کر کے ان سے اپنی مرضی اور پسند کے مختلف مرقعے ترتیب دیتا رہتا ہوں یہ جانتا ہوں کہ یہ بیکار سا شغل ہے اس لئے کہ خوابوں کو حقیقت کی زنجیروں سے آزاد نہیں کیا جا سکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے آدمی تخیّل کے بل پر گرد و پیش کی دلدل سے پاؤں چھڑا سکتا ہے۔ فراریت بُری بات ہے لیکن جب ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہوں تو آزادی کی واحد صورت یہی رہ جاتی ہے۔ اسی نسخے کے طفیل مجھے جیل کی سلاخیں بہت ہی حقیر اور بے حقیقت دکھائی دینے لگی ہیں اور بیشتر اوقات اُن کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔

تم کہو گی کہ ہم بقراطی چھانٹ رہے ہیں اس لئے آؤ کوئی اور بات کریں۔ چند دن ہوئے میں نے ریڈیو کھولا تو معلوم ہے اُس جانب کون تھا۔ اپنے اے۔ ایس۔ بی[1]، امریکی اخبار والوں کی کھنچائی کر رہے تھے۔ بہت لُطف آیا۔ خاص طور سے اتنی بہت سی امریکی خنخنی آوازیں سُن کر امریکہ کے لئے دل اُداس ہو گیا۔ "ڈاکٹر بکاری کیا آجکل کسی مُلک کے لئے واقعی غیر جانبدار ہونا ممکن ہے؟" بخاری صاحب نے جواب دیا "بھئی واقعہ ہے کہ آج کل کچھ مُلک واقعی غیر جانبدار ہیں اور اگر غیر جانبداری ممکن نہیں تو ایسا کیونکر ممکن ہوا؟" بہت دِل لگی رہی۔ (یہ امریکی اپنے خاص لہجے میں کنٹری کو کنٹیری، ورلڈ آف ٹوڈے کو ورلڈ آف ٹوڈائے اور نیوٹرل کو نُوٹرل کہہ رہے تھے)۔

---

[1] احمد شاہ بُخاری (پطرس)

یہاں گرمی کا موسم غیر معمولی طور سے طویل ہوتا جا رہا ہے۔ راتیں خُنک ہو چکی ہیں لیکن دِن اَب بھی گرم ہیں۔ اگرچہ بہت ناخوشگوار نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کے اِس حصّے میں گُلابی جاڑوں کی وہ سحر آفریں رُت وارد ہی نہیں ہوتی جس سے ہم پنجاب میں آشنا ہیں۔ وہ موسم جب ہوا کا ہر جھونکا کسی کے پیار کا لمس محسوس ہوتا ہے اور گداز آسمانوں میں کسی دوشیزہ جسم کی سی نرمی اور آنچ محسوس ہوتی ہے۔ خیر ایسے موسم سے آسودگیٔ نفس کا کچھ بدل مجھے اُس خوشبو سے ہاتھ آجاتا ہے جو تم نے بھیجی تھی اور جسے میں ہر رات اپنے تکیے پر چھڑک دیتا ہوں۔ پہلی شام جب یہ خوشبو ہمارے برآمدے میں بکھری تو شہرِ زنداں میں سنسنی دوڑ گئی۔

اتوار۔ میں نے فرانسیسی میں کافی ترقّی کرلی ہے۔ جب ہم ملیں گے تو فرانسیسی میں گفتگو کریں گے۔ اِس لئے اگلے سال پیرس جانے کا پروگرام پکّا کرلو۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے کوئی فرانسیسی کتاب درکار ہوگی۔ موپساں یا کسی اور مصنّف کی کتاب جو سلیس اور سادہ زبان میں ہو مل سکے تو بھجوا دو۔

۹ نومبر ۱۹۵۱ء

(۱۵)

تمہارا دوسرا خط مجھے ابھی ملا۔ غالباً میرا پہلا خط پہنچ گیا ہوگا۔ مجھے خیال ہے کہ میں نے ہماری شادی کی سالگرہ کی تاریخ پھر غلط لکھی۔ لیکن اَب کے ایک ہی دِن کا فرق تھا۔ خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ یہ دِن اِتنا اہم نہیں جتنے وہ روز و شب ہیں جو اُس دن کے بعد آئے۔ اُن سارے دِنوں کی یاد اور اُن سَب نعمتوں کا احساس جو زندگی نے عطا کی ہیں، بہت سے لوگوں کی دوستی اور محبّت، تمام بہاریں، سَب برساتیں، صبحیں اور شامیں، غروبِ آفتاب اور طلوعِ ماہتاب، الفاظ، اصوات، رنگ و بُو کا حُسن، لُطف و انبساط کی بے انت وارداتیں، اِن سَب باتوں سے جیل کی بے رونقی میں دل پر ایسی مُسرّت طاری ہوتی ہے جس سے ہم پہلے آشنا نہ تھے۔ اگر دو چار دوستوں نے دغا کی یا زندگی میں درد و کراہت کے چند لمحے پیش آئے تو اِن نعمتوں کی میزان کے سامنے اُن کی کیا وقعت ہے۔ کچھ بھی نہیں۔

یہ احساس پوری طرح جیل خانے ہی میں میسّر آسکتا ہے اس لئے کہ جیل خانے کی دُنیا باقی دُنیا سے الگ تھلگ ایک دُنیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایک طرح کی ”اگلی دُنیا“ ہے جو روزمرّہ دُنیا سے اتنی دُور دراز اور ایسی بلند وبالا معلوم ہوتی ہے کہ اُس کی نارسا بلندیوں پر سے انسان نیچے کی انسانی دُنیا کو بہت بسیط اور جامع نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اگر کوئی دیکھنا چاہے تو۔ ہم تو بیشتر اوقات اِدھر دیکھتے ہی نہیں، دامنِ دل کھینچنے کے لئے ہر گوشۂ تنہائی کی اپنی دلچسپیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔

اِس خرافات سے جو میں خطوں میں لکھتا رہتا ہوں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں موسم کے علاوہ اور کچھ لکھنے کو ہوتا ہی نہیں۔ ہماری عدالت ضرور ہے لیکن اس کے بارے میں کچھ لکھ نہیں سکتے۔ بہر صورت تم یہ مت سمجھو کہ ہم بہت خود بین ہوتے جا رہے ہیں۔ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے اور آج کل ہم احوالِ عالم کے بارے میں پہلے سے کہیں زیادہ باخبر ہیں۔ جیل سے باہر پڑھنے اور سوچنے کی اتنی فرصت ہی کب تھی۔

جوئؔ[1] سے ملاقات ہو تو میرا پیار دینا۔ مجھے اُمید ہے کہ اُسے ملازمت مل جائے گی۔ اُس بے چاری پر سخت افتاد پڑی ہے لیکن آنے والے کل سے ہمیشہ بہتری کی اُمید رکھنی چاہئے۔ اور گزشتہ کل کبھی واپس نہیں آتا۔ تم نے ہمارے دوستوں کے ایک جوڑے کی ناچاقی کا ذکر کیا ہے جس سے رنج ہوا۔ ایسے حادثوں میں جسے گھر اُجڑنا کہتے ہیں مجھے کبھی کسی فریق پر غصّہ نہیں آتا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس رویّے سے بیشتر نیک پاک لوگ جن میں تم بھی شامل ہو، بہت برہم ہوتے ہیں لیکن مجھے غصّہ اس لئے نہیں آتا کہ ایسے واقعات میں بیشتر دُکھ اور دردِ دل ہی کا مضمون غالب رہتا ہے۔ اگر گھر اُجڑنے کے بعد فریقین میں سے کوئی بھی راحت حاصل کر سکے تو خوش ہونے والے فریق سے خفا ہونا جائز لیکن عام طور سے یوں نہیں ہوتا۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ لوگ ایک ناخوشی سے نجات پانے کے لئے اس طرح کی حرکت کرتے ہیں اور نتیجے میں اُس سے

---

[1] بیگم محمد افضل۔ افضل ٹریڈ یونین کے کارکن تھے۔ آجکل لندن میں مقیم ہیں۔

زیادہ ناخوشی مول لے لیتے ہیں۔ خود غرضانہ مسرت سے خفگی بجا۔ لیکن ناخوشی سے کوئی خفا کیسے ہو سکتا۔ خواہ وہ کیسی ہی خود غرضانہ یا غیر اخلاقی کیوں نہ ہو۔ رنج و ناخوشی پر تو صرف رحم ہی کھایا جا سکتا ہے۔ اِسی سبب سے نہیں کہ ذاتی رنج و ملال قابلِ رحم چیز ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ بیشتر دُکھ درد وہ حالات اور عوامل پیدا کرتے ہیں جن کا وجود کسی فرد کی ذمّہ داری ہے اور نہ اُس کی خطا۔

پیپلز پبلشنگ ہاؤز کے رؤف ملک کا بہت دردناک خط آیا ہے۔ لکھا ہے کہ اِن لوگوں کے حالات بہت ابتر ہیں اور اگر میں اپنی نظمیں اور مضامین انہیں اشاعت کے لئے دے دوں تو وہ انہی شرائط پر چھاپ دیں گے جو موجودہ ناشر سے طے ہوئی ہیں۔ میرے لئے اس فرمائش سے انکار مشکل ہے۔ ہمارے لئے کچھ ایسا فرق بھی نہیں پڑتا اور آج کل رؤف ملک کی امداد کرنے والے بہت کم ہوں گے اس لئے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ میں اپنی نئی نظمیں ایک نئے مجموعے کے لئے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں آنے کے بعد بالکل غیر شاعرانہ کیفیت طاری ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ لیلائے سخن جلد لوٹ آئے گی۔

تمہارے نیگرو[1] شاگرد کا سُن کر خوشی ہوئی۔ ”غریب دوست“ کا لقب ہمارا سب سے عظیم الشان اعزاز ہے۔ اِس کے مقابلے میں قیصر کا لقب ہیچ ہے۔ تمہارے نیگرو شاگرد سے مجھے ڈاڈر سینی ٹوریم میں تپِ دق کی ایک مریضہ یاد آ گئی جسے جیل میں آنے سے چند دن پہلے میں نے حکومتِ سرحد سے وظیفہ دلوایا تھا۔ نہ جانے اُس بے چاری کا کیا ہوا۔ اس کا نام اور پتہ تو مجھے یاد نہیں لیکن اگر میرے اسٹینو نذیر[2] سے دریافت کرو تو شائد وہ حکومتِ سرحد کا خط برآمد کر سکے جس پر مریضہ کا پتہ درج ہے۔ اگر ایسا ہو تو میری طرف سے اُس کا حال پوچھ لینا۔

زندگی حسبِ معمول گزر رہی ہے ہم نومبر کے موسم کا ایک بہت ہی گھٹیا سا بدل دیکھ رہے ہیں اور اندر سونے لگے ہیں۔ جو بھی دوست ہاتھ آئے اُسے سلام پہنچا دینا۔

---

[1] اسلامیہ کالج میں پڑھنے والا ایک افریقی طالب علم۔

[2] پاکستان ٹائمز میں فیض کے اسٹینو گرافر۔

۱۶ نومبر ۱۹۵۱ء

(۱۶)

گزشتہ دو چار دن میں تمہارے تین خط ملے۔ سبحان اللہ۔ اخبارات سے پتہ چلا کہ کراچی والے ممتاز حسین[۱] رہا ہو گئے ہیں اس لئے اب امید ہے کہ میرے مضامین برآمد ہو سکیں گے۔ میں انہیں اس بارے میں لکھ رہا ہوں۔

اگر ادبِ لطیف والے میری نظمیں چھاپ چکے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن انہیں کہلوا دو کہ اُن کا معاوضہ تمہیں بھجوا دیں اور جس شمارے میں چھپی ہیں وہ مجھے بھجوا دو۔

بُدھ۔ اس خط کے لئے تمہیں معمول سے زیادہ انتظار کرنا پڑا جس کے لئے معذرت چاہتا ہو۔ گزشتہ چند دن بہت بے کیفی میں گزرے اور اپنے روزانہ فرانسیسی سبق کے علاوہ بہت کم پڑھنا لکھنا ہو سکا۔ یہاں بعض اوقات زندگی اور وقت دونوں اس طرح سے ساکن ہو جاتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کو بالکل جی نہیں چاہتا۔ لیکن یہ لمحات جس طرح بے وجہ اور بے سبب وارد ہوتے ہیں ویسے ہی گزر بھی جاتے ہیں اس لئے زندگی کے معمول میں کچھ ایسا فرق نہیں آتا۔ یہ وقفے اُسی "ماورائی کیفیت" کا ایک حصہ ہیں جس کا میں نے گزشتہ خط میں ذکر کیا تھا۔

تمہارے خط پہلے سے زیادہ بشاش معلوم ہوتے ہیں جو خوشی کی بات ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ شائد تم نے یہ بشاشت مجھے خوش کرنے کے لئے اختیار کی ہے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل خوش ہوتا ہے۔ ہمارے دوست اور بہی خواہ اپنا مَن بہلانے کے لئے جو خوش آئند افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ میں انہیں زیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن ان افواہوں سے قطع نظر اس میں کیا شبہ ہے کہ آخرکار حالات سُدھر ہی جائیں گے۔ جو بھی دن گزرتا ہے اس سے نجات کی منزل کا فاصلہ اور کم رہ جاتا ہے چنانچہ اس آزمائش کے خاتمے تک محض صبر و تحمّل درکار ہے۔ ہاں اس خیال سے تسکین اور تسلّی ضرور ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہمیں بھولے نہیں اور ہماری افتاد کے لئے اُن کے دل میں ہمدردی موجود ہے اور جب اس ہمدردی کا اظہار ہم عصر دُنیا کی

---

[۱] اردو کالج کراچی کے اُستاد۔

ایک ایسی عظیم شخصیت کی جانب سے ہو جیسے کہ پال رالبسن ہیں تو افتخار سے سر اونچا ہو جاتا ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اخبار میں تمہارے صفحے پر اب نیٹا[1] نظر نہیں آتی۔ تحریری مقابلوں کا خیال اچھا ہے لیکن کیا اس کے ساتھ خواتین کے لئے کسی بحث یا معاشرتی فیچر کی ابتداء نہیں ہو سکتی؟ کسی اخبار کو مقبول بنانے کا ایک سیدھا طریقہ یہ ہے کہ پڑھنے والوں کے ایک مخصوص طبقے کی دلچسپی کا سامان بہم پہنچایا جائے اور یہ طبقہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو اسے مستقل خریداری کی ترغیب دی جائے۔ اگر ایک پڑھنے والے کو پکّا کر لو تو وہ یقیناً تمہارے لئے ایک آدھ پڑھنے والا اور فراہم کر دے گا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ عورتوں کا کونسا طبقہ سب سے جلد متاثر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کونسا طبقہ روزانہ انگریزی اخبار پڑھتا ہے۔ کالج کی لڑکیاں، عیسائی، اور اینگلو پاکستانی خواتین، ملازم پیشہ عورتیں اور افسروں کی بیگمات۔ غالباً تمہارے پڑھنے والوں میں یہی لوگ ہوں گے اور تم ان میں سے کسی کا بھی انتخاب کر سکتی ہو۔ اگر ان طبقوں میں سے کوئی مستقل لکھنے والی مل سکے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں اور پھر وہی کچھ بہم پہنچایا جا سکتا ہے۔

سردیوں کا موسم آچکا ہے۔ یہاں نہ پیڑ ہیں نہ پھول۔ اس لئے یہ موسم زرد رُو اور بے رنگ سا نظر آتا ہے۔ تمہارے آنے کے بارے میں یہ ہے کہ ملاقات کیسی بھی مختصر کیوں نہ ہو میرے لئے باعث مسرّت ہوگی۔ لیکن میں تمہاری بے آرامی اور تنگ دستی کے پیشِ نظر اس تمنّا کو دبائے رکھتا ہوں۔ جب بھی تمہیں یہ دقّت پیش نہ ہو ضرور آؤ۔

۲۸ نومبر ۱۹۵۱ء **(۱۷)**

یکایک تمہارے خط کچھ غائب سے ہو گئے ہیں۔ میرے گزشتہ تین خطوں میں سے ایک کی رسید بھی نہیں آئی۔

---

[1] ایک قلمی نام جو پاکستان ٹائمز کے صفحات پر ملتا تھا۔

سردیاں شروع ہو چکی ہیں اور اُجاڑ بے مقصد دن ہماری سرد اور گُنگ دیواروں پر اپنا حسن نچھاور کرتے ہوئے تیزی سے گزر رہے ہیں ان سے مجھے تمہارا اور تمہاری تنہائی کا خیال آتا ہے۔ کیونکہ میں اپنے زنداں میں غالباً اتنا اکیلا نہیں ہوں جتنی تم اپنی آزاد دُنیا میں ہو۔ دل تو یہاں بھی دُکھتا ہے لیکن میں اسے بہلانا بھی جانتا ہوں اور کبھی یہ زیادہ ہی تنگ کرنے لگے تو میں بالارادہ لمبی تان کر سو جاتا ہوں۔ جہاں خوابوں پر کوئی زنجیریں نہیں ہیں۔ لیکن اس کی ضرورت بہت کم پیش آتی ہے اِس لئے کہ اپنی گِرہ میں اُمید بھی بہت ہے، ایمان بھی بہت۔

کل رات ایک نئی[1] غزل مکمل ہوئی۔ کوئی ساڑھے دس بجے میں نے سب ساتھیوں کو سُننے کے لئے بستر سے اُٹھایا، اس کے معنی ہیں کہ آگ ابھی بجھی نہیں۔ اور یہ ہے تو کسی چیز کا کیا غم۔

مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے چیخوف کی کتاب بھیج دی۔ پڑھنے میں بہت لُطف آ رہا ہے۔ چیخوف کی تحریر سے کتنا گہرا پیار اور کتنی بے پناہ شفقت ٹپکتی ہے۔ اس کے ڈرامے اِتنے سُبک ہیں کہ انہیں ٹریجیڈی نہیں کہہ سکتے اور رنج و ملال سے اس کی لگن بھی ایسی ہی لطیف ہے۔ لیکن چیخوف کے ڈراموں کا بُنیادی زیور اُمید اور ہمدردی ہے جس سے اس کا ہر افسُردہ سین لبریز نظر آتا ہے۔

عدالت نے وکیل کی فیس کے بارے میں میری درخواست مُسترد کر دی ہے۔ ان کا جواب غالباً تم تک پہنچ چکا ہو گا۔ تم اس کا کچھ خیال نہ کرو اور انہیں کوئی تلخ جواب بھیجنے کے لالچ میں نہ آؤ۔ میرے خیال میں یوں ہی ٹھیک ہے۔ اِتنی ذرا سی بات کے لئے کوئی احسان اُٹھانا ضروری نہیں تھا۔ نوازش نے اِس بارے میں کوئی قصّہ نہیں کیا۔ جب تم آؤ گی تو اس کا طے کر لیں گے۔ چھیمی کا بہت پیارا لمباخط ملا اور میں نے میزو کے خفیہ اشاروں کا مطلب بھی سمجھ لیا۔ انہیں کہہ دو کہ میں جواب اس لئے نہیں بھیج رہا ہوں کہ چھیمی کی سالگرہ کے

---

[1] عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو۔

لئے ایک نظم اور کہانی لکھ رہا ہوں جو جلد بھجوا دوں گا۔

۱۴ دسمبر ۱۹۵۱ء (۱۸)

اب کے لکھنے میں پھر تاخیر ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ تمہارے جانے کے بعد ہم ایک نظم میں اُلجھ گئے تھے جو آج ہی ختم ہوئی ہے۔ شاعری کا دورہ کبھی کبھی پڑتا ہے اور جب پڑتا ہے تو ڈر لگتا ہے کہ اگر توجہ ذرا اِدھر اُدھر ہوئی تو یہ کیفیت کافور ہو جائے گی۔ یہ نظم[1] جو ابھی ہوئی ہے ایک طرح کا ترانہ ہے جو میں نے پہلے نہیں لکھا۔ شعر تو شائد اچھے نہیں ہیں لیکن نعرے بازی بُری نہیں ہے۔ اس خط کے لئے تمہیں بھی انتظار میں رکھا اور اس سے زیادہ یہ کہ چھیمی کی کہانی بھی رُکی رہی اور وقت پہ ختم نہ ہو سکی۔ کل اور آج کا سارا دن اس کا پیار ستاتا رہا، اس کو تحفہ بھیجنے میں دُکھ کی چبھن بھی شامل تھی۔ میں نے اطہر[2] سے کہا تھا کہ وہ کچھ خرید کر بھیج دیں۔ لیکن مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ لڑکیوں کے ملبوسات کے بارے میں اُن کا ذوق کیسا ہے۔ اگرچہ میں نے اس بارے میں اپنی حقیر معلومات اُنہیں بتا دی تھیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اُنہوں نے کیا بھیجا۔ خدا کرے کوئی بہت بدوضع چیز نہ ہو۔ اس بات سے تھوڑا سا رنج ہوا کہ میں اپنی بچّی کے لئے یہ تحفہ خود انتخاب نہ کر سکا۔ اِس لئے کہ محبّت سے کوئی چیز چُنی جائے اور بھیجی جائے تو اس کی اپنی ایک لذّت ہوتی ہے وہ اس خیال سے کہ شائد تحفے کے ساتھ وہ پیار بھی جو اس کے انتخاب میں صرف ہوا اپنے محبوب تک پہنچ سکے۔ خیر اس بات کو چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ کہ سالگرہ کیسے منائی گئی تاکہ میں دل ہی دل میں شریکِ محفل ہو سکوں۔ آج کل میں DAUDET کی کتاب سیفو پڑھ رہا ہوں۔ تم نے کبھی پڑھی ہے۔؟ بہت خوبصورت کتاب ہے۔ افسوس کہ جوانی کے دنوں میں نہیں پڑھی۔ اُس زمانے میں شائد دل پر زیادہ رقت طاری ہوتی۔

---

[1] دربارِ وطن میں جب اک دِن سَب جانے والے جائیں گے۔

[2] علی اطہر وکیل

خیر اب بھی پڑھنے میں کافی لُطف آیا۔ جیل خانے میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ تحیّر اور نزاکتِ احساس جو پختہ عُمر میں آدمی کھو بیٹھتا ہے دوبارہ لوٹ آتی ہے۔

آج ہمارے کیمپ میں ایک ہلکا سا ہنگامہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ ایک حکم کے مطابق ہمیں دوبارہ رات کو بند ہونے کی ہدایت جاری کی گئی تھی لیکن یہ حکم عمل دَرآمد سے پہلے ہی منسوخ کر دیا گیا۔ رات کو بند ہونے یا نہ ہونے میں جسمانی طور سے تو کچھ ایسا فرق نہیں پڑتا لیکن نفسیاتی اعتبار سے یہ فرق کافی اہم ہوتا ہے۔ خاص طور سے جَب راتیں اِتنی حسین ہوں جیسی کہ آج کل ہیں۔ کبھی کبھی جَب میں رات کو جلدی سو جاتا ہوں اور منھ اندھیرے آنکھ کھُل جاتی ہے تو صحنِ زنداں کے سکوت اور صبح کی دلکشی سے عجیب فرحت اور تسکین ملتی ہے۔ میں بار بار اس کی تکرار نہیں کرنا چاہتا کہ سفر کیسا ہی سُست رفتار کیوں نہ ہو منزل قریب ہے۔ اِس لئے جو دِن باقی ہیں اُن میں ہم جتنی بھی مُسکراہٹیں فراہم کر سکیں فراہم کر کے بقیہ دن گزار دیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایسا ہی کرو گی۔

۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء (۱۹)

تمہارے خوبصورت تحفے[۱] کا بہت شُکریہ۔ اس سے جیل میں کافی سنسنی پیدا ہوئی اور میرے ساتھیوں کو بہت رشک آیا۔ تمہارے دونوں خط مل گئے ہیں اور میں اَب بالکل خوش اور مطمئن ہوں۔ عدالت دو دِن پہلے ملتوی ہو گئی تھی اور اَب ہمیں دو تاریخ تک چھُٹّی ہے۔ مقدّمے کی پہلی گہما گہمی ختم ہو چکی ہے اور اَب ہم اس سلسلے میں ایسے بے تعلق محسوس کرتے ہیں کہ مقدّمے کے بارے میں کوئی کام یا محنت کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ بلکہ عروسِ سخن سے گاہے گاہے ملاقات کے علاوہ اور کسی چیز کو ہاتھ لگانے پر دل مائل نہیں ہوتا۔ ٹینی سن کی نظم لوٹس ایٹرز کا مفہوم اَب پہلے سے کہیں بہتر سمجھ میں آیا ہے۔ اگرچہ یہاں یہ کوئی کنول کے پھول یا گلِ لالہ نہیں ہیں لیکن اگر

---

[۱] ایلس اور فیض کو یاد نہیں کہ کیا تحفہ تھا۔

گردوپیش کی فضا بدل دی جائے تو ذہنی کیفیت کے سَبَب لوازمات وہی ہیں جو ٹینی سن نے بیان کئے ہیں یعنی کھلی ہوئی دھوپ میں روشن دِن محض ستاتے ہوئے گزر جاتے ہیں تختہ یا سمن پہ نہ سہی چارپائی یا آرام کرسی پر سہی اور راتوں کی لمبی خاموشی حسین خواب دیکھتے ہوئے طے ہو جاتی ہے۔ اس مکمّل ذہنی اور جسمانی سکون میں (سرِشام والی بال کے کھیل کے علاوہ) کبھی انتہائی خوبصورت خیالات، تصوّرات، موسیقی اور رنگ و بو کے ٹکڑے فضا میں لہراتے ہیں۔ لیکن انہیں اسیر کر کے فنّی کاوش سے حقیقت میں تبدیل کرنا محنت چاہتا ہے جو ہم کر نہیں پاتے اس لئے یہ سَبَ جیسے پاس سے چھو کر نکل جاتے ہیں جس کا افسوس ہوتا ہے۔

پھولوں کا ذکر آیا تو اَب ہم نے ایک چھوٹا سا باغ سجا لیا ہے اور ہمارے صحن کا ایک کونہ مختلف رنگوں سے دہک رہا ہے۔ یہاں گیندے کے پھُول ہیں۔ بسنتی، سُنہری اور ارغوانی، پھولوں کی بیلیں ہیں، گلابی کاسنی اور گیروے رنگ کی۔ کچھ گلاب کے پودے بھی ہم نے لگائے ہیں اگرچہ اِن میں ابھی پھُول نہیں آئے ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ چھیمی کو میرا تحفہ وقت پر مِل گیا لیکن اس سے تمہیں یہ فکر نہیں ہونی چاہیئے کہ ہم بہت مستعد ہو گئے ہیں بلکہ یہاں تو ہر روز کاہلی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اصل میں تم لوگوں سے پیار اتنا ہے کہ کبھی کبھی میری نالائقی شکست کھا جاتی ہے۔

تم نے جس اخبار کا ذکر کیا ہے وہ مجھے نہیں مِلا حسبِ معمول راستے میں کھو گیا ہو گا۔ خیر ایسی کوئی بات نہیں۔ آج کل دو ایک غنائیہ نظمیں شروع کر رکھی ہیں جو غالباً جلد ختم ہو جائینگی لیکن یہ شاعری ہے بہت بکواس۔ اس کی وجہ سے اور سَب کام رُکے رہتے ہیں جن میں تمہیں خط لکھنا بھی شامل ہے اور آخر کار جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ بیشتر اوقات اِتنا ناتسلّی بخش ہوتا ہے کہ اُسے رَدّی کی ٹوکری میں پھینکنا پڑتا ہے (اِسے BLOODY PERFECTIONISM کہتے ہیں) اور کبھی کوئی نتیجہ برآمد ہی نہیں ہوتا اور بہت سا قیمتی وقت مُفت میں ضائع جاتا ہے لیکن غالباً اس کا تو کوئی علاج نہیں۔

سردیوں کا موسم تو یہاں محض برائے نام ہے۔ صرف دن نکلنے سے پہلے تھوڑی سی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ تمہیں سن کر تعجب ہوگا کہ میں ابھی تک سرد پانی سے نہاتا ہوں (جو ایک دو کے علاوہ اور کوئی نہیں کرتا) اور اس کارنامے پر بہت خوش ہوں۔ میری صحت بہت اچھی ہے اور میرے رنج و راحت دونوں کی خوراک تم لوگوں کی یادیں ہیں جن کے لئے میں افتخار بھی محسوس کرتا ہوں اور تشکّر بھی۔

(۲۰)

۲ جنوری ۱۹۵۲ء

تمہیں اور تمہارے گھرانے کو نیا سال مبارک اور خدا کرے کہ یہ سال تمہاری مصیبتوں کے خاتمے کا دن جلد قریب لائے۔ آج تمہارے دو خط ملے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا گزشتہ خط تاخیر سے بھیجا گیا۔ غالباً اب تک پہنچ گیا ہوگا۔ اور نئے سال کا تار بھی۔ تمہارے ۲۳ تاریخ کے خط سے سب لوگ بہت محظوظ ہوئے۔ خاص طور سے فلم والے حصّے سے۔ شائد میں تمہیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ یہاں کے ہنگاموں میں ایک تو یہ فکر دامن گیر ہے کہ رہائی کے بعد ہم جیلخانے کا سا معیارِ زندگی کیسے قائم رکھ سکیں گے اور دوسرے یہ کہ اس بے وجہ شہرت کے مستحق کیونکر ٹھہریں گے جو ہمیں ملتی جا رہی ہے۔

چھٹیاں ختم ہوگئی ہیں اور عدالتی معمولات شروع ہو چکے ہیں۔ اپنے کو روز عدالت میں گھسیٹنا بہت ناگوار لگتا ہے۔ یہ سب تضیعِ اوقات قطعی ناقابلِ معافی ہے۔ خاص طور سے جب زندگی اتنی مختصر ہے اور کرنے کو اتنا کچھ رکھا ہے۔ انگریز ہمارے لئے جو قانونی نظام چھوڑ گئے ہیں اس کے بلاشبہ کچھ اچھے پہلو بھی ہیں بلکہ بہت سے اچھے پہلو ہیں۔ لیکن اس کی تھکا دینے والی اور لامتناہی رسومات پر (جن کا مقصد تو بے گناہوں کی حمایت ہے) وقت اور پیسے کا اس قدر بے دریغ اصراف ہوتا ہے کہ ایک عام انسان جس کا صبر اور پیسہ دونوں محدود ہوں ان کی تاب نہیں لا سکتا۔

اب تمہیں یہاں کا حال سنائیں۔ عدالت بند ہونے کے سبب پورا دن اور سارا وقت

اپنا تھا جب تک جی چاہے بستر پر پڑے رہو جو رئیسوں کی شان ہے۔ (اگرچہ میں نے اس سے زیادہ فائدہ نہیں اُٹھایا) دن کا آغاز ناشتے کے بعد بیڈمنٹن کی ایک تیز بازی سے ہوتا۔ اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے غسل (سُنتی ہو ٹھنڈے پانی سے) اس کے بعد ہم سب اپنے ہمسایوں کے ہاں کافی اور گپ شپ کے لئے جاتے ہیں، ان کی بارک "خانقاہ" کہلاتی ہے اس لئے وہاں بریگیڈیئر لطیف خان مقیم ہیں جنہیں ہمارے گروہ میں صوفی بزرگ کا مقام حاصل ہے۔ ہماری بارک "سرائے" کہلاتی ہے اس لئے کہ یہاں ہر وقت غل غپاڑہ رہتا ہے۔ کافی کے بعد سب دوپہر کے کھانے کے لئے ہماری بارک میں واپس آجاتے۔ کھانے کے بعد شطرنج کی ایک بازی اور اس کے بعد لوگ سونے یا غور و فکر کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد چائے اور کھیل۔ کھیل کے فوراً بعد میرے دیوان خانے میں شبانہ محفل جمتی ہے (آج کل میں محفل کو شیکسپیئر پڑھ کے سُناتا ہوں) پھر کھانے کی گھنٹی بجتی اور کھانے کے بعد لوگ ریڈیو سُنتے یا گپ کرتے ہیں۔

کرسمس کے دن بیگم جنجوعہ[1] نے ایک بڑا سا کرسمس کیک کچھ غبارے اور جھنڈیاں بھیج دیں اور میں نے چپکے سے پُر تکلف کھانے کا آرڈر دے دیا۔ (جیل خانے میں آرڈر دینا شاید تمہیں عجیب لگتا ہو لیکن یہاں تو ایسا ہی ہے) شام کے لئے مشاعرہ پہلے سے طے تھا۔ ایک کوٹھری خاص طور سے مزین کی گئی اور جناب محترم جنرل نذیر صاحب کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ بالکل سچ مچ کا مشاعرہ معلوم ہوتا تھا۔ کل نئے سال کی تہنیت کا ایک بہت ہی محبت بھرا خط بنے کی بیگم سے وصول ہوا، جسے پڑھ کر دل بھر آیا۔ اس دنیا میں بہت سی بدی کے باوجود اتنی نیکی اپنے حصے میں آئی ہے کہ اس کا حق ہم کبھی ادا نہیں کر سکتے۔

(۲۱)

۱۵ جنوری ۱۹۵۲ء

آج بہت ہی خوبصورت، چمکیلا، ہوا دار دن ہے۔ ہوائیں نہ گرد ہے نہ تیزی۔ خنک

---

[1] جیل کے ساتھی ایئر کموڈور جنجوعہ کی بیگم۔

ملائم اور دھوپ میں گھلا ہوا دن، جیسے لاہور میں اکتوبر کے آخیر یا مارچ کے شروع کے دن ہوتے ہیں۔ دوپہر کے تین بج رہے ہیں اور میں نے نہ منھ دھویا ہے نہ حجامت بنائی ہے۔ کھانے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے بستر سے اُٹھا تھا اور اب پھر دراز ہوں۔ خدا کرے یہ خط سہ پہر کا کھیل شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جائے۔ ورنہ رات گئے تک لکھنا نہیں ملے گا اور مجھ سے رات میں بالکل لکھا نہیں جاتا۔ نہ جانے کیوں؟ میری کوٹھری کی سلاخوں پر دھوپ اور ہوا کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے، گداز نیلے آسمان کا ایک کونہ میرے دریچے کی چوکھٹ میں پردے کی طرح سجا ہوا ہے۔ دُور کہیں ریڈیو بج رہا ہے اور کسی فلمی گانے کے ٹکڑے کبھی کبھی میرے کمرے تک پہنچتے ہیں۔ ان میں ہمارے ساتھیوں کے قہقہوں کی آواز بھی شامل ہے۔ یہ لوگ باہر دھوپ میں ڈرافٹ کھیل رہے ہیں۔ ایسی شانت اور خوبصورت فضا ہے کہ بہ یک وقت ہنسنے کو بھی دل چاہتا ہے اور رونے کو بھی۔ آج میں بستر سے اس لئے نہیں نکلا کہ ایک ناول جو شروع کر رکھا ہے ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا نام ہے۔

THE DIPLOMAT مصنف JAMES ALDRIDGE ہیں اور BODLEY HEAD نے شائع کی ہے۔ میں نے بہت زمانے سے ایسی اچھی کتاب نہیں پڑھی۔ تم بھی کہیں سے حاصل کرنے کی کوشش کرو تاکہ جو لطف مجھے ملا ہے اس میں شریک ہو سکو۔ ناول کا موضوع تو ایران میں برطانوی ریشہ دوانیاں ہے لیکن اس کی خوبی موضوع کی وجہ سے نہیں ہے۔ خوبی اس اخلاقی اور جذباتی کشمکش کے بیان میں ہے جو عالمگیر قوتیں ایک فرد کی ذات پر نازل کرتی ہیں اور اس بارے میں کہ یہ اکیلی جان اس کشمکش کی صلیب سے کیسے عہدہ برا ہوتی ہے۔ ایک طریقے سے اس میں اس بے چارگی اور مایوسی کا جواب ملتا ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ یہ احساس ہمیں اس لئے گھیرے رہتا ہے کہ انسانی مسرت کی جدوجہد بظاہر اتنی طویل اتنی گراں اور اتنی دائمی معلوم ہوتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ایک فرد کی ذات بالکل ہیچ اور نزار دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ جبھی ہوتا ہے اگر تم اس جدوجہد کو ایک فرد کی نظر سے دیکھو بلکہ یہ کیفیت پیدا

ہی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم اِنسانی رنج و ناخوشی کے مسئلے کو ذاتی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اِن مسائل کو انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھنا حماقت ہے اس لئے کہ اِنسانی رنج و راحت ہمارا تمہارا ذاتی یا انفرادی مسئلہ نہیں ہے۔ جیسے کسی شخص سے عاشقی یا اپنے بچّے کی علالت ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ اگر یوں نہیں ہے تو اسے دیکھنے کا ایک ہی صحیح طریقہ ہے۔ اور وہ اجتماعی نقطۂ نظر ہے۔ اگر اس نظر سے دیکھو تو یہی جد و جہد شجاعانہ، بامقصد اور اُمید افزا نظر آتی ہے۔ اِس طور سے مسائل پر نگاہ ڈالنا مُشکل اس لئے ہوتا ہے کہ ہم لوگ اپنی خود پسندی کی وجہ سے کبھی پوری طرح اقرار نہیں کرتے کہ ہماری ذات قطعی غیر اہم ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اِنسانی رنج اور ناخوشی کی بُنیاد دراصل یہی خوُد پسندی ہے یعنی اپنی ذات سے بہت زیادہ اہمیت وابستہ کرنا۔ افسردگی، بددلی اور خود ترحّمی کے احساسات کی تہہ میں بھی یہی گِلہ کار فرما ہوتا ہے کہ ساری کائنات ہماری ذاتی تمناؤں کے مطابق کیوں تشکیل نہیں دی گئی۔ دراصل ہمارے تمہارے جیسے لوگ جن کی شخصیتیں بالکل مکمّل اور مربوط نہیں ہیں اپنی ذات کو اس ذات کی حدود سے پرے زیادہ بڑی چیزوں سے یک جان نہیں کرسکتے جس کے نتیجے میں ناخوشی اور شکست کا احساس لازمی ہے۔ اس امر میں شائد میں تم سے زیادہ قصوروار ہوں۔ لیکن یہ بھی ایک قسم کی خود پسندی ہے مگر شائد مختلف اور زیادہ گھٹیا قسم کی۔

پچھلے تین دنوں میں تمہارے تین خط ملے جس کے لئے شُکر گزار ہوں اور اپنی سہل انگاری پر نادم۔ خط لکھنے کو جی تو ہر روز چاہتا ہے لیکن کبھی کبھی کئی دن تک کاغذ اور قلم یک جا کرنے کی توفیق نہیں ہوتی ہے اس کا سبب بیان کرنا مشکل ہے۔ جیل خانے کی زندگی روزمرّہ کے معمولات میں طرح طرح کی ذہنی اور جسمانی رکاوٹیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ جن کا شعوری تجزیہ ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر نیو اسٹیٹسمین کا ایک شمارہ کوئی چھ ہفتے سے میرے تکیئے کے پاس پڑھنے کے انتظار میں رکھا ہے۔ اس کے بعد دو شمارے اور آچکے ہیں۔ جنھیں میں نے کھولا بھی نہیں اس لئے کہ میں پہلے والا شمارہ ختم کرنے کے بعد انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ رسالہ ہر رات بہت

خشمگیں آنکھوں سے مجھے گھورتا رہتا ہے لیکن کسی وجہ سے اسے اُٹھا کر دیکھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ اگرچہ میں اس دَوران میں اور بہت سی چیزیں پڑھ چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ محض حماقت ہے اَور بات اصل میں کچھ نہیں لیکن کچھ بَن ہی نہیں پڑتا، تو اگر تمہیں اور مصیبتوں کے علاوہ میرے خطوں کے اِنتظار کی صعوبت بھی اُٹھانی پڑے تو معذرت خواہ ہوں۔ اس کی وجہ محبت یا یاد کی کمی نہیں ہے۔

لکھنے میں تاخیر کی وجہ سے پھر بہت سی باتیں جمع ہو گئی ہیں۔ مثلاً تمہارے گاؤں کا سفر، اسے پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ہم سَب پاکِستان میں رہتے ہوئے پاکستان سے اِتنے دُور رہتے ہیں کہ کبھی کبھی اس کے صحیح خدوخال پر نگاہ ڈالنا بہُت اچھا لگتا ہے۔ تمہارے سفر کا حال پڑھ کر مجھے اپنے بچپن کے دِن بہت یاد آئے۔ افسوس کی بات ہے کہ ہم لوگوں نے گاؤں سے اپنے رشتے کاٹ دیے ہیں (اگرچہ اس لاوارث اور آوارہ زندگی میں کچھ فوائد بھی ہیں)۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار بہت زمانہ ہوا میں نے تم سے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا تھا کہ کسی صورت میں دوبارہ اِن ہی دہقانوں میں لوٹ جاؤں جن کی صفوں سے نکل کر ہم لوگ شہر میں آ بسے تھے۔ اور ایک بار پھر جنم داتا دھرتی کے زندگی بخش سینے کو اپنے قریب محسوس کر سکوں۔ یہ طفلانہ تمنّا اَب بھی دِل میں موجود ہے۔ ان بہُت سی بھولی بسری اور ناآسودہ تمنّاؤں کے گردوغبار میں لپٹی ہوئی جن کے بارے میں دِل جانتا ہے کہ کبھی پوری نہ ہو سکیں گی۔

تین نظمیں لکھنے کے بعد دماغ تھک سا گیا ہے لیکن مجھے اُمید ہے کہ تھوڑے دنوں کے بعد پھر ادھر رجوع کر سکوں گا۔ امروز والوں نے گزشتہ اتوار کے پرچے میں دو فاش غلطیاں کیں جن سے مضمون بالکل بے معنی ہو گیا ہے۔ احسانؔ کا نسخہ مل گیا ہے بہُت اچھا ہے۔ ان کا میری طرف سے شکریہ ادا کر دینا۔

ؔ روزنامہ احسان لاہور۔

مجھے افسوس ہے کہ یہ مینا والا قصہ تمہیں اب تک پریشان کر رہا ہے۔ یہ قصے جیسے شروع ہوتے ہیں ویسے ہی ختم بھی ہو جاتے ہیں اور ان پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیئے۔ خواہ وہ کیسے ہی ناگوار کیوں نہ ہوں۔ یہاں سے میں تمہاری تسلی کے لیے کیا کر سکتا ہوں سوائے یہ کہنے کے کہ بالآخر اپنی تسکین کا سرچشمہ اپنی ہی نیکی اور اچھائی ہوتی ہے جس کا وجود اس زمانے تک برحق ہے جب تک دنیا میں نیکی اور اچھائی کا وجود باقی ہے اور دنیا میں یہ ضرور باقی ہے۔ اسی سبب سے سارے زمانے کی دشمنی کے باوجود بہت سے لوگ دوستی کرنے کے لیے بھی مل جاتے ہیں اور ہر معرکے میں آخر کار جیت نیکی اور دوستی ہی کی ہوتی ہے۔

(۲۲)

۲۲ جنوری ۱۹۵۲ء

تمہارے دو خط ملے۔ میں تصور کر سکتا ہوں کہ ان دنوں لاہور کا کیا رنگ ہوگا۔ یہاں کے موسم میں جو تھوڑی بہت کاٹ تھی وہ بھی ختم ہو چکی اور اب بالکل بے جان اور بے کیف سماں ہے۔ شام میں کافی دیر تک حرارت رہتی ہے اور سردی کا مشکل ہی سے کبھی احساس ہوتا ہے۔ دن لمبے ہوتے جا رہے ہیں اور راتیں اب ایسی عیاشی کا سامان نہیں جو پہلے تھیں۔ ہر چیز اتنی بے رنگ اور انجان نظر آتی ہے کہ دماغ میں لکھنے کے لیے کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔ ایک دو نظمیں آدھی لکھی رکھی ہیں جنہیں ختم کرنے کو بہت شدت سے جی چاہتا ہے لیکن دماغ کام ہی نہیں کرتا۔ دوبارہ انتظار میں ہوں کہ عروس سخن لوٹ آئے۔ فرانسیسی پڑھنے سے بھی اکتاہٹ کا عالم ہے اور شطرنج سے بھی۔ اگر تھوڑا بہت شوق کسی کام میں باقی ہے تو وہ ڈیک ٹینس ہے یا والی بال۔ اب میں یہاں کے اوّل درجے کے کھلاڑیوں میں ہوں۔ اور اس بات سے کچھ اطمینان ہوتا ہے کہ چالیس برس کے باوجود بدن زیادہ کھینچنے یا کڑکڑانے کے بغیر اب بھی تیزی سے بھاگ دوڑ سکتا ہے اگرچہ وہ پہلی سی بات نہ سہی۔ یہ عمر کا احساس بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔ ہم سب پر عمر کا غلبہ ایسے سہج سہج ہوتا ہے کہ کبھی مشکل ہی سے ذہن میں آتا ہے کہ ہم بیس برس پہلے سے بہت زیادہ مختلف ہو گئے ہیں۔ اپنا نقشہ جو اپنے ذہن میں ہوتا ہے وقت کے ساتھ اتنا کم

بدلتا ہے کہ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ باقی دُنیا کے لئے بھی یہ نقشہ ویسا ہی برقرار ہے' یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ عمر نے بدن کے ہر نقش پر خرابی اور زوال کی کتنی لکیریں کھینچ دی ہیں۔ اسی خود فراموشی کی وجہ سے جب بڑے بوڑھے نوجوانوں کی سی چہلیں کرتے ہیں تو بالکل اُلّو نظر آتے ہیں۔ انہیں اپنے آپ میں وہ تغیر بالکل دکھائی نہیں دیتا جو باقی سب کی نظروں پر عیاں ہوتا ہے۔ کل جب میں نئی اچکن پہن کر ناشتے پہ پہنچا (جیل خانے کی ناجائز کمائی سے فضول خرچی کر کے میں نے اس خیال سے ایک عمدہ گرم اچکن بنوالی ہے کہ نہ جانے جیل خانے سے باہر اس کے لئے دام میسّر آئیں یا نہ آئیں) تو کسی نے کہا آپ جوانی میں واقعی خوبصورت ہوں گے۔ اگر ایک برس پہلے یہی بات کوئی کہتا تو ہم جواب دیتے کیا بکتے ہو ہم اب بھی جوان ہیں۔ لیکن کل یہ بات سُنی تو ہم صرف مُسکرا دیئے اور اسی بات پر دل خوش ہو گیا کہ کسی نے ہماری جوانی کی تعریف تو کی جو اگرچہ رُخصت ہو چکی ہے لیکن ہے تو اپنی ہی۔

تمہارا مضمون دیکھ لیا ہے۔ کافی اچھا ہے لیکن تمہارا ریل گاڑی والا مضمون بہتر تھا۔ وہ انداز تمہارے مزاج کے زیادہ مطابق ہے۔ طنزیہ تحریر میں ایک بات کی احتیاط لازم ہے اور وہ یہ کہ تلخی یا حقارت ظرافت یا مزاح پہ غالب نہ آجائے ورنہ تحریر میں بدمزاجی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ صرف بہت بڑے ادیبوں کا حصّہ ہے کہ ان کی تحریر بدمزاجی کے باوجود قبولِ خاطر بھی ہو۔ مریم کے مضامین کا سلسلہ مُفید ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسے بالکل منفی اور بے رنگ نہ بننے دیں۔ لکھنے میں حقیقت بیانی اور غیر جانب داری ضروری ہے لیکن ذہنی راہنمائی اور مقصدیت بھی اتنی ہی لازمی ہے۔ میری طرف سے حیدر[1] اور مظہر[2] سے کہنا کہ اخبار کے میک اپ پر ذرا زیادہ توجہ دیں۔ غالباً انہیں ہیڈنگ ٹائپ کے بارے میں دوبارہ دقتیں پیش آرہی ہوں گی۔ ہمارے جیتھڑے کا حُلیہ بگڑ گیا تو مجھے بہت افسوس ہو گا۔

---

[1] کمال حیدر، نیوز ایڈیٹر پاکستان ٹائمز۔ [2] مظہر علی خاں ایڈیٹر پاکستان ٹائمز

یہاں کوئی خاص قابلِ ذکر خبر نہیں ہے۔ حالات ویسے ہی ہیں جیسے متوقع تھے۔ یہ کہنا بہت مُشکل ہے کہ مقدمے کی کارروائی کب ختم ہوگی۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ جو میں نے تمہارے ساتھ سردیاں گزارنے کا وعدہ کیا تھا پُورا نہیں ہو سکا۔ خیر اَب یہ مُلاقات مہربانی سے بہار کے موسم تک اُٹھا رکھو۔ اپنی شہرت یہی ہے کہ ہر کام تاخیر سے کرتے ہیں اس لئے یہ تاخیر بھی اسی حساب میں لکھ لو۔ سچّائی اور انصاف کی جیت تو آخر کار مقدّر ہے اور اسی پر تکیہ کرنا چاہیئے۔ اُمید افزا افواہوں پہ بھروسہ فضول ہے لیکن ان سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے اور لوگ کیا چاہتے ہیں۔ اپنے ضمیر کے علاوہ نیکی اور بُرائی کی کوئی عدالت عالیہ ہے تو وہ یہی رائے عامّہ ہی تو ہے۔ جنوری کا مہینہ خاتمے کے قریب ہے اور مجھے اُمید ہے کہ شاید اگلے مہینے تم اس صحرا کا ایک سفر اور کر سکو۔ اگر تمہارے بجٹ میں گنجائش ہو تو بچّوں کو ساتھ لے آؤ۔ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ نہ ہو سکے تو کوئی بات نہیں۔ اَب شاید ہم سَب کے مل بیٹھنے میں بہت زمانہ باقی نہیں ہے۔ دن بہت آہستہ آہستہ گزُر رہے ہیں اور ہر گزُرنے والا دن دل کی سطح پر کراہت اور درد کا ایک ہلکا سا غبار چھوڑ جاتا ہے لیکن چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز۔ اور یہ چند روز کتنے ہی طویل کیوں نہ ہوں آخر چند ہی روز ہیں۔

(۲۳)

۲ فروری ۱۹۵۲ء

ایک مہینہ اور بیت گیا۔ موسم پھر بدل گیا ہے۔ اَبر آلود ہوا بُرد، اور کچھ ویران سا موسم ہے۔ دوپہر کا سورج پریشان، گرد آلود اور بے حقیقت سا نظر آتا ہے۔ اس طرح کا موسم جَب ہر چیز غیر حقیقی اور دُور دراز معلوم ہوتی ہے اور ایسے لگتا ہے جیسے ہم خواب میں چل رہے ہیں۔ ویران جذباتی قسم کا موسم جو اِتنا خوبصورت کہ نہیں کہ دِل میں کوئی ہلچل پیدا ہو۔ ہم اکثر ان پھولوں کا ذکر کرتے ہیں جو اب لاہور کے لارنس گارڈن میں کِھل رہے ہوں گے اور اُن شفق آلود شاموں کا جو لاہور کے آسمان پر بکھر رہی ہوں گی۔ اب تھوڑے ہی دنوں میں وہاں لیمو اور رنگترے کے شگوفے کِھلنے لگیں گے۔ اور ان کی تیز اور بوجھل خوشبو ہوا میں بِکھر جائے گی۔ وہ خُوشبو جسے ہم بچپن سے خوشبوئے بہار تصوّر کرتے آئے ہیں۔ یہ سَب کچھ ہم کبھی کبھی دوبارہ دیکھیں گے

تھوڑا سا انتظار اور سہی ..... صاحب کے بارے میں تمہاری کہانی سے کافی لطف آیا۔ خوشی کی بات ہے کہ اُن کی سہیلیوں کا جھرمٹ بدستور باقی ہے اور تم ان میں سے ایک سے مل بھی چکی ہو۔ میری نظر میں یہ عورتیں دُنیا کی بہترین مخلوق میں سے ہیں۔ محبتّی، فراخدل اور بہت خوش مزاج۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے رسمی اخلاق کا معیار کتنا ناقص ہے اس لئے کہ ہم شخصی اخلاق کو صرف ایک ہی ناقابلِ ذکر پیمانے سے ناپنا جانتے ہیں۔ اس سے خیال آیا کہ ہمارے یہاں ایک نوجوان نے کنزے رپورٹ منگوائی ہے جو میں آج کل پڑھ رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب بہت ہی عمدہ کارنامہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کسی طریقے سے یہ کتاب یہاں سب خواتین وحضرات کو پڑھوائی جائے۔ اس کے مطالعے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ صوفی سے کہو کہ اپنی تازہ چیزوں کی نقل ہمیں بھجوادیں، ہمارے سپاہی دوست سخت شاعر مزاج ہوتے جا رہے ہیں۔

اگر تجھے مارچ کے مہینے میں زیادہ سہولت سے آسکتے ہیں تو جب تک انتظار کر لو۔ یہاں رہائش کے بارے میں تشویش کی ضرورت نہیں۔ جیسا انتظام تم چاہوگی، ہو جائے گا مجھے اُمید ہے کہ اخبار کے بارے میں میری نکتہ چینی پر میرے رفیق کار رنجیدہ نہیں ہوئے ہوں گے۔ اخبار کی صورت پھر بہتر ہوتی جارہی ہے اور غالباً گزشتہ دنوں کوئی محض وقتی خرابی پیدا ہوگئی ہوگی۔ ہاں تمہارا ریڈیو کالم کون لکھتا ہے؟ کافی معقول شخص معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے شاید ہی کبھی ریڈیو سُنا ہو۔ اس لئے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہماری نشریات کتنی بوچ ھیں۔ یونہی سا گمان تھا کہ ان کا معیار کافی گھٹیا ہے لیکن اب پتہ چلا کہ یہ گھٹیا پن میرے تصوّر سے کہیں زیادہ گھٹیا ہے۔ اپنے ریڈیو کے نقّاد سے کہنا کہ نشر کردہ خبروں پر ذرا توجہ دیں اور ان پر تفصیل سے تنقید کریں۔ میں نے ایسی بکواس آج تک نہیں سُنی۔ خبروں کے ہر نشریے میں ہر روز تین چوتھائی حصّہ اس بات کی نذر ہو جاتا ہے کہ فلاں وزیر صاحب نے فلاں اعلان کیا یا فلاں انکشاف کیا جو اعلان اور انکشاف وہ سو بار پہلے بھی کر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خبروں کے شعبے کو خبروں اور سیاسی اعلانات میں فرق ہی نہیں معلوم۔

تم نے کرس کے ہاں سالگرہ پارٹی کا حال نہیں لکھا۔ ہمارا ایک عشق گزیدہ نوجوان تفصیلات کے لئے بے قرار ہے اور کچھ لکھنے کو نہیں ہے سوائے اس دلی تمنا کے کہ تمہاری مصیبتوں

کے خلاصے میں زیادہ تاخیر نہ ہو۔

۶ فروری ۱۹۵۲ء **(۲۴)**

کل رات پانی برسا اور آج صبح ایک شفاف دُھلی ہُوئی نومولود دُنیا کا سا سماں ہے جسے دیکھ کر دل کو فرحت ہوتی ہے۔ آج من کی کیفیت بہتر ہے اور شائد جلد ہی کچھ لکھا جا سکے۔ دردِ زہ کے ہلکے سے آثار محسوس ہو رہے ہیں۔ تمہاری خاطر جی چاہتا ہے کہ ہم زیادہ قابل بن جائیں، زیادہ لکھیں اور اپنے فرائض پر زیادہ توجہ دیں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ جیل خانہ اصلاحِ نفس کی جگہ نہیں ہے۔ خاص طور سے جب اس مقدمے کا لامتناہی سلسلہ، بیوی بچوں کا فکر، خاندانی جھگڑے اور ایسے اور دُنیاوی قصے باہر کی زندگی سے بھی زیادہ ذہن پر سوار ہوں۔ جیل خانے میں ان باتوں سے ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے لئے اظہار اور تکمیل کے بیشتر راستے مسدود ہوتے ہیں۔ بہرحال صورتِ احوال جو ہے سو ہے اس لئے شکایتیں بیکار۔ میں اِن باتوں کو زیادہ دل سے نہیں لگاتا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھار چوک ہو ہی جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں یہ عیاشی بھی میسّر نہیں۔ اس لئے کہ تمہاری آزمائش مجھ سے زیادہ سخت ہے لیکن شائد وہ دِن زیادہ دُور نہیں جب میں تمہارے کاندھوں سے یہ صلیب ہٹا سکوں اور تم آرام کر سکو۔ یہاں کوئی نئی خبر نہیں ہے اور جیل خانے کا نیا پن ختم ہو جانے کے بعد اب زندگی بالکل ساکت ہو چلی ہے، عمل کے ذرائع اتنے محدود ہیں کہ کوئی نئی بات عجوبہ واقعہ ایجاد ہی نہیں کر سکتے۔ لامحالہ اپنی شخصیت اور اپنے ذہن کے ذخائر پر تکیہ کرنا پڑتا ہے اور اس خود بینی کی وجہ سے ایک ناقابلِ برداشت بور بن جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔

۱۷ فروری ۱۹۵۲ء **(۲۵)**

جیسا کہ تم تصوّر کر سکتی ہو ہم سب ملک معظم مرحوم کے ماتم میں مصروف ہیں۔ (GOD SHAVE THE QUEEN) نہ جانے تم نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کا کراچی کا ایڈیشن دیکھا ہے یا نہیں۔ بالکل لوٹ پوٹ کر دینے والی چیز ہے۔ بہت لبھانے والے انداز میں لکھا ہے کہ ملک معظم کی وفات پاکستان کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے اور ساری قوم غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی

ہے۔ یہاں بعض ساتھیوں نے کہا کہ پاکستان ٹائمز میں بھی ایسی ہی خرافات چھپے گی جس پر ہم نے شرط بدی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ شکر ہے کہ تم لوگوں نے میری لاج رکھ لی مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میرے خط غیر تسلّی بخش معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی اصلاح کی کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے خیال نہیں تھا کہ کوئی ضروری بات ایسی رہ گئی ہے جس کا میں نے جواب نہیں دیا۔ اگر کبھی ایسا ہو تو مجھے یاد دلادیا کرو۔ یہاں کبھی کبھی ایسے برُے دن بھی آتے ہیں جب دماغ پر یکایک کاہلی اور بے حسی کا دورہ پڑتا ہے۔ گزشتہ دنوں کچھ ایسی ہی کیفیت تھی لیکن اب گزر چکی ہے، اور اب تم ہمارا برتاؤ بہتر پاؤ گی۔ ہم نے فرانسیسی بھی دوبارہ شروع کردی ہے۔ اِس زبان کے مبادیات ذہن نشین ہوگئے ہیں اور میں خود مطالعہ جاری رکھ سکتا ہوں۔ اب تمہارے سوالات کے جواب لکھتا ہوں۔

(۱) ڈاک بنگلے میں اکیلے کمرے کا کرایہ تین روپے اور ڈبل کمرے کا کرایہ پانچ روپے روزانہ ہے۔ عام طور سے یہاں جگہ مل جاتی ہے لیکن اگر تم اپنی تاریخ کا اندازہ بتادو تو کمرہ پہلے سے محفوظ کرایا جاسکتا ہے۔

(۲) ان کمروں کے ساتھ الگ باورچی خانے کا انتظام نہیں ہے اس لئے کھانے پینے کا معاملہ گڑبڑ ہے۔ لیکن تمہارے آنے پر نوازش یا بیگم جنجوعہ کچھ انتظام کردیں گی (اب انہوں نے اپنا باورچی رکھ لیا ہے)۔

(۳) نوازش کی فیس کا معاملہ ابھی طے نہیں ہوا ہے لیکن مہینہ ختم ہونے سے پہلے کچھ ادائیگی کرنی پڑے گی بشرطیکہ ہمارے سرکار اپنا وعدہ ایفا کریں۔

(۴) چند روز ادر کا اقرار اب بھی قائم ہے۔

(۵) اگر تم اپنے گھر والوں سے وہ رقم منگوالو جس کا وعدہ ہوا ہے تو اچھی بات ہے اس لئے کہ اگر کوئی غیر متوقع دقت پیش آئی تو سہولت رہے گی لیکن یہ بات اپنے تک رکھو۔

بالی کی امّاں کا سُن کر رنج ہوا۔ لیکن تم نے یہ نہیں لکھا کہ انہیں تکلیف کیا ہے

۱؎ فیضؔ کی سوتیلی بہن۔ پورا نام سلمیٰ اقبال

اور مرض کتنا خطرناک ہے۔ اُمید ہے کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائیں گی اور بابی کو دوبارہ تمہارے پاس بھیج سکیں گی۔ اگر اس میں زیادہ دیر ہو تو کیا تم کسی غریب طالبہ کو گھر نہیں رکھ سکتیں؟ تمہاری اس چہیتی لڑکی[1] کا کیا ہوا جس کا شاہین یا ایسا ہی کچھ نام تھا؟

تمہارا کھراج والا قصّہ بہت دل خوش کُن ہے اگرچہ مجھے اس کے کسی ایک لفظ کا اعتبار نہیں۔ اسے سُن کر یہاں کے نوجوان ساتھی جو ہمیشہ اپنی فتوحات کی ڈینگیں مارتے رہتے ہیں بہت جلے۔

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ فلم ریویو لکھنے کی وجہ سے تمہاری کچھ تفریح ہو جاتی ہے لیکن لکھنے کی مشقت میں بھی اضافہ ہو گیا ہو گا۔ یہاں مجھے صرف ایک ہی مستقل تشویش در پیش رہتی ہے (اور صرف اسی ایک بات پر جُرم کا احساس ہوتا ہے) کہ یہ سارا بوجھ جو تمہارے کندھوں پہ آ پڑا ہے تمہاری برداشت سے باہر نہ ہو جائے۔ اگرچہ تمہاری قوتِ برداشت پر دل بہت نازاں ہے۔ شاید میں نے لکھا تھا کہ اپنی شخصیت کی گہرائیوں کا کم از کم ایک بار امتحان ضرور ہونا چاہیے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ وہاں کیا ہے کیا نہیں ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ایسے ہوں گے جنھیں کبھی نہ کبھی یہ امتحان پیش نہ آئے۔ اگرچہ بیشتر لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی باری کبھی نہیں آئے گی۔

اگر اس قصّے کا خاتمہ بالخیر ہوا اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہو گا تو سارے دُکھ درد کے باوجود یہ سودا سُود مند ثابت ہو گا۔ اس کا موذی اور غیر اخلاقی پہلو صرف ایک ہے اور وہ ہے بیش قیمت وقت کا مجرمانہ زیاں۔ عُمر کے غلط حصّے کا ایک پورا سال ختم ہو چکا ہے اور بہت تھوڑے وقت میں جو بہت کچھ کرنے کو ہے اس میں سے کوئی بھی کام پورا نہیں ہو سکا۔ بدقسمتی سے جیل خانے کی نفسیاتی اُلجھنیں اس کی اجازت نہیں دیتیں کہ اس جبری فراغت سے کوئی مُفید کام نکل سکے اگرچہ اس کا احساس اور اس کی تمنّا دل میں مُستقل رہتی ہے۔ بہرصورت جیسے تمہارے ابا نے لکھا ہے۔

---

[1] ایک مہاجر لڑکی جو اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتی تھی۔

JOHN BULL CAN TAKE IT. اس لئے حوصلہ بلند رکھو۔

ہمارے پچھواڑے کے صحن میں سرسوں کی کچھ شاخیں پھوٹ نکلی ہیں اور گیہوں کے نازک پودوں میں بالیاں آنے لگی ہیں۔ اپنی لمبی صبحوں میں ہم بہار کی ان علامتوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور ان کے رنگ و خوشبو سے زندگی خوش آئند معلوم ہونے لگتی ہے۔ جیل خانے کی زندگی ہی سہی۔

(۲۶)

۲۲ فروری ۱۹۵۲ء

تمہارا خط دیکھے ہوئے یوں لگتا ہے کہ بہت زمانہ گزر چکا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم خیریت سے ہوگی اور یہ خاموشی محض اُس سودے بازی کی وجہ سے ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ چھیمی اور مریم[۱] کو غالباً میرے خط مل چکے ہوں گے۔ گزشتہ ہفتے آپا[۲] یہاں آئی تھیں اور کھانے کی بہت سی مزے کی چیزیں لائی تھیں جن کی سب نے مناسب تعریف کی۔ لکھنؤ سے رضیہ[۳] کا ایک بہت اچھا خط آیا تھا اور لندن سے مارس جونز[۴] کا۔ مارس کے خط سے معلوم ہوا کہ اس کی حسین بیوی اسے چھوڑ گئی ہے اور وہ قاہرہ میں دل بہلا رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ارادہ ہو تو ہر چیز کا کوئی نہ کوئی بدل مل ہی جاتا ہے۔

تم نے میرے گزشتہ خط کی رسید نہیں بھیجی یہ خط لکھنے کے بعد مجھے افسوس ہوا کہ میں نے کسی کے مرنے کے بارے میں کچھ نازیبا باتیں لکھی تھیں۔ اس بارے میں تم نے گزشتہ خط میں صحیح ملامت کی تھی۔ بے خیالی، تعصب یا کسی اور وجہ سے دل دکھانا بہت آسان ہے لیکن اپنے دل میں اتنی جامع شفقت پیدا کرنا بہت مشکل ہے کہ انسان اپنے دکھوں کے ساتھ باقی ہر کسی کے دُکھ کا احاطہ کر سکے۔ خیر، کوشش شرط ہے۔

تم کب آؤ گی؟ اسیری کے دن مختلف دائروں میں دھیرے دھیرے گردش کرتے ہیں۔ کبھی سکون، کبھی بے حسی، کبھی اکتاہٹ، کبھی درد اور ہر دائرے کی گردش کے بعد شدت سے

۱۔ ڈاکٹر تاثیر کی بیٹی۔ شادی کے بعد بیگم جمیل حسن ۲۔ فیض کی بڑی بہن بیگم عبدالحمید

۳۔ رضیہ سجاد ظہیر۔ ۴۔ فوج میں رفیقِ کار، اب ڈرہم یونیورسٹی میں سیاسیات کے اُستاد

انتظار پیدا ہوتا ہے کہ اب کوئی آئے یا کوئی نئی بات وارد ہو اس لئے جلدی لکھو کہ تم کب آؤگی تاکہ میں اپنا انتظار کسی خاص دن سے وابستہ کر سکوں۔ آتی دفعہ اپنے ساتھ ایک دو میز پوش اور عربی کتابیں لیتے آنا بسنتس بری کی تاریخ تنقید پہلی جلد لاتف ڈیورنگ دی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تین جلدیں اور MYER کا ناول[1] جو ایک جلد میں ہے۔ یہ سب کتابیں گھر میں موجود ہیں۔ نذیر ٹائپسٹ سے کہنا کہ اگر دفتر میں جی آر اسٹیونس[2] کا کناڈا کا پتہ موجود ہو تو بھیج دے۔ میں انھیں خط لکھنا چاہتا ہوں۔ حفیظ[3] کی نظم کا سن کر خوشی ہوئی۔ اگر نقل مل سکے تو بھجوا دو۔ آج کل ہمارے ہاں ایسی چیزوں کا بہت قحط ہے اور بہت ٹھوس قسم کے مطالعے میں زیادہ جی نہیں لگتا۔ اخباروں سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور میں خوردنی اشیاء کی صورتِ حال کافی خراب ہے اور کبھی کبھی اس بات سے تشویش ہوتی ہے کہ تمہیں ہمارے تصور سے زیادہ تنگ دستی کا سامنا نہ ہو۔ مصائب کے سیاہ بادلوں میں ایک سفید دھاری یہ بھی ہوتی ہے کہ اس سے لوگ خوابِ غفلت سے جاگتے ہیں لیکن اس احساس سے فائدہ جب ہی ہوتا ہے کہ اس سے کوئی مثبت عمل پیدا ہو ورنہ یہ احساس بیکار رونے پیٹنے میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ جیل خانے میں آدمی بالکل بے دست و پا ہوتا ہے۔ لیکن اس لاچارگی کی وجہ سے اپنے ہم وطنوں کے دکھ درد کا احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے اور کچھ احساسِ گناہ بھی کہ ہم اُس سے الگ تھلگ بیٹھے ہیں۔

یہاں کافی گرمی ہو چلی ہے اور گرمیوں کا موسم کسی ہوّے کی طرح قریب محسوس ہونے لگا ہے لیکن مجھے اب بھی اُمید ہے کہ ہم یہ موسم کسی بہتر جگہ پر کسی زیادہ خوشگوار فضا میں بسر کر سکیں گے۔ چنانچہ میں نے صحرائے سندھ کی آندھیوں اور بیزار کن ہواؤں کا خیال، جو یہاں کی بے برگ و بار گرمیوں میں دھول اڑاتی رہتی ہیں، دل سے ہٹا دیا ہے۔ اُن کی جگہ میں نے تمہارے خیال، بچوں کی ہنسی اور اُس مسرت کے تصور کو تخت نشین کر دیا ہے جو ہمارا حق ہے۔ وہ مسرت جو ساری انسانیت کا حق ہے۔ وہ

---

[1] THE ROOT AND THE FLOWER

[2] نوج کے رفیق۔ اب جریدہ نگار ہیں۔ [3] حفیظ ہوشیارپوری

مسرّت جسے صرف تھوڑے ہی عرصے کے لئے غصب کیا جا سکتا ہے اور جو ہمیشہ انتظار کے شایان ہے۔

۳ مارچ ۱۹۵۲ء (۲۷)

مجھے افسوس ہے کہ پچھلے ہفتے خط نہیں لکھ سکا۔ وجہ یہ تھی کہ ہم سب ذرا زیادہ مصروف تھے۔ منظورؔ قادر یہاں پر تھے اور اُن سے بہت سے معاملات طے کرنے تھے۔[1] اس ملاقات سے خوشی ہوئی۔ اگرچہ مقدمے کے قانونی نکات پہ بحث کے سوا ایک بات بھی نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ میں صغریٰ[2] بیگم کے نام سلام بھی نہ بھجوا سکا۔ اب میری طرف سے تم پہنچا دینا۔

خط و کتابت میں ہم پھر پیچھے رہ گئے ہیں اس لئے کہ تمہارے تین خط یکبارگی وصول ہوئے جس سے دل خوش بھی ہے اور نادم بھی۔ مَیں کوشش کروں گا کہ یہ حساب برابر ہو جائے۔ شاید تمہیں عجیب لگے لیکن یہاں خط نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جب یہاں اُن چیزوں کی یاد جو دِل کو عزیز ہیں زیادہ ستانے لگے تو یہ یادیں اتنی شفیق خوبصورت اور گرمانے والی محسوس ہوتی ہیں کہ ان کے مدوجزر میں رکاوٹ ڈالنے کو دل نہیں چاہتا۔ تم کہو گی کہ یہ اپنی کاہلی اور سہل انگاری کا جواز پیدا کرنے کا ایک بہانہ ہے اور تمہارا کہنا ٹھیک بھی ہے۔ مَیں نے شاید پہلے بھی لکھا تھا کہ جیل خانے کی زندگی میں بہت سی چھوٹی چھوٹی خود غرضیاں وافر اور نمایاں ہو جاتی ہیں۔ قید سے پہلے پردہ نشین خواتین کی ذہنیت کا کبھی ایسا صحیح شعور پیدا نہیں ہوا تھا جیسا کہ اب ہے۔ یہ ذہنیت ہر قیدی کی عام ذہنیت ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کم ظرفی گھٹیا پن، چھوٹی چھوٹی اُلجھنوں سے اتنی لگن کہ وہ عالمگیر مسائل دکھائی دینے لگیں اور واقعی اہم اور غیر ذاتی مسائل سے قطعی بے تعلقی، کینہ پروری، بدمزاجی، کبھی خودسری، کبھی خاک بوسی، کبھی ہاتھ پاؤں ہلانے سے قطعی گریز اور کبھی بے وجہ کی بھاگ دوڑ یہ سب باتیں مقید اور محکوم زندگی کے عام ذہنی اور عملی لوازمات ہیں جو آسانی سے آزاد لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ لیکن

---

[1] فیض کی جانب سے وکالت کی [2] بیگم منظور قادر

ان سب باتوں کے باوجود کچھ اچنبھے یہاں کی زندگی میں بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً اگلے دن میں نے دہلی سے ہندوستانی موسیقی کے لئے ریڈیو کھولا۔ ہمارے پاکستانی ریڈیو پر جو چیز موسیقی کہلاتی ہے اس میں بعض عطائی لوگوں کی چیں پیں کے علاوہ کچھ سُننے میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سب اچھے موسیقار برکت علی خاں، رفیق۱، پکھراج۲ وغیرہ وغیرہ ریڈیو والوں پر حرام ہیں۔ تو معلوم ہے ہم نے کیا سُنا۔ تم کبھی نہیں بوجھ سکو گی۔ ریڈیو پر اس زمانے کے سب سے بڑے وائلن بجانے والے YEHUDI MENUHIN انڈین فلم فسٹول ہال میں BACH اور PAGANNINI کے نغمے بجا رہے تھے۔ بعد میں جب میں نے اس کے بارے میں سوچا تو بہت رشک بھی آیا اور غصّہ بھی۔ اس مُلک کو قائم ہوئے پانچ برس ہو چکے ہیں اور اس پانچ برس میں ہم نے اپنے لوگوں کے لئے حسُن، تہذیب اور پاکیزہ فرحت کا کوئی بھی سامان فراہم نہیں کیا۔ اگرچہ اس دوران میں اور طرح طرح کے "تماشے" ہر روز برپا ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف یہی سوجھتا ہے کہ دُنیا بھر کے خالی الذہن بڑے بوڑھوں کو یکجا کریں پھر اُن سے خرافات کا طومار اُگلوائیں جنھیں کوئی بھی رتّی بھر اہمیت نہیں دیتا۔ یا یہ کریں کہ کچھ لوگوں کو نشستن و خوردن اور گلا پھاڑنے کی سہولتیں بہم پہنچائیں اور پھر برخاستن کے بعد یہ سب کچھ بھول جائیں۔ ہندوستان ہم سے بڑا مُلک سہی لیکن کلچر یا تہذیب کا تعلّق مُلک کے سائز سے نہیں ہوتا۔ سوچنے اور رہنے سہنے کے آداب و اطوار سے ہوتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے مُلک کے لوگ اگر بہت عمدہ تہذیب برت نہیں سکتے تو کم از کم اُس کے نمونے تو دیکھ سکیں۔ خیر شاید کبھی نہ کبھی ایسے دِن بھی آئیں گے اور شاید مجھے اس بارے میں لکھنا بھی نہ چاہیے۔

ہاں تو مَیں اچنبھے کی باتوں کا ذکر کر رہا تھا۔ گزشتہ ہفتے ہمارے ہاں ایک لڑکے کے لئے اس کے گاؤں سے گاجر کا حلوہ آیا۔ ہم اُسے چھیڑا کرتے تھے کہ اُس کے لئے جو مٹھائی وغیرہ آتی ہے

---

۱ رفیق غزنوی   ۲ ملکہ پکھراج

وہ اکیلے اکیلے چٹ کر جاتا ہے، غالباً اس بات سے چڑ کر اس نئے گاؤں میں گاجر کے حلوے کا آرڈر بھیجا۔ جب یہ حلوہ یہاں پہنچا تو جانتی ہو کتنا تھا۔ ایک پورے چھکڑے کا بوجھ یعنی تین بڑے بڑے کنستر جو کم از کم بیس بیس سیر کے ہوں گے۔ یعنی کوئی ڈیڑھ من حلوہ۔ بھئی ذرا غور کرو کہ کتنے من گاجریں اور کتنے من شکر اور کتنا گھی اس کے لئے فراہم کیا گیا ہوگا۔ ہم سب لوگ گاؤں میں حلوے کی تیاری کے منظر کا تصوّر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گاجروں کے چھکڑے چلے آرہے ہیں، گھی کی کئی کڑھائیاں جمع کی جارہی ہیں۔ ایندھن کے پہاڑ لگ رہے ہیں اور پورے علاقے میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ غالباً یہ دن اُس علاقے کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ قرار دیا جائے گا۔ اس کے بارے میں قصّے کہانیاں اور گیت لکھے جائیں گے کیونکہ دنیا کی تاریخ میں آج تک پندرہ آدمیوں کے لئے بہ یک وقت ڈیڑھ من حلوہ کبھی تیّار نہیں ہوا۔ چنانچہ آج کل صبح دوپہر شام سب کو صرف حلوہ کھانے سے کام ہے۔

میں نے موسم کا ذکر کیا تھا۔ ان دنوں پھر بادل چھا رہے ہیں اور ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہارے آنے تک یہ موسم ایسا ہی رہے عمرِ رائیگاں کا افسوس نہ ہو تو واقعی بہت خوشگوار فضا ہے لیکن اس بات کا افسوس کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا اور یوں تھا تو کیوں تھا بیکار چیز ہے جو کچھ تھا وہ اس سے بدتر بھی ہو سکتا تھا اور التجا یا آرزو سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ ہے یا ہوگا وہ البتہ بہتر ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا انحصار ہم پر ہے اور ہم اس کے لئے کوشش کریں گے۔

اگر حالات بدستور رہے تو تمہارے جوتشی اور بڑھیا عورت (وہ کون ہے؟) کی بات شائد غلط نہ ہو اس لئے چند روز اور فقط چند ہی روز۔ میری گلنے والی دوستوں کی تم سے ملاقات کا سُن کر خوشی ہوئی (ان کے بارے میں تمہاری باتوں سے یہاں اکثر خوش گپیاں رہتی ہیں اور ہم اس پر کافی اتراتے ہیں۔ یہاں کے دوست سمجھتے ہیں کہ اگر تم یہ سب خرافات بغیر کسی اعتراض کے برداشت کر لیتی ہو تو تم بہت ہی بڑھیا آدمی ہوگی اور ہم انھیں بتاتے ہیں کہ اصل

معاملہ کیا ہے ورنہ ہمارا اور تمہارا دونوں کا بھرم کچھ کم ہو جائے گا) یہ سُن کر بھی تسکین ہوتی ہے کہ اپنے بیوی بچوں کے علاوہ ایک دو آدمی ایسے بھی ہیں جن کے لئے اپنا غیب و حضور اتنی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے وقتوں میں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اپنے حقیقی دوست کتنے تھوڑے ہیں لیکن اگر ایک دو بھی ہوں تو ان حالات میں انہیں نعمتِ غیر مترقبہ سمجھنا چاہیئے۔ میں خالص ذاتی دوستوں کی بات کر رہا ہوں۔ جہاں تک عام دوستوں کا تعلق ہے اُن سے تو دُنیا بھری ہوئی ہے۔

جنجوعہ¹ کی بچی اب بہتر ہے۔ اُسے نمونیا ہو گیا تھا لیکن اب بالکل صحت یاب ہو چکی ہے اور وہ لوگ کچھ دنوں کے لئے کراچی چلے گئے ہیں۔ جنجوعہ نے بچّی کی عافیت پوچھنے کے لئے تمہارا شکریہ ادا کیا ہے اور اپنی بیگم کو تمہارا پیغام پہنچا دیا ہے۔

پاکستان ٹائمز کا گم شدہ شمارہ پہنچ گیا ہے اور یہاں کے پڑھنے والوں نے تمہارے بچّوں کے کالم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں دولتِ مشترکہ کا ذکر زیادہ ہے اور باقی دُنیا کا بہت کم۔ اس کی وجہ مجھے تو معلوم ہے یعنی یہ کہ لکھنے کا مواد کہاں سے زیادہ دستیاب ہوتا ہے اور کہاں سے کم۔ یہ اعتراض تمہیں یہ بتانے کے لئے لکھ رہا ہوں کہ یہاں کے لوگ تمہاری تحریروں میں کافی دلچسپی لیتے ہیں۔

تو تمہاری مسز روز ویلٹ سے بھی ملاقات ہو گئی۔ ان کا جو قول تم نے نقل کیا ہے اس سے تمہاری بہ نسبت ان کی اپنی تعریف نکلتی ہے۔ انہیں کبھی پردیسی سرزمین پر اپنی تحریروں سے روزی کمانے کی ضرورت نہیں پڑی اور جو اُن کی تحریریں میں نے ڈان میں دیکھی ہیں وہ دُور دور تک تمہارے کالم تک نہیں پہنچتیں (اب میرا کوئی ارادہ نہیں کہ تم باورچی گیری اور برتن مانجھنے کے فرائض دوبارہ ادا کرو۔ اب تو ارادہ یہی ہے کہ کچھ دن ہم بیگم فلاں کے میاں کے فرائض انجام دیں گے) تو ہمارے

---

¹ جیل کے ساتھی اور سابق ایئر کموڈور۔

ہاشمی[1] بھائی امریکہ جا رہے ہیں۔ اگر ہم اسیرِ زنداں نہ ہوتے تو انھیں بہت سے عمدہ تعارفی خط دے سکتے تھے۔ تم نے ZELMA BRANDT کا پوچھا ہے۔ یہ وہی اچھی سی بڑھیا امریکن خاتون ہیں جو تین چار برس پہلے لاہور آئی تھیں اور ہم انھیں شہر دکھانے لے گئے تھے۔ غالباً تم اُن سے ملی تھیں اس لئے کہ وہ ایک مرتبہ دوپہر کے کھانے پر ہمارے گھر آئی تھیں۔ انھیں ضرور جواب لکھو اور اُن کے پیار کے جواب میں ہماری طرف سے پیار بھیج دو اور یہ بھی لکھ دو کہ اگر وہ ہمیں خط لکھنا چاہیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ STEVE[2] کے بارے میں تمہارا خدشہ صحیح نہیں ہے اور میں یہی دریافت کرنے کیلئے انہیں لکھنا چاہتا ہوں کہ وہ بقیدِ حیات ہیں کہ نہیں۔ ان کا خیال اس لئے آیا کہ گزشتہ دنوں بوڑھے ڈکنسن[3] اور نوجوان لطیف[4] کی موت کا پڑھ کر بہت قلق ہوا۔ دونوں کتنے اچھے خوش مزاج اور پیارے آدمی تھے۔

میرے خیال میں فی الحال مجھے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر ہو سکے تو I.A. RICHARDS کی تینوں کتابیں ساتھ لے آنا یعنی PRINCIPLES OF CRITICISM ، PRACTICAL CRITICISM اور MEANING OF MEANING۔

اچھا ہوا کہ آپا نے تمہاری علالت کا ذکر نہیں کیا۔ نہ تم نے اس کے بارے میں لکھا لیکن جب ایسی کوئی بات ہو تو دِل خود گواہی دینے لگتا ہے اور اب مجھے ویسی ہی فکر لاحق رہنے لگی ہے جیسے تمہیں رہا کرتی تھی۔ لیکن ہم یہاں اُس روشنی پر نظر جمائے رکھتے ہیں جو تاریکی سے پرے فروزاں ہے جس کا وجود برحق ہے جو کبھی نہ کبھی دکھائی دے گی جس کے لئے انتظار کرنا لازم ہے خواہ انتظار کیسا ہی کٹھن کیوں نہ ہو۔

---

[1] بشیر ہاشمی سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی۔ [2] کرنل جی آر اسٹیونس۔ فوج میں فیضؔ کے افسر۔ ادیب و صحافی۔ [3] ایرک ڈکنسن جو گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد تھے۔ [4] پروفیسر ایم اے لطیف جو پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے اُستاد تھے اور بعد میں صوبہ سرحد میں ناظمِ تعلیمات ہو گئے تھے۔

۱۷ مارچ ۱۹۵۲ء (۲۸)

اب کے جواب پھر دیر سے لکھ رہا ہوں اس لئے کہ گزشتہ ہفتے میں مصروفیت زیادہ تھی اور ہمیں اپنی صفائی کے بیانات پیش کرتے تھے۔ یہ کافی ناخوشگوار اور ذلت آمیز کام تھا۔ خاص طور سے مجھ جیسوں کے لئے، اس لئے کہ مجھے اپنی ذات اور افعال کے بارے میں کچھ کہنے سے بہت چڑ ہے اور ہم اپنے دوستوں سے بھی حتی الامکان یہ باتیں نہیں کرتے۔ بہرحال یہ قصّہ تمام ہوا اور اب ہم آرام سے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر سستا سکتے ہیں۔ باقی کام وکیلوں کا ہے اور بلاشبہ وہ جی بھر کے ایک دوسرے سے قیل و قال کریں گے۔ عدالت پندرہ دن کے لئے بند ہے۔ آج ہمارا چھٹی کا پہلا دن ہے۔ صبح سات بجے سے کچھ اوپر وقت ہے۔ دھوپ ابھی تک ہمارے صحن میں نہیں پہنچی۔ سب لوگ ابھی تک بستر میں ہیں (آجکل ہم برامدے میں باہر سوتے ہیں) میں نہا دھو کے حجامت بنا کے تیار ہو چکا ہوں جس سے ہمارے نیم بیدار ساتھی مچھر دانیوں میں سخت حیران و پریشان ہو رہے ہیں اس لئے کہ عام طور سے میں سب سے آخر میں اٹھتا ہوں۔ ایک دو نے SCANDALISED آواز میں پکارا ہے کہ تکلیف کیا ہے۔ کیا گورنر صاحب نے ناشتے پہ بلایا ہے یا ریٹا ہیورتھ ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھی ہے۔ دراصل "تکلیف" یہ ہے کہ ہم اصلاح نفس کی کبھی کبھار کوشش کا پھر اعادہ کر رہے ہیں اس لئے کہ اب کے واقعی کچھ کام ختم کرنے کا ارادہ ہے۔ کچھ نامکمل نظمیں مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ ضیا[1] کی کتاب کا مسودہ باقی ہے اور اپنی پرانی اور نئی نظموں کی ترتیب کا بھی ارادہ ہے۔ بہت سے خط بھی جواب طلب ہیں۔ ایک خط بالی[2] کا ہے ایک رضیہ[3] کا ایک قاسمی[4] کا اور ایک مارس جونس کا۔ دوسروں کے مقابلے میں میری ڈاک بہت کم ہے لیکن پھر بھی اسے کافی عیاشی سمجھنا چاہیئے۔ یہ ختم کرنے کے بعد تھوڑا سا پڑھنے کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد ہم سب کافی کے لئے دوسرے گھر

۱۔ عزیز ضیاء، اسسٹنٹ ایڈیٹر پاکستان ٹائمز ۲۔ فیض کی بہن

۳۔ رضیہ سجاد ظہیر ۴۔ احمد ندیم قاسمی

جائیں گے جیسے خانقاہ یا ہاؤس آف لارڈز کہتے ہیں۔ کل رات میں نے کراچی ریڈیو کھولا تو ایک خاتون اسٹیفن اسپینڈر پر تقریر کر رہی تھیں۔ تمہیں معلوم ہے کون تھیں؟ چبؔ[1] کی دوست مایاؔ[2]۔ میں نے بچے کو بتایا تو وہ بھی تھوڑے سے جذباتی ہو گئے۔ غالباً لکھنؤ میں انہیں جانتے تھے۔ سہیلیوں کا ذکر آیا تو...... کی شادی کی خبر سے تھوڑا سا تاسف ہوا۔ کچھ لوگوں کو غالباً زیادہ صدمہ ہوا ہو گا۔ مجھے تو اس کی صورت بھی ٹھیک سے یاد نہیں۔ غالباً صرف ایک ہی دفعہ دیکھا ہے جب ہم TILLY[4] ، ANDY[3] اور فیروز[5] کے ساتھ اُس کے گھر گئے تھے۔ مجھے یاد ہے رات بہت جا چکی تھی لیکن اس کے باوجود ہماری بہت تواضع کی گئی۔ چائے اور کیک اور پھل اور نہ جانے کیا کیا چیزیں پیش کی گئیں۔ خیر ان تفریحات سے ہمیں جتنی دلچسپی ہے تمہیں معلوم ہے۔ اگرچہ ہم ظاہر یہی کرتے ہیں کہ ہے۔ یہ صرف میں اور تم جانتے ہیں کہ دَر اصل ہم کچھ INHIBITED صوفی قسم کی چیز ہیں لیکن عام لوگوں سے یہ بات چھپائے رکھتے ہیں تاکہ شاعرانہ شہرت پر حرف نہ آئے۔ یہ خط پہنچنے تک غالباً تم نے اپنے آنے کی تاریخ طے کر لی ہو گی۔ میرے خیال میں تمہیں اپوا کی میٹنگ کی رپورٹ لکھنی ہے تو ان کا تماشہ دیکھ آؤ۔ ضرور دلچسپ ہو گا۔ نوازش یہاں پر نہیں ہیں۔ ان کا خانساماں موجود ہے۔ اس لئے تمہیں کوئی زحمت نہیں ہو گی۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے البتہ نہانے کا ایک تولیہ چاہیئے۔ پہلا والا پھٹ چکا ہے۔ اگر زیادہ فضول خرچی نہ سمجھو تو اپنے بیرا کو ساتھ لیتی آؤ اس سے یہاں تمہیں آرام رہے گا اور میں چاہتا ہوں کہ تم بچوں کو یہاں سے کراچی کی صنعتی نمائش دکھانے لے جاؤ۔ میری نئی کتاب سے جو پیسے ملنے کی توقع ہے اس سے یہ خرچ پورا ہو جائے گا۔ غالباً ایک ایڈیشن کے ایک ہزار روپے تو مل ہی جائیں گے۔ جس لطیف کا میں نے اپنے خط میں ذکر کیا تھا یہ وہی لطیف ہیں جن کا تم سوچ رہی

---

[1] آل انڈیا ریڈیو کے سومناتھ چب [2] اب مسز مایا جمیل [3] امریکی جریدہ نگار اینڈرو راتھ۔ مختصر نام اینڈی [4] ٹلی نام تھا اینڈرو راتھ کی بیوی کا

[5] امرتسر کے ایک دوست فیروز الدّین

ہو۔ کالج میں مجھ سے دو سال سینئر تھے۔ پشاور میں اچانک دل کے دورے سے فوت ہو گئے۔ بہت دکھ کی بات ہے میزو کا خط پڑھ کر بہت لطف آیا۔ باقی لوگوں نے بھی لطف اٹھایا۔ خاص طور سے اس کی دعا سن کر جو بالی نے اپنے خط میں لکھی ہے (اے ہمارے آسمانی باپ جو حیدرآباد جیل میں ہے وہاں تمہاری مرضی پوری ہو جیسے اس جہاں میں ہے وغیرہ وغیرہ)۔

۲۵ مارچ ۱۹۵۲ء (۲۹)

اُمید ہے کہ یہ خط تمہیں وقت پر مل جائے گا۔ انتظار کا صرف ایک ہفتہ باقی ہے اور تم یہاں ہو گی۔ تم نے اپنی بیماری کا ذکر کیا ہے جس سے ڈر لگ رہا ہے۔ خدا کرے کہ تم واقعی میں بیمار نہ ہو ورنہ دل رنجیدہ ہو گا۔ تمہارا پچھلا خط بہت افسردہ تھا جسے پڑھ کر دکھ ہوا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے لئے دل شکنی اور آزردگی کے کافی اسباب موجود ہیں تو ایسے جذبات کی عیاشی بھی جائز ہے لیکن اگر لڑائی میں اپنا پلّہ بہت کمزور ہو تو پھر آدمی بد دلی اور کم ہمتی AFFORD نہیں کر سکتا۔ بہ ظاہر یہ بات غیر منطقی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل صحیح ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں صرف جدوجہد ہی کافی نہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان یہ لڑائی بشاشت اور خوش طبعی سے لڑے اور اپنے پر دردمندی اور ترحم کے جذبات نہ طاری ہونے دے ورنہ غنیم کا پلّہ اور بھی گراں بن جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں ایک حد تک یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے اور آدمی بالارادہ وہ سب کچھ نہیں کر سکتا جو اُسے کرنا چاہئے لیکن مشکلات کیسی بھی ہوں اپنی طرح کی کوشش تو لازم اور واجب ہے۔ یہاں بیٹھ کر میں تمہاری امداد اور دلجوئی کے لئے اور تو کچھ نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ تمہیں اس طرح کی بیکار اور ناقابلِ عمل نصیحتیں لکھتا رہوں جن سے غالباً تمہیں جھنجلاہٹ ہوتی ہو گی۔ میں تو یہ اس لئے کرتا ہوں کہ مجھے تم پر اعتماد ہے اور اس لئے کہ اپنی محبت کے سوا یہاں سے اور کچھ تمہیں پیش بھی نہیں کر سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ شاید اب وہ دن دور نہ ہو جب بادل چھٹ جائیں گے اور ہماری زندگی میں بہار لوٹ آئیگی۔

بنّے کی بیگم نے بنّے کے وہ خطوط شائع کئے ہیں جو انہوں نے سن ۴۰، ۴۲ میں جیلخانے

سے لکھے تھے (وہ کوئی ڈھائی برس جیل میں رہے تھے) انھیں پڑھ کر بہت ہنسی آئی اس لیے کہ ہماری طرح وہ بھی مُسلسل معذرت کرتے رہتے ہیں۔ کبھی وقت پر نہ لکھنے کی، کبھی کسی کی سالگرہ بھُول جانے کی، اور اس سے بہت تقویت ہوئی کہ ہم ہی صرف واحد نالائق میاں نہیں ہیں۔

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ گزشتہ ہفتے کے بچّوں کے صفحے پر تمہیں یہاں کے لوگوں کی داد پہنچا دوں۔ افریقہ والی نظم بہت اچھّی تھی اور یہاں کے لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ شاید اُن ہی کی تنقید کا نتیجہ ہے۔ تمہارے گھریلو بجٹ والی کہانی کا بہت لُطف آیا۔ گھر کی چھوٹی چھوٹی پریشانیاں اب یاد میں بہت دلکش معلوم ہوتی ہیں اور ان کی جانب دوبارہ لوٹ جانا بہت دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ یہ میں طنز کے طور سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ واقعی ایسا ہی ہے۔ کچھ عجیب سی بات ہے کہ آدمی ماضی کے بارے میں سوچنے لگے تو صرف مسرّتیں اور خوشگوار چیزیں یاد نہیں آتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی موٹی تلخیاں اور پریشانیاں سب وقت نے دِل سے دھو ڈالی ہیں۔

دو نئی نظمیں لکھی ہیں اور اُمید ہے کہ تمہارے آنے تک ایک آدھ اور ختم ہو جائے گی۔ نئے مجموعے کی اشاعت کے بارے میں تم آ ذگی تو بات کریں گے۔

(۳۰)

۱۹ اپریل ۱۹۵۲ء

اُمید ہے کہ تم خیریت سے پہنچ چکی ہو گی۔ میں اطلاع کے اِنتظار میں ہوں۔ تمہارے اور بچّوں کے خوش و خرّم چہرے دیکھ کر دِل پہلے سے کہیں زیادہ خوش ہے۔ اگرچہ یوں لگتا ہے کہ یہ مُلاقات کل کی بات نہیں دور دراز ماضی کا کوئی واقعہ ہے اور تم کل یہاں نہیں آئی تھیں کئی برس پہلے آئی تھیں لیکن جب پرسوں تم یہاں تھیں تو یہاں یوں لگتا تھا جیسے ہم کبھی جُدا ہی نہیں ہوئے اور میں دفتر کی روز مرّہ کی غیر حاضری کے بعد تمہیں حسبِ معمول دیکھ رہا ہوں۔ دِل کے رِشتوں میں وقت اور فاصلے اس طرح کھُلتے ملتے اور مٹتے اُبھرتے رہتے ہیں کہ ان کے نت نئے نقشوں کا حقیقت سے واسطہ ہی نہیں رہتا یعنی کوئی آجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ اور چلا جائے تو لگتا ہے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ شاید کسی دن یہ بات شعر میں ڈھل سکے۔ لیکن یہ تو اتنا عام

ے آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہربان بھولے تو یوں کہ جیسے کبھی آشنا نہ تھے

تجربہ ہے کہ بہت سے لوگ پہلے ہی لکھ چکے ہوں گے۔

یہ چین وقفہ ختم ہوا اور زندگی پھر اپنے معمول پر آگئی ہے، لیکن اب یہ معمول اور بھی زیادہ بے رونق نظر آتا ہے۔ صبح چھ بجے اُٹھنا، ناشتہ، عدالت، دوپہر کا کھانا، سہ پہر کا سونا، والی بال، رات کا کھانا اور بستر۔ موسم پر مُردنی چھا چکی ہے۔ ہوا کا جھونکا تک اِدھر نہیں آتا۔ مچھر بہت ہیں۔ کتابیں بے مزہ معلوم ہوتی ہیں اور دماغ نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یعنی پھر جیلخانے کے برُے موڈ کی آمد آمد ہے۔ لیکن یہ بھی گزر جائے گا۔ صرف اس کے گزرنے کا انتظار کرنا ہوگا۔

میرے خیال میں تم سب لوگ چیچک کے ٹیکے لگوا لو۔ یہاں جیل میں چیچک کا ایک کیس ہو گیا تھا اور ہم سب کے ٹیکے لگ چکے ہیں۔ تم تک اِس کا اثر نہیں پہنچنا چاہیئے، لیکن پھر بھی احتیاط بہتر ہے۔ تمہیں پوشنی[1] کی منگیتر کے لئے ایک خط ملے گا جو یہاں تمہارے حوالے نہ کیا جا سکا۔ اِسے ڈپلومیٹک وسیلے سے منزلِ مقصود تک پہنچا دینا۔

(۳۱)

۱۵ اپریل ۱۹۵۲ء

تمہاری طرف سے کسی خبر یا اطلاع کا ابھی تک انتظار ہے۔ میرا خیال تھا کہ اِس ہفتے اتوار کوئی خط آئے گا لیکن ابھی تک کچھ نہیں پہنچا اور اَب مجھے تشویش ہونے لگی ہے۔ ہر بار تمہارے آنے پر تمہیں تاکید کرنا چاہتا ہوں کہ گھر پہنچ کے خیریت کا تار دے دینا لیکن ہر بار یہ کہنا یاد نہیں رہتا۔ اس لئے آئندہ کے لئے تم خود یاد رکھو۔ اگرچہ مجھے تہہ دل سے اُمید ہے کہ اَب تمہیں یہاں آنا نہ پڑے گا۔ اَب تم سے ملنے کے لئے ہمارے آنے کی باری ہے۔

مجھے خدشہ ہے کہ میرا گزشتہ خط کچھ افسردہ کُن تھا جس کا بہت افسوس ہے۔ بات یوں ہے کہ اپنے عزیزوں سے ملنے کے بعد ملاقات کی مسرت کے باوجود اپنی تنہائی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ صرف اپنی محرومی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ آدمی اُن عزیزوں کا

---

[1] ظفر اللہ پوشنی جو فیض کے ساتھ جیل میں تھے۔

حق ادا کرنے سے قاصر ہے جو دُہری محرومی ہے۔ خیر اب یہ موڈ گزر چکا۔ موسم بھی کچھ بہتر ہو گیا ہے اور ہم پھر ہشاش بشاش اور خوش ہیں۔ دِن اَب بھی گرم ہیں لیکن راتوں کو ٹھنڈک ہو جاتی ہے۔ ہوا چلتی ہے اور باہر سونا اچھّا لگتا ہے۔ میں لاہور کا درجۂ حرارت ہر روز دیکھتا ہوں تمہارے ہاں درجۂ حرارت تو کم ہے لیکن وہاں ہماری صحرائی ہوا نہیں چلتی اس لئے غالباً گرمی بڑھ چکی ہوگی۔

یہاں کوئی نئی خبر نہیں ہے سوائے اس کے کہ اَب ہمارے دِل زدہ عشاق نوجوانوں کی تعداد تین ہو چکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن میں سچّا تو صرف ایک ہی ہے باقی دونوں مکر کر رہے ہیں۔ بہر حال اِس نفرت بھری دُنیا میں کوئی پیار کی بات کرے تو اچھّا لگتا ہے اور اپنی نوجوانی کے دِن یاد آتے ہیں۔ اُن دنوں کی بات چلی ہے تو مجھے دو بہت خوبصورت منظر یاد آئے۔ ایک امرتسر میں جیل خانے کے پیچھے سوکھی ہوئی نہر کا کنارا اور ایک شملے میں جاکو پہاڑی پر ایک ایسا گوشۂ تنہائی جہاں سے ہم نیچے کی پوری وادی دیکھ سکتے تھے لیکن ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ شاید یہ مناظر تمہیں بھی یاد ہوں لیکن اتنی تفصیل میں یاد نہیں ہوں گے۔ جیسے مجھے یاد ہیں۔ وہ دِن بعض اعتبار سے تکلیف دہ بھی تھے لیکن جیسے میں نے لکھا تھا یاد کے تکلیف دہ پہلو یاد ہی نہیں آتے۔

۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء

(۳۲)

تمہارے دونوں خط مل گئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے گھبراہٹ میں تمہیں تار بھیج دیا۔ اُمید ہے کہ تمہیں اس کی وجہ سے پریشانی نہ ہوئی ہوگی۔ جس دِن میں نے تار دیا تھا اُسکے اگلے ہی دِن تمہارا خط مل گیا تھا۔ اس لئے تمہاری خیریت کی اطلاع کے لئے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اُسی دِن سے نوائے وقت کا پرچہ بھی آنا شروع ہو گیا اور حمید نظامی کا خط بھی ملا جس سے میں سمجھ گیا تھا کہ تم خیریت سے گھر پہنچ چکی ہو۔ اس دوران میں امّاں اور آپا یہاں آئے تھے، اُن کے کراچی جانے سے پہلے دو دِن اُن سے مُلاقات ہوتی رہی۔ یہ کافی غمگین معاملہ تھا۔ یوں تو زندگی سبھی کے لئے صبر آزما ہے لیکن بوڑھے لوگوں کے لئے جنہیں زندگی میں بہت کم کچھ دیکھنے کو باقی ہے اور بھی زیادہ مُشکل ہے۔ یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تمہاری طبیعت زیادہ بہتر اور ہشاش ہے۔ اَب

غالباً انتظار میں زیادہ دن باقی نہیں اس لئے حوصلہ قائم رکھو۔ میں بھی بالکل اچھی طرح ہوں لیکن آجکل ہمیں بہت ہی بُرے موسم کا سامنا ہے۔ ہر دن گرمی اور گھٹن اور گرد و غبار سے اٹا رہتا ہے۔ کچھ ویسا موسم ہے جیسا دہلی میں مئی کے مہینے میں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں نہ لودھی باغ ہے نہ رات کو بُخاری[1] صاحب کے ساتھ آوارہ گردیاں ہیں۔ نہ دِن کی تمازت کے بعد شام کی ٹھنڈک میں گھر واپسی ہوتی ہے۔ اے ایس بی کو اگلے دن پھر ریڈیو پر سُنا تھا۔ یہ ان کی سیکیوریٹی کونسل والی تقریر کا ریکارڈ تھا جواب شہرۂ آفاق ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں اب وہ اتنے بڑے آدمی ہو گئے ہیں کہ اگر میں انہیں خط لکھوں تو شاید ان کے لئے کسی پریشانی کا باعث نہیں ہوگا اس لئے میں لکھنے کے لئے سوچ رہا ہوں۔

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ اب بھی ایسے لوگ باقی ہیں جنہیں ہم جیسے راندۂ درگاہ لوگوں کی صحت میں دلچسپی ہے۔ ہماری صحت جس پر یہاں کے سب لوگ رشک کرتے ہیں بالکل اوّل درجے کی ہے البتہ اس سے تھوڑی سی تشویش ہے کہ لائل پور جیل میں جو وزن گھٹایا تھا وہ دوبارہ بڑھنے لگا ہے۔۔۔۔ ۲۔۔۔ کے بارے میں سُن کر رنج ہوا۔ نہ جانے ایسی کتنی لڑکیاں ہوں گی جنہیں زمانے کی شقاوت اور خود غرضی نوجوانی میں مایوسی اور ذلّت کا شکار بننے پر مجبور کرتی ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف ان کی اپنی زندگی میں بدی کا زہر گھُل جاتا ہے بلکہ پھر یہی زہر ان کے ذریعے سے کئی دوسری زندگیوں میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ اس کا الزام کس پر ہے اور آدمی گناہگار کسے ٹھہرائے؟ اُس اجتماعی دُکھ درد کے علاوہ جو صرف معاشرتی انقلاب ہی سے دُور ہو سکتا ہے انفرادی رنج و ملال کے ایسے اسباب بھی بہت ہیں جو تھوڑی سی محبّت شفقت اور سمجھ بوجھ سے اگر دُور نہیں کئے جا سکتے تو کم ضرور کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن محبّت اور شفقت کی طلب میں پکارنے والے اتنے زیادہ ہیں اور دینے والے اتنے کم کہ دردِ جگر اور

---

[1] احمد شاہ بخاری (پطرس) [2] فیض نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔

شکستِ دل کا مداوا دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔ بہرحال اسکی تلاش میں تگ و دو پھر بھی لازم ہے اور جیسا کہ تم نے لکھا ہے اپنی بھلائی اِسی میں ہے کہ آدمی دوسروں سے نیکی کرتا رہے البتہ اس کے عوض میں کسی صلے یا احسان مندی کی توقع نہ رکھنی چاہیئے ورنہ یقیناً مایوسی کا سامنا ہوگا۔ اگر آدمی نیکی کے عوض میں نیکی کی توقع رکھے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ دُنیا کا نظام بجائے خود نیک ہے ظاہر ہے کہ یہ سوچ غلط ہے اس لیئے کہ ایک نیکوکار نظام میں سبھی کو نیک ہونا چاہیئے اور کسی کو خاص طور سے نیکی کرنے کے لیئے زحمت اُٹھانے کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے۔

ہم نے پھر لکچر بازی شروع کردی اس لیئے کوئی اور بات کریں۔ تمہارے بچّوں کے صفحے پر چھپنے والے مضامین بہت اچھّے ہیں۔ ایسے ہی مضامین کے لیئے اَب تم برمی، انڈونیشی اور ایرانی دوستوں سے فرمائشیں کیوں نہیں کرتیں۔ یقیناً کوئی نہ کوئی ایران اور مصر میں طلباء کی جدّوجہد کا آنکھوں دیکھا حال لکھ سکے گا۔ اگرچہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی نہ کوئی کون ہے۔ تم نے بحث کے موضوعات کی فرمائش کی ہے۔ چند تجویزیں لکھتا ہوں۔

(۱) نصابی کتابیں:۔ دلچسپ نہیں، غیر دلچسپ ہیں، سستی ہیں، مہنگی ہیں۔ اس بارے میں تبادلۂ خیال کہ کیسی ہونی چاہئیں۔

(۲) اساتذہ:۔ اساتذہ میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ ان کی شخصیت کیسی ہونی چاہیئے وغیرہ۔

(۳) مدارس:۔ لڑکیاں اور لڑکے سب سے زیادہ کس چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں اور سب سے زیادہ کس قسم کی سہولت یا آسائش چاہتے ہیں۔

(۴) مساوات اور معاشرتی انصاف:۔ ان چیزوں سے کیا مُراد ہے۔ پاکستان میں یہ کس حد تک موجود یا غیر موجود ہیں۔ اِس بارے میں طلباء کو کیا کرنا چاہیئے۔

(۵) مخلوط تعلیم:۔ مخلوط تعلیم کا موجودہ نظام، نقائص اور اصلاح کی صورتیں۔

(۶) دُنیا میں اَب تک کئی مُلک غلام کیوں ہیں؟:۔ ان کی غلامی کے ذمّہ دار کون ہیں؟ ہم انکی کیا امداد کرسکتے ہیں وغیرہ۔

مجھے یقین ہے کہ بچوں کو ان موضوعات میں دلچسپی ہوگی۔

یکم مئی ۱۹۵۲ء (۳۳)

اس ہفتے میں تمہارے دو خط ملے۔ مجھے افسوس ہے کہ جواب دینے میں ذرا تاخیر ہوگئی۔ وجہ یہ تھی کہ پچھلے چند دن بہت گرمی پڑی جس سے طبیعت کسلمند ہو جاتی ہے۔ تمہاری زیبرا والی کہانی پڑھ کر ہنسی آئی۔ اگر تمہارا اشارہ اس طرف ہے کہ اپنے ایام جہالت میں ہم بھی ایسے ہی بدتمیز تھے تو یہ بات غالباً صحیح نہیں۔ اگرچہ اب یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ وہ دن اتنے دور اور غیر حقیقی معلوم ہوتے ہیں کہ ان دنوں کی باتیں اپنے پر گزری ہوئی نہیں بلکہ سنی سنائی باتیں محسوس ہوتی ہیں۔

ہم جیل والوں کے لئے نوجوانی کی خرمستیوں کا اگر کوئی بدل یہاں پر ہے تو وہ پھلوں کے صندوقچے پر نصف شب ڈاکہ ڈالنا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ یہاں بعض لوگوں کو طبی سفارش پر کچھ فاضل پھل فروٹ ملتا ہے۔ جسے وہ بہ وقت فرصت کسی مناسب موقع پر نوش جان کرنے کے لئے سینت کر رکھتے ہیں۔ لیکن باقی لوگوں نے سب ٹھکانوں پر اپنے جاسوس تعینات کر رکھے ہیں جنہیں ہر چھپے خزانے کا پتہ رہتا ہے۔ ہر رات گیارہ بارہ بجے سازش مکمل ہوتی ہے اور بہت خاموشی اور نظم و ضبط کے ساتھ شب خون کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ میری چارپائی سب سے محفوظ اور سب سے غیر مشتبہ جگہ ہے اس لئے چوری کے مال کی تقسیم عام طور سے یہیں کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں ہمیں رات کو کھانے پینے کی چیزوں کی کبھی قلت نہیں ہوتی۔

۳ مئی آج سہ پہر بہت عجیب و غریب بات ہوگئی۔ یعنی مینہ برسا ہے، واقعی مینہ برس رہا ہے۔ اگرچہ اس بارش میں پنجاب کی برسات کا لطف اور شان و شکوہ کہاں۔ یوں لگتا ہے کہ کسی نے ایک بہت ہی خارش زدہ نحیف و نزار بادل میں کہیں ایک پرنالہ لگا دیا ہے جس سے پانی ٹپک رہا ہے۔ پھر بھی بارش ہی تو ہے۔ ہمارے برآمدے میں پانی بہہ رہا ہے اور چونکہ ان برآمدوں میں پی ڈبلیو ڈی کی مہربانی سے ڈھلان باہر کی بجائے اندر کو ہے اس لئے

برآمدوں سے پانی چھپا چھپ ہمارے کمروں میں داخل ہو رہا ہے۔ اب سے کچھ دن پہلے افواہ اڑی تھی کہ ہمارے کمروں میں چھت کے پنکھے لگائے جائیں گے۔ پھر کچھ پی ڈبلیو ڈی والے آئے اور جگہ جگہ سوراخ کر گئے۔ اس کے بعد پھر پی ڈبلیو ڈی کے مخصوص انداز میں یہ لوگ سب سوراخ ویسے کے ویسے چھوڑ کے غائب ہو گئے اور دوبارہ نظر نہیں آئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان سب سوراخوں میں سے آبشار گر رہے ہیں۔ جیل کے وارڈ اور دوسرے قیدی بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ کوئی سیڑھی لگا رہا ہے کوئی کیچڑ کی بالٹی لئے جا رہا ہے۔ سوراخ بند کئے جا رہے ہیں، پانی نکالا جا رہا ہے۔ سامان اُٹھایا جا رہا ہے اور وہ ہنگامہ ہے کہ ہنگامۂ شادی معلوم ہوتا ہے۔ میں نے بہ نفسِ نفیس اپنا بستر لپیٹا، چارپائی کھڑی کی، کتابوں اور میز کو کپڑے سے ڈھانپا اور اس کارگزاری کی وجہ سے بہت مستعد اور عالی مقام محسوس کر رہا ہوں۔

کسی[1] نے سرحد سے بہت عمدہ کھدّر بھیجا تھا جس سے میں نے کچھ جوڑے سلوا لئے ہیں اور اب مجھے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ تمہارے ہاں جو کچھ تیار ہے بھجوا دو لیکن ململ یا کوئی اور نفیس کپڑا خریدنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ مجھے پیسے بھیجنے کا تو خیال بھی نہ کرو۔ تمہارے جانے کے بعد کسی[2] نے کراچی سے کچھ بھیج دیا تھا جو بہت دنوں کے لئے کافی ہے۔ یہاں ہم خرچ بھی کس چیز پر کریں۔ صرف کھانے پینے کا ایک مضمون ہے اور اس سے ہمیں شوق نہیں۔

(۳۴)

۱۱ مئی ۱۹۵۲ء

گزشتہ اتوار کو تمہیں اس لئے نہیں لکھا کہ تمہارے خط کا انتظار تھا اور وہ خط منگل کے دن پہنچا۔ جی چاہا کہ تمہیں تار پھر بھیجوں اس لئے کہ ہر وقت خیال اُدھر لگا رہتا ہے۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ آجکل وہاں موسم اتنا گرم اور ناخوشگوار ہوگا کہ محض جیتے رہنا ہی بڑا کارنامہ

---

[1] صوبہ سرحد کے ارباب سکندر خاں [2] نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔

معلوم ہوتا ہوگا۔ درجۂ حرارت کے اعتبار سے ہمارا شہر قریب قریب اوّل نمبر پر ہے لیکن یہاں کی راتوں سے اس کی کچھ تلافی ہو جاتی ہے۔ یہاں دن میں بھی زیادہ گرمی اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ ہوا چلتی رہتی ہے لیکن بدقسمتی سے ہوا کے معنی ریت اور گرد و غبار کے بھی ہیں۔ مانو یا نہ مانو میں دن میں چار مرتبہ نہاتا ہوں لیکن پھر بھی چند منٹ کے علاوہ صفائی کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تمہارے پاس چند باوفا لوگ ابھی باقی ہیں۔ اپنے آس پاس تو اتنے بھی نہیں۔ جو ہیں وہ دُور فاصلوں پر ہیں اور اپنی دُوری قائم رکھتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی قطعی اجنبی لوگوں سے دوستی اور خلوص کا کوئی نہ کوئی پیغام یہاں پہنچ جاتا ہے اور اطمینان ہوتا ہے کہ دُنیا نے ہمیں بالکل فراموش نہیں کیا۔

تمہارے عورتوں اور بچّوں کے صفحے کے لئے کچھ تجاویز بہت دن ہوئے تمہیں بھیج چکا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ عورتوں کے صفحے میں بلکہ سارے اخبار میں ایک چیز کی کمی ہے اور وہ ہے حقائق اور اعداد و شمار کا عنصر۔ امریکنوں کو اور کچھ بھی کہیں اس ایک کام میں انہیں کمال حاصل ہے اور اس بارے میں اُن سے بہت کچھ سیکھنا چاہیئے۔ حقائق سے زیادہ وزنی کوئی دلیل نہیں اور حقائق کے بغیر بہت ہی عالمانہ استدلال بھی کھوکھلا معلوم ہوتا ہے۔ تو میری تجویز یہ ہے، عورتوں کی معاشرتی زندگی کے کسی ایک پہلو کو لے لو۔ مثلاً صحت۔ اس مسئلے کے عام پہلو یہ ہیں، صوبے کی کُل زنانہ آبادی کے اعداد و شُمار۔ یہ مردم شماری کی نئی رپورٹ میں سے مل سکتے ہیں یا گزشتہ رپورٹ کی بنا پر ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ دیکھو کہ صوبے میں بیمار عورتوں کے لیئے ہسپتالوں میں کُل کتنے پلنگ ہیں۔ لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد کتنی ہے۔ دائیوں نرسوں اور زیرِ تربیت طبّی عملے کی تعداد کیا ہے۔ یہ سب اعداد و شمار محکمۂ صحت سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ پھر ان سہولتوں کو کُل آبادی پر تقسیم کرو تو غالباً یہ پتہ چلے گا کہ بیس ہزار عورتوں کے حصّے میں ایک پلنگ آتا ہے اور ایک لیڈی ڈاکٹر غالباً اس سے بھی زیادہ تعداد کی دیکھ بھال

کرتی ہے۔ اس کے بعد اُس عام مسئلے کا کوئی خصوصی پہلو لیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک دو عام بیماریوں کو لے لو جیسے تپِ دق یا زچگی۔ اسی طرح کسی خاص علاقے کا اِنتخاب کرلو جو اوسط علاقہ قرار دیا جاسکے۔ جیسے لاہور یا آس پاس کے کسی ضلعے کے اعداد و شمار حاصل کرلو۔ تپ دق کے مریضوں کے لیے کتنے ڈاکٹر نرسیں اور پلنگ موجود ہیں۔ اس کا پتہ آسانی سے چل سکتا ہے۔ مریضوں کی ماہانہ یا سالانہ تعداد بھی دریافت کی جاسکتی ہے۔ پھر یہ دیکھو کہ تپ دِق کے ایک مریض کے علاج پر اوسط خرچ کتنا آتا ہے اور اُن طبقوں کے گھریلو بجٹ میں جو اس مرض سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس خرچ کے لیے کتنی گنجائش نکلتی ہے۔ اِسی طرح کارپوریشن کے دفتر سے روزانہ ولادت کے اعداد و شمار مل سکتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتنے نومولود اور کتنی زچائیں طبّی امداد سے محروم رہتی ہیں۔ اِسی طریقے سے تعلیم کے مسئلے پر بحث کی جاسکتی ہے۔ ناخواندہ عورتوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور پھر اُس تعداد کا مقابلہ اُن نمائشی سرگرمیوں سے کیا جاسکتا ہے جن کا اِشتہار اپوا یا اِسی قسم کی تنظیمیں دیتی رہتی ہیں۔ لیکن شاید بالغ ناخواندگی کا مسئلہ ایسا اہم نہیں۔ زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ تعلیمی سہولتوں کی کمی کی وجہ سے ہم ہر نسل کے کتنے حصّے کو جہالت اور ناخواندگی پر مجبور کرتے ہیں۔ شہر میں بچیوں کی کُل آبادی کا اندازہ کرو اور پھر شہر کے لڑکیوں کے تمام اسکولوں میں جتنی گنجائش ہے اُس سے مقابلہ کرو، غالباً یہی ثابت ہوگا کہ دس فیصدی سے زیادہ بچیوں کے لئے کوئی تعلیمی سہولت موجود نہیں۔ اسکے علاوہ سرکاری مدارس کی حالت زار کا بیان بھی کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً بدیہ لاہور کے پرائمری اسکول میں جہاں جون کی دھوپ میں بچیاں بغیر کسی سائے کے تپتے ہوئے فرش پر بیٹھ کر پڑھتی ہیں اُستانی کی نشست کے لئے چند اینٹوں کا ڈھیر رکھا ہے اور متفرق اخراجات کے لئے صدر معلّمہ کو آٹھ آنے ماہانہ کی شاہانہ رقم ملتی ہے۔ پھر یونیورسٹی سے یہ دریافت کیا جاسکتا ہے کہ ہر سال کتنی لڑکیاں تعلیم سے فارغ ہو کر نکلتی ہیں۔ بی اے پاس کرنے والی لڑکیوں ہی کو لے لو اور یہ دیکھو کہ اُن میں سے کتنی لڑکیاں ملازمت حاصل کر سکتی ہیں۔ اور جو دو چار پیشے لڑکیوں کیلیے

کھلے ہیں ان میں ملازمت کی کُل گنجائش کتنی ہے۔ غالباً یہی پتہ چلے گا کہ پانچ دس فیصد سے زائد گریجویٹ لڑکیوں کو کسی صورت روزگار میسّر نہیں آسکتا۔ کم تعلیم یافتہ لڑکیوں کا تو ذکر ہی کیا وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک آدمی کا کام نہیں ہے اور ایک دِن میں ہو بھی نہیں سکتا لیکن کچھ لوگ مل کر تحقیق کریں تو یہ کچھ ایسی مُشکل بات بھی نہیں۔

تمہارے بچّوں کی انجمن کے بارے میں ایک تجویز ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی معقول رہنما کی نگرانی میں ان کے لئے مقامی تعلیمی سیر و تفریح کا پروگرام بنایا جاسکے۔ میری مراد یہ ہے کہ عجائب گھر، چڑیا گھر، مُغل عمارتیں، فوج اور فضائیہ کے ادارے، میو ہسپتال، انجینئرنگ کالج وغیرہ وغیرہ دکھانے کے لئے اور ہر جگہ کے بارے میں مناسب معلومات بہم پہنچانے کے لئے کوئی پروگرام بنایا جائے۔ غالباً تھوڑی سی بھاگ دوڑ سے کسی سستی سواری کا اِنتظام بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر انتظامات کے لئے کہیں سے امداد مل سکے تو یہ بہت ہی اچھا خیال ثابت ہو سکتا ہے مٹھائی اور آئس کریم وغیرہ شامل کر لو تو اِسے کاروباری طریقے سے بھی چلایا جاسکتا ہے۔

یہاں کچھ دِن ہوئے ہمارے خاندان میں ایک اضافے کی خوشخبری سُنائی گئی۔ معلوم ہوا کہ ہماری بلّی نے پھر بچّے دیئے ہیں۔ اب کے تین ہیں، دو سفید اور ایک چتکبرا۔ بدقسمتی سے مجھے بلّیاں بالکل پسند نہیں (اِنسانی ہوں یا حیوانی) لیکن میرے ساتھیوں کو جو اپنی بلّیوں پر جان دیتے ہیں ہماری یہ عدم دلچسپی بہت بُری لگتی ہے۔

٢٠ مئی ١٩٥٢ء (٣٥)

کل تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لئے دفتر میں تار بھجوایا ہی تھا کہ تمہارا خط آگیا اس لئے میں نے واپس منگوا لیا۔ یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تمہاری طبیعت اب پہلے کے مقابلے میں اچھی اور بہتر ہوگئی ہے اور کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ میرا ہمیشہ سے کہنا ہے کہ صحت کے معاملے میں ایک پائی کی بچت کرنے سے بیشتر ایک اشرفی کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم جیسے غریب لوگوں کو پائی پائی کا حساب رکھنا پڑتا ہے لیکن اِسی سبب سے ہمیں اور بھی زیادہ احتیاط کرنی

چاہیئے ورنہ اس کفایت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اب ہم تھوڑے بہت نیم حکیم ہو چلے ہیں اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ وٹامن بی کی کمی خوراک میں کس چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ ڈاکٹر[۱] سلزر بتا سکیں گے کہ خوراک بالکل متوازن کیسے کرنا چاہیئے۔ لاہور میں چیزیں ضرور گراں ہوں گی لیکن میری کتابوں میں لکھا ہے کہ طبی طور سے متوازن اور صحت بخش غذا اُس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہونی چاہیئے جو کہ غریب لوگ عام طور سے کھاتے ہیں۔ میری مُراد بالکل مُفلس مخلوق سے نہیں۔ انہیں تو کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ مُراد مقابلتہً کم خوش حال لوگوں سے ہے۔

اچھّا ہوا کہ لاہور میں گرمی کا کچھ افاقہ ہو گیا لیکن ابھی بدتر موسم کے دن بھی آئیں گے اس لئے جب تم میں سکت نہ رہے تو کچھ دنوں کے لئے پہاڑ پہ چلی جانا۔ بہتر یہ ہے کہ جون کے وسط یا اخیر تک انتظار کرو تاکہ واپسی پر برسات شروع ہو چکی ہو۔ اگرچہ ان دنوں میں بھی بعض اوقات موسم کافی ناخوشگوار ہو جاتا ہے۔ لیکن اوّل تو ایسا موسم تھوڑے دنوں کے لئے آتا ہے اور دوسرے سردیوں کی قربت کے خیال سے ہمت بندھی رہتی ہے۔

ہمارے ہاں تفریح کے سامان قطعی ناپید بھی نہیں چنانچہ اگلے دن ہم نے ایک فلم بھی دیکھی۔ خیر فلم نہ سہی چھوٹی چھوٹی فلموں کا ایک مجموعہ سہی بڈایبٹ[۲] اور کاسٹیلو کی مختصر مزاحیہ فلمیں تھیں۔ مَیں نے جیل سے باہر انہیں کبھی نہیں دیکھا اور نہ غالباً پھر کبھی دیکھنا ہو گا۔ لیکن یہاں یہ فلمیں فن کا حرفِ آخر معلوم ہوتی ہیں۔ کسی مہرباں[۳] نے یہ فلمیں اور پروجیکٹر جیل میں بھجوایا تھا اور جیل کے حکّام نے کمال مہربانی سے ہمیں دیکھنے کی اجازت دے دی۔ بہت ہی زوردار تماشہ تھا اور ہم سے وعدہ ہوا کہ پھر بھی دکھایا جائے گا۔

نذیر[۴] سے مقدمے بازی کے لئے یہ ہے کہ میرا براہِ راست انہیں لکھنا تو شاید ٹھیک نہ ہو لیکن قاسمی[۵] سے کہدو کہ اس معاملے کا تصفیہ ہو سکے تو اچھّا ہے اور وہ نذیر سے کہدیں کہ اگر انہیں

۱؎ لاہور کے ایک ممتاز ڈاکٹر ۲؎ فلم اسٹاروں کی مستقل جوڑی
۳؎ رئیس بھرگری کی بیگم ۴؎ نقشِ فریادی کے ناشر ۵؎ احمد ندیم قاسمی

تصفیہ مطلوب ہو تو شرائط یہ ہیں۔

(۱) پانچواں ایڈیشن جو بلا اجازت چھپا ہے اُس کی پُوری رائلٹی بیس فیصد کے حساب سے نقد ادا کی جائے اور کوئی تیسرا شخص مثلاً قاسمی صاحب تعدادِ اشاعت کی تصدیق کریں۔

(۲) کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کے لئے دوسو روپے تاوان۔

(۳) مقدمے کا خرچ۔

میرے خیال میں یہ کوئی سخت شرائط نہیں ہیں اور چوتھے ایڈیشن کے بارے میں مجھے کسی مطالبہ کی خواہش نہیں ہے۔ چنانچہ اگر وہ معاملہ ختم کرنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ چلتا رہے۔ ہمارا دونوں طرح سے کوئی خاص نقصان نہیں ہے۔

مَیں نے دوبارہ پُرانی رفتار سے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ سَب چیزیں تمہیں نہیں بھجوا سکتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ پیسے ہم اپنے سفر خرچ کے لئے بچا رکھتے ہیں جب ہم دُنیا کا دورہ کرنے جائیں گے۔

۲۳ مئی ۱۹۵۲ء (۳۶)

تمہارے دو خط ملے۔ ایک آج اور دوسرا ایک دِن پہلے۔ دوسرا خط پڑھ کر خاص طور سے خوشی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ نوجوان حسیناؤں کی صف سے ہمارے مدّاح کب کے رُخصت ہو چکے ہوں گے۔ اِن میں تو اپنا چرچا اُس زمانے میں تھا جب ہم شعر میں عاشقانہ رونا دھونا کیا کرتے تھے۔ اگر انہیں ہمارا کلام اَب بھی پسند ہے تو اس کا مطلب ہے کہ نئی نسل ایسی کم عقل نہیں جیسا کہ ہم سمجھتے تھے۔ اور انہیں بالغ زندگی کے وسیع تر اور عمیق تر جذبات کا شعور بھی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اور زیادہ خوش کُن ایک عام آدمی کی رائے ہے جو تم نے بیان کی ہے۔ اس لئے کہ اپنے ذاتی سکونِ خاطر کے علاوہ رائے عامہ کا تعلق اس حقیقت سے بھی ہے جس سے ہمارا مستقبل وابستہ ہے۔ اس وقت یہ تعلّق شاید دُور کی بات معلوم ہو لیکن دراصل یہ دُور کی بات نہیں، بالکل فوری اور سامنے کی حقیقت ہے اس لئے خاطر جمع رکھو۔

مجھے پورا اتفاق ہے کہ اپنے کام سے کسی صورت جی چُرانا نہیں چاہیئے اور کام میں اپنا دل مضبوط رکھنے سے لے کر گھر کی صفائی تک سَبْ کچھ شامل ہے۔ آجکل اس بارے میں شاید ہم اپنا POETIC LICENCE کچھ زیادہ استعمال کرنے لگے ہیں لیکن آجکل اپنے پاس اس کا جواز بھی ہے، وہ یہ کہ میں لگاتار لکھ رہا ہوں۔ شاید زیادہ نہیں لکھا جا رہا ہے لیکن نہ لکھنے سے بہرحال بہتر ہے۔ پھر اپنی مرضی یا ارادے سے تو شعر لکھا نہیں جاتا۔ بعض اوقات دو چار مصرعے صاف کرنے میں کئی دِن لگ جاتے ہیں اور جَبْ تک سَبْ دماغی کام رُکا رہتا ہے۔ غالباً یہ دِقّت ہم جیسے دوسرے دَرجے کے لکھنے والوں ہی کو پیش آتی ہے اس لئے کہ ہمارے "اوزانِ ہنر" ناقص اور ناتسلّی بخش ہیں۔ لیکن خیر۔ احمد راہی کو سویرا کے لئے دو نظمیں بھیجی ہیں۔ عبداللہ ملک سے اُن کی نقل منگوا لینا۔ دوبارہ نقل کرنا بہت بور کام ہے۔ دو اور نظمیں[1] تیار ہیں جو ایک آدھ دن میں تمہیں بھیج دوں گا۔ چنانچہ ہم اِتنے بیکار بھی نہیں جتنا کہ تم سمجھتی ہو۔

مقدمے کا حوال یہ ہیں کہ اگلے ہفتے میں کسی دِن ہمارے وکلائے صَفائی کی باری آئے گی۔ اس لئے غالباً تین ماہ تک یہ قِصّہ تمام ہوگا۔ اس سے زیادہ تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔ اس گرمی میں تمہارے یہاں آنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بارشیں شروع ہو جائیں اور سفر کچھ زیادہ قابلِ برداشت ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔ غالباً یہ عید کے بعد ہی ہو سکے گا لیکن شاید تمہیں عید کے لئے مزید دفتری کام درپیش ہو گا۔ اس لئے جب تک یہ خیال ملتوی رکھو۔ ہاں عید سے خیال آیا کہ ہمارے قومی میلوں اور تہواروں کے سوال پر تم لوگ بحث کیوں نہیں اُٹھاتے۔ مغلوں نے یہ کام اِنتہائی خوبی اور سلیقے سے کیا تھا۔ ان کے طفیل تہواروں کے بارے میں سَبْ معلومات کتبِ تاریخ میں موجود ہیں۔ کرنا صرف یہ ہے کہ پہلے دو تین مرکز

---

[1] "دو عشق" اور ایک اور نظم

چُن لئے جائیں جیسے راوی کا کنارا ہے، جہانگیر کا مقبرہ ہے، شاہی قلعہ ہے یا منٹو پارک ہے۔ پھر ہر مرکز کے لئے تفصیلی پروگرام مرتب کیا جائے یعنی قوّالیاں، جشنِ موسیقی، پھلوں اور پھولوں کی نمائش، بچّوں کے کھیل وغیرہ وغیرہ۔ تفریح کے روایتی اور جدید سامان بہم کئے جائیں۔ لطیف کی تاریخِ لاہور سے کافی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ آجکل جب لوگوں کے پیٹ میں کھانے کو نہیں میلوں ٹھیلوں کا ذکر شاید عجیب معلوم ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسی سبب سے ان کی زندگی میں رنگ و رونق کے کچھ اسباب پیدا کرنا اور بھی ضروری ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ سب کچھ کرے گا کون تو اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔

میں خیر و عافیت سے ہوں۔ یہاں گرمی تو ہے لیکن کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ آج ایک مہربان آئے تھے اور بیس نئے پاجامے دے گئے ہیں اس لئے کپڑوں کے بارے میں فی الحال سوچنے کی ضرورت نہیں۔

۲۶ مئی ۱۹۵۲ء (۳۷)

تمہارا خط ملا۔ مجھے افسوس ہے میرے گزشتہ خط نے تمہیں اِنتظار میں رکھا۔ یہ کوئی تعزیری کارروائی نہیں تھی۔ آجکل موسم ہی ایسا ہے کہ ہر طرح کا ذہنی کام مُشکل معلوم ہوتا ہے، دن کے بیشتر حصّے میں تو یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ ہم ذی شعور اِنسان ہیں۔ دن بالکل خواب کی طرح چڑھتا ہے اور ڈھلتا ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ گرمی بھنگ کا ایک ایسا تند و تیز پیالہ ہے جس نے تن اور ذہن کے باہمی رشتے کاٹ دئیے ہیں اور یہ دونوں اُکتاتے ہوئے لہجے میں ایک مُستقل تکرار کرتے رہتے ہیں۔ صرف چھٹّی کا دن ایسا آتا ہے جب بہت سویرے کچھ سوچنے کی اور شعوری طور سے کچھ کرنے کی مہلت ملتی ہے، یہ دن نکل جائے تو اگلی تعطیل کا دن آنے تک بے حسی کی زنجیر میں سے کوئی حلقہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ خیر اس میں تھوڑا سا مبالغہ بھی ہے لیکن بُنیادی طور سے صورتِ حال یہی ہے۔ لیکن اس اُکتاہٹ اور بے حسی کے عالم میں نہ بے مہریٔ ایام اور اپنے اِحساسِ زیاں میں کمی واقع ہوتی ہے نہ اپنے امید و ایمان میں فرق آتا ہے پھر کبھی کبھی اپنے

پیاروں کی یاد آبشار کی طرح دِل پہ گرتی ہے' آنے والے دنوں کے تصوّرات اپنی اپنی قوس قزح لیکر آتے ہیں اور اس آبشار میں ہزار طرح کے رنگ جھلملانے لگتے ہیں۔

افسردگی کے عالم میں غالباً ہر جگہ زندگی ایسی ہی دکھائی دیتی ہوگی لیکن اپنے سود و زیاں کا حساب اور کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ یوں تو سارے جہاں کا دَرد بہر حال اپنے دَرد میں شامل رہتا ہے اور زندگی کے ہر لمحے میں اس کا سامنا رہتا ہے لیکن اگر آدمی آزاد ہو تو اس دَرد کے مقابلے میں خود کو بے دست و پا محسوس نہیں کرتا اور اُس کے خلاف بہت آن بان کے ساتھ لڑ بھی سکتا ہے۔ اور اس جنگ میں اپنی ذاتی مسرّت ـــ وہ مسرّت جو محبوب رشتے مُہیا کرتی ہے ـــ ہمّت اور قوّتِ بازو مہیّا کرتی ہے، چھوڑو ہم نے پھر لیکچر شروع کر دیا۔

اپنے پُرانے دوست کی علالت کا سُن کر بہُت رنج ہوا۔ اُنہیں میرا بہت سا پیار پہنچا دینا اور اُن کی صحت کے بارے میں مجھے اِطلاع کرتی رہنا۔ غالباً اب تک ان کا مرض تشخیص ہو چکا ہوگا۔ امتیاز[1] (نواب زادہ) آج آئے تھے اور غالباً تمہیں بتائیں گے کہ ہمارے بالوں کے علاوہ جو بہت سرعت سے سفید اور غائب ہو رہے ہیں ہمارا باقی ماندہ وجود ابھی تک صحیح سالم ہے۔ بڑھاپے کا ذکر آیا تو ہمیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ آمنہ بہن کا سر ہم سے بھی زیادہ سفید ہو چلا ہے اس لئے یہ کچھ ایسی بات نہیں۔ تمہیں شاید یہ قصّہ میں نے سُنایا تھا کہ گزشتہ بار جب میرا سیالکوٹ جانا ہوا تو ایک پُرانے اسکول کے ہم جماعت سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُس سے کہا چلو ذرا اپنے محلّے کا ایک "چکر" کر آئیں۔ وہ کہنے لگے "تو پھر بہت سے کھلونے ساتھ لے چلو"۔ پوچھا "وہ کس لئے؟" کہنے لگے "اَب وہ سَب نانیاں، دادیاں ہو گئی ہیں"۔ امّاں اور ہماری گانے والی دوستوں کی مُلاقات کا حال پڑھ کر بہُت ہنسی آئی۔ برنارڈ شا کے کسی ڈرامے کا سین ہوگا۔ بہت لُطف رہا ہوگا۔ اس بارے میں ہمیں کچھ اور لکھو۔ سہروردی[2] لاہور میں ہیں اور آجکل میں آنے والے

۱؎ لیاقت علی خاں مرحوم کے رشتے کے بھائی نوابزادہ امتیاز علی خاں

۲؎ حسین شہید سہروردی مرحوم جنہوں نے فیض کی وکالت کی۔

ہوں گے۔ اگر میرا پیغام مِل گیا ہے تو جو کتابیں میں نے مانگی ہیں وہ اِن کے ہاتھ بھجوا دو۔ اُمید ہے کہ سویرا والوں نے میری خرافات کا کچھ معاوضہ تمہیں بھجوا دیا ہوگا۔ تمہارے لیئے ایک قمیص کی قیمت تو نکل ہی آئے گی۔

مجھے افسوس ہے کہ تمہارے اخبار کے لئے کچھ اور "خیالاتِ زرّیں" نہیں بھیج سکا۔ جو موضوعات میں نے لکھے تھے وہ فوری طور سے لکھنے کے نہیں تھے۔ مقصد یہ تھا کہ تمہارے رفیقِ کار اُن پر کام شروع کر دیں اور کچھ مسالہ جمع ہو جائے تو لکھنا شروع کر دیں۔ جہاں تک افسانوں اور فیچروں کا تعلّق ہے تم لوگ مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ مثال کے طور پر ایک گھریلو کہانی کا موضوع میں نے تمہیں بتایا تھا۔ یعنی ایک بیگم صاحبہ اپنے ملازموں کو بہت سی باتوں پر ڈانٹتی رہتی ہیں۔ ملازم کھانے کے وقت بغیر اطلاع کے غائب ہو جاتے ہیں۔ کمروں میں روشنی کھلی چھوڑ جاتے ہیں، کمروں کی صفائی ٹھیک سے نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ اور ہر بار ثابت یہ ہوتا ہے کہ قصور ملازموں کا نہیں بیگم کے شوہر نامدار کا ہے۔ ایسی ہی کہانی اُلٹ کر بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ صاحب جس بات پر اپنے ملازموں پر گرجتے ہیں اس میں خطا بیگم صاحبہ کی نکلتی ہے۔ ایک کہانی کسی روزے دار میاں بیوی کے بارے میں بھی بن سکتی ہے جو عام طور سے کھانے پینے کے انتظامات میں ذرا سی بھی دلچسپی نہیں لیتے لیکن رمضان کے آتے ہی صبح سے شام تک سحری افطار کی تفصیلات کے سوا دوسری بات ہی نہیں کرتے۔

(۳۸)

۲ جون ۱۹۵۲ء

پچھلے کچھ دنوں سے آندھی، جھکّڑ اور وہ طوفان بپا ہے کہ خدا کی پناہ۔ یہ کمبخت جگہ پل بھر میں اتنی ریت اور مٹّی ہوا میں بکھرتی ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ میں غسل خانے میں سے نہا دھو کے نکلتا ہوں تو اپنے کمرے میں پہنچنے تک سارے بال دھول میں اَٹ جاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ہاتھ پاؤں پر پسی ہوئی چٹان چھڑک دی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ نہانے دھونے کا خیال دل سے نکال دیں اور اپنے سندھی دوستوں کی طرح اسی گرد و غبار میں لوٹتے رہیں۔ لیکن یہ

ہو نہیں پاتا چنانچہ میں دن میں کوئی دس بارہ مرتبہ نہاتا ہوں۔ تین چار بار کپڑے بدلتا ہوں اور عود وصندل سے معطر ہو کر یوں محسوس کرتا ہوں جیسے دُنیا کی بادشاہت اپنی ہے اور پھر گرمی اور مٹی اور جیل کی دیواریں ــــ لمحہ بھر کے لئے ہم ان سب کو جہنم واصل کر دیتے ہیں۔ اِس سے تم لوگوں کی بپتا پہ طنز کرنا مقصود نہیں۔ تم لوگوں پہ کیا بیت رہی ہوگی میں جانتا ہوں۔ لاہور کا درجۂ حرارت اخبار میں دیکھتا ہوں تو دل دُکھتا ہے۔ پھر میں تصوّر کرتا ہوں کہ تنور کے سے دفتر میں تمہارا پسینہ بہہ رہا ہوگا۔ بچّے دوپہر کی دُھوپ میں پیدل گھر آ رہے ہوں گے اور لمبی تپتی ہوئی شامیں ایک بوجھ کی طرح تن بدن کو کُچل رہی ہوں گی۔ مجھے اُن سب تقاضوں کا احساس ہے جو تمہاری اکیلی جان سے کئے جا رہے ہیں جن سے نہ نجات کی کوئی فوری صورت ہے اور نہ آرام جسم و جان کی۔ صرف مشقت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جس کا نہ صلہ ہے نہ معاوضہ۔ میں یہ سب کچھ جانتا ہوں اور تمہاری دلجوئی کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں بجز اس کے کہ ہر سفر کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتا ہے اور اگر زندگی باقی ہے تو مستقبل بھی باقی ہے۔

تم نے اخبار میں دیکھ لیا ہوگا کہ اِستغاثے والے اپنی کتھا بیان کر چکے ہیں اور کل سے ہماری باری ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اِس دَور کا آخری چکّر آ پہنچا اور آگے جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آج دِل اِتنا خوش کیوں ہے۔ بالکل ہماری میزو کی طرح جو کبھی کبھی بے وجہ ٹھٹھے لگانے لگتی ہے۔ یہ احمقانہ اور بے وجہ ہنسی کے دورے ہم دونوں میں مشترک ہیں لیکن اَب یہ دورہ مجھے بہت کم پڑتا ہے اور یوں بھی ہماری بزرگی اور بڑھاپے کے شایانِ شان نہیں۔

تمہارے آنے کے بارے میں پچھلے خط میں کچھ لکھ چکا ہوں۔ یہ موسم یقیناً سیر و تماشے کا موسم نہیں ہے۔ غالباً دو چار ہفتوں کے بعد گرد و غبار بیٹھ جائے گا، اور آسمانوں سے آگ برسنا کم ہو جائے گی۔ شاید طفیلؔ[1] اور سرورؔ[2] جولائی میں آئیں گے۔

[1،2] فیضؔ کے بھائی طفیل احمد خاں اور اُن کی بیگم

تب طے کرلیں گے۔ کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔ افتی[1] لاہور جاتے ہوئے یہاں رُکے تھے۔ شاید تم سے مل چکے ہوں۔ اَب کے وہ پہلے سے کہیں زیادہ پریشان صورت پراگندہ مُو اور مصیبت زدہ نظر آئے۔ دیکھ کر بہت دُکھ ہُوا۔ انہوں نے اپنی جان کے لیے جو عذاب مول لے رکھے ہیں وہ دو چار دس دن کی بات ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن مستقل طور سے کوئی ایسے بسر نہیں کرسکتا۔ قطعی ضروری ہے کہ کچھ دنوں کے لئے اب وہ نچلے بیٹھیں اور آرام کریں۔ رضیہ نے کچھ کتابیں اور بعض پُرانے دوستوں کے پیغامات بھجوائے ہیں جن سے اُن کی موسیقی کی اور دوسری محفلوں میں ملاقات ہوئی تھی۔ شاید میں نے تمہیں لکھا تھا کہ رشیدہ[2] کے بارے میں محمود[3] کا ایک بہت ہی طول خط آیا تھا۔ ایسے مایوس کُن لہجے میں لکھا تھا جیسے اَب کوئی اُمید باقی نہیں رہی۔

(۳۹) ۶ جون ۱۹۵۲ء

گرمی کی ایک لہر گزر چکی ہے اَور پچھلے تین چار دن سے موسم خاصا گوارا ہے۔ آجکل رات کو چاند نکلتا ہے جب جیل کی دیواریں محو ہو جاتی ہیں میرے برآمدے کے فرش پر چاندنی کی لہروں میں ریشمی سائے لہراتے ہیں اور درختوں اور ہوا کی سرسراہٹ سے کوہساروں میں بہتے ہوئے ندی نالوں کا نغمہ ذہن میں آتا ہے۔ کل کافی رات گئے میں اپنے بستر پہ بیٹھا کشمیر اور شملے کی راتیں یاد کر رہا تھا اور دل کسی صورت یہ ماننے پہ راضی نہ تھا کہ یہ جیل خانہ ہے اور جوانی کے دن نہ جانے کب کے بیت چکے۔ غالباً کوئی ایسا ہی خیال اکبر[4] خاں کے دل سے گزرا اور وہ میرے پلنگ پہ آکے بیٹھ گئے۔

"کیا اس پل زندگی بہت خوبصورت نہیں ہے؟" اکبر خاں نے پوچھا۔

---

[1] میاں افتخار الدین مرحوم [2] ڈاکٹر رشید جہاں، افسانہ نگار اور سماجی کارکن
[3] صاحبزادہ محمود الظفر، رشید جہاں کے شوہر [4] سابق میجر جنرل

"ہاں ہے" میں نے جواب دیا

پھر دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ یہ حُسن جسے زندگی کبھی کبھی بے نقاب کرتی ہے کیسی عشوہ طراز اور کیسی سیماب صفت چیز ہے اور زندگی اسے آشکار کرنے کے لئے کیسے عجیب و غریب لمحے اور کیسے عجیب و غریب مقامات انتخاب کرتی ہے بعینہٖ ہمارے قدیمی محلّوں کی کسی پردہ نشین حسینہ کی طرح۔ اور شاید اسی وجہ کے اس حسن سے لَو لگائے رکھنا اچھّا لگتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے گزشتہ بار اپنی نظمیں تمہیں براہ راست نہیں بھیجیں آئندہ ایسا ہی کروں گا۔ ۔۔۔۔۔ [1] کے بارے میں تمہاری رائے مجھے معلوم ہے اور مجھے اس سے کچھ زیادہ اختلاف بھی نہیں لیکن ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بہت سے زاویے ایسے ہوتے ہیں جنھیں پیشِ نظر رکھنا چاہیئے، اُن پر فوری طور سے سفید و سیاہ کا حُکم لگا دینا ٹھیک نہیں۔ ان ہی صاحب کی مثال لے لو۔ وہ جیسے ہیں، ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ایک زمانے میں بہت سے اچھے لکھنے والوں کو عوام سے روشناس کروانے اور انہیں روزی بہم پہنچانے میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔ اور جب ان سے بہتر لوگ تحریک کا ساتھ چھوڑ گئے تھے تو یہ اپنے ساتھ رہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں ان کا تجارتی مفاد بھی تھا اور بعض اوقات انہوں نے لوگوں کی احتیاج سے فائدہ بھی اُٹھایا لیکن یہ تصویر کا ایک رُخ ہے اور اس سے تصویر کے دوسرے رُخ کی نفی نہیں ہوتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے حق و ناحق کے DOWN RIGHT فلسفے میں اس طرح کی موشگافیوں کی گنجائش نہیں ہے لیکن تمہیں اس نسبتاً کمزور مخلوق کو بھی برداشت کر لینا چاہیئے جو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔

---

[1] نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔

(۴۰)

۱۴ جون ۱۹۵۲ء

میں نے کسی خط میں اُن ذہنی رکاوٹوں کا ذکر کیا تھا جن کی وجہ سے آجکل کے موسم میں چھٹی کے دن کے علاوہ خط لکھنا مشکل ہو جاتا ہے اس لئے پھر وہی پرانا پروگرام اختیار کر رہا ہوں۔ علاوہ ازیں اس ہفتے میں قطعی کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں ہوا (اگرچہ یہاں کوئی بھی واقعہ سنسنی خیز نہیں ہوتا) اب موسم ذرا بہتر ہوا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گزشتہ چند دِن ہم عالمِ خواب میں تھے اور یہ خط لکھنے کے لئے ابھی ابھی سو کر اُٹھے ہیں۔ اِسے بھی جیل کی زندگی کے ذہنی سلسلے کی ایک کڑی سمجھ لو۔ شوق و آرزو، فرحت اور سرخوشی، بوریت اور بے حسی اور مکمل ذہنی بیداری کے بعد یکایک ذہنی خلا کے ایسے دِن آجاتے ہیں جن کی کیفیت مہاتما بدھ کے نروان سے ملتی جلتی ہے۔ جب یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنی ہستی مایا کے جال سے چھوٹ چکی ہے اور اپنی ذات روحِ کائنات کے موہوم نابینا اور بے شعور وجود میں جذب ہو گئی ہے۔ بدقسمتی سے میرا مزاج صوفیانہ نہیں ہے۔ اس لئے میں اس عالمِ مدہوشی سے زیادہ دیر لطف اندوز نہیں ہو سکتا، لیکن کبھی کبھار اس بے خواب خوابناکی کے لمحے آہی جاتے ہیں۔

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تمہیں گرمی سے کچھ نجات ملی ہے لیکن ابھی تو تین خوفناک مہینے اور باقی ہیں۔ لیکن سب سے بُرے دن شروع ہی کے دن ہوتے ہیں اور اگر اتنی جلد ان میں افاقے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو غنیمت جاننا چاہئے۔

(۴۱)

۲۱ جون ۱۹۵۲ء

لاہور کے موسم کی خبروں سے کچھ تشویش رہتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم سب لوگ خیریت سے ہوگے۔ ذرا جلد اطلاع دینا۔ اِس موسم میں جب تپتے ہوئے دفتر سے تمہارے بائیسکل پر اپنے گھر آنے کا سوچتا ہوں تو اس خیال سے بچنے کے لئے زور سے آنکھیں میچ لیتا ہوں۔ اگر تم اتنا لکھ دو کہ ایک آدھ مہینے کے لئے تم نے سائیکل چلانا بند کر دیا ہے تو کچھ

اطمینان ہوگا۔ اس میں کچھ خرچ تو بڑھ جائے گا لیکن ایسا بھی کیا خرچ ہوگا۔ وعدہ ہے کہ ہم یہ پیسے پورے کر دیں گے۔ میں صرف جسمانی تکلیف کا نہیں سوچ رہا ہوں اگرچہ وہ بھی اپنی جگہ صبر آزما چیز ہے مجھے زیادہ خیال اُس شگفتگی اور خوش مزاجی کا ہے جو اپنے اندر ہوتی ہے اور جسے بہت زیادہ جسمانی سختی چوس لیتی ہے۔ پھر جب کلیجہ جل بھُن کر کباب ہو جاتا ہے تو آدمی زندگی کے حسُن و خوبی سے لُطف اُٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔ مشکل سے مشکل اور تلخ سے تلخ زندگی میں بھی لُطف و انبساط کا کچھ نہ کچھ سامان بہم رہتا ہے جس سے محرومی کسی طرح برداشت نہیں کرنی چاہیئے۔ جب کاروبارِ کائنات بہت ہی نامنصفانہ اور غیر معتدل ہو تو کچھ نہ کچھ تلخی تو ضرور محسوس ہوگی لیکن اس تلخی کو اُس سرور و تحیر پر غالب آنے نہیں دینا چاہیئے جو نعمتِ زندگی کی عطا ہیں اور جن کی وساطت سے حسُنِ کائنات کے مخفی خزینے بے نقاب ہوتے رہتے ہیں۔

آجکل میں نیتشے کی کتاب THUS SPAKE ZARATHUSTRA پڑھ رہا ہوں۔ یہ کتاب پہلے میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ اگرچہ میں نیتشے کی زیادہ اہم تصنیفات کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اس کتاب میں مسخرہ پن بھی بہت ہے لیکن پیرایۂ تحریر کہیں کہیں انتہائی خوبصورت ہے۔ اگر نیتشے زندہ ہوتا تو جرمنی کے نازیوں سے یقینی لڑتا۔ اس وجہ سے کہ نازیوں نے اس کے فکر و خیال کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اور اُس کی تحریر کے اصلی خدوخال بالکل مسخ کر دیئے ہیں۔ تھا تو وہ بھی پاجی۔ لیکن بہت حساس اور شاعرانہ قسم کا۔ اس کتاب کے جو حصّے مجھے پسند آئے کسی دن تمہیں سُناؤں گا۔

---

۳۰ جون ۱۹۵۲ء (۴۲)

تمہارا خط اور تصویر دیکھ کر اطمینان ہوا۔ اگر یہ کیمرے کا کمال نہیں ہے تو تمہاری صحت بہت بہتر معلوم ہوتی ہے۔

وکیل کا معاملہ پہلے صاف کر لیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اس وقت تک انہوں نے جتنا کام کیا ہے اس کا معاوضہ انہیں مل چکا ہے۔ بہت وافر نہ سہی ایسا ناکافی بھی نہیں تھا۔ یہ ہوئی پہلی بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ باقی جو کچھ کرنے کو ہے اس کے لئے ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ یہ کام میں خود بھی کر سکتا ہوں۔ ورنہ معاوضے کے بغیر اور لوگ کرنے کو تیار ہیں۔ اگر وہ آنا چاہیں تو بسم اللہ۔ نہ آنا چاہیں تو ان کی خوشی۔

مجھے امید ہے تم اپنی عید کے کچھ احوال لکھ بھیجو گی۔ ہمارے ہاں کافی پُرتکلف چھوٹی سی پارٹی ہوئی اور نئے باورچی نے اپنے فن کے بہت سے کمالات دکھائے۔ جی چاہا کہ صرف اسی کھانے کی خاطر تم یہاں آجاؤ۔ ہمارے ساتھی ابھی تک ہونٹ چاٹ رہے ہیں۔

میرا ذہنی ٹمپریچر آجکل لاہور کے درجۂ حرارت سے ملا ہوا ہے۔ جب بھی خبر آتی ہے کہ وہاں بارش ہوئی تو دل کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ جب آندھی یا طوفان کی خبر سُنتے ہیں تو دل سے الٰہی خیر کی صدا نکلتی ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر تو کبھی توجّہ ہی نہیں جاتی لیکن تمہارے ہاں کے حالات کا مُستقل دھڑکا لگا رہتا ہے۔

لاہور سے جو لوگ عید کے لئے آئے تھے اُن سے تمہارے بچّوں کے صفحے اور بچّوں کی تقریب کی تعریف سُنی جس سے خوشی ہوئی۔ بنّے اور میں دونوں اس خیال سے کچھ گھبرانے لگے ہیں کہ جیل سے باہر آنے تک ہماری بیویاں ہم سے آگے نہ نکل جائیں۔ کچھ دن ہوئے رضیہ کا ایک خط آیا تھا جو سراسر شعر معلوم ہوتا ہے۔ لکھا تھا: "کسی دن جب آنے والی

---

* توسین میں رضیہ سجّاد ظہیر کے اُس خط کا مفہوم دیا گیا ہے جو موصوفہ نے سجّاد ظہیر کو اُردو میں لکھا تھا۔ اور توسین کا حصّہ ترجمہ ہے انگریزی کے اُس خط کا جو فیضؔ نے ایلس کو بھیجا تھا۔ مطلب دونوں کا ایک ہے البتہ الفاظ میں ضرور فرق ہوگا کیونکہ اس کا اُردو سے انگریزی میں اور پھر انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

نسلیں تم لوگوں کی باتیں کریں گی تو نہ جانے انہیں کبھی میرا اور ایلیس کا بھی خیال آئے گا؟ ہم نے پورا راستہ تمہارا ساتھ دیا ہے۔ تم ایک قدم آگے اور ہم ایک قدم پیچھے۔ تم مُڑ مُڑ کر تسلّی کے لئے ہماری طرف دیکھتے رہے اور ہم جواب میں تمہاری طرف مُسکراتے رہے۔ اگرچہ ہمارے دل دَرد سے چلا رہے تھے"! کل رات ہم نے مشاعرہ کیا۔ عید کے تحفے کے طور پر چند شعر[1] تمہیں بھیج رہا ہوں۔ کوئی کمال کی چیز نہیں ہے۔ تفریح کا سامان ہی سہی۔

(۴۳)

۹ جولائی ۱۹۵۲ء

اَب کے لکھنے میں کچھ تاخیر ہوگئی۔ چھُٹیوں کے بعد دوبارہ عَدالت میں جانے سے کچھ عجب اُکتاہٹ اَور بے چینی سی ہوتی ہے جس سے دماغی کام کے روزمرّہ پروگرام میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ بہرصورت تمہیں میرا گزشتہ خط مِل چُکا ہوگا جس کے ساتھ ایک نظم[2] بھی بھیجی تھی (دو[3] اور لکھ چُکا ہوں، غالباً اُن میں سے ایک ایسی بُری نہیں ہے) اس طرح بہت سے ادھورے کام کا بقیہ جس کا بوجھ ذہن پر تھا صاف ہوچُکا ہے۔ کچھ نامکمّل نظمیں تھیں، کچھ متفرق اشعار تھے۔ یہ سَب مکمّل ہوچکے اور اَب کوئی نئی چیز شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ لیکن اِس طرح کی تحریروں سے اپنی تسلّی نہیں ہوتی۔ بیشتر اوقات صرف مایوسی اور آزردگی کا احساس ہوتا ہے اور جو بھی لکھا ہو بہت معمولی اَور سطحی معلوم ہوتا ہے۔ ماضی میں ایسا نہیں تھا۔ اُن دنوں ہم دِل سے بہت مجبور ہو کر کبھی کبھار کچھ لکھتے تھے اور یہ اکثر کھرا مال ہوتا تھا۔ لیکن اپنے پر جبر کر کے مشق کے طور سے لکھنا بالکل دوسری چیز ہے۔ اِس میں جَذبۂ دل کبھی سَاتھ دیتا ہے کبھی نہیں دیتا۔ خیر اِس میں یہ فائدہ تو ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھا جاتا ہے اَور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا بہرطور

---

[1] کہو تو ہم بھی چلیں، فیضؔ اَب نہیں سر دار۔ وہ فرقِ مرتبۂ خاص و عام کہتے ہیں۔

[2] رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام

[3] گرانیٔ شبِ ہجراں دوچند کیا کرتے۔ اور۔ فکرِ دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں

بہتر ہے کچھ نہ لکھنے سے۔ لیکن میں اس بات کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔ میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ پنجابی میں لکھنا شروع کروں اور دیکھوں کہ اپنی مادری زبان میں کیسا لکھا جاتا ہے اردو ایسی مرصع زبان ہے کہ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اسے اپنے عوام تک پہنچانے کیلئے کس ڈھب سے لکھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جیسے پنجابی کے مخالف اس پر برہم ہوں گے لیکن زبان کے بارے میں تنگ نظری اور تعصب بہت غیر معقول بات ہے۔

تمہارا عید نمبر پڑھا تھا۔ غالباً اس کی داد بھی بھیج چکا ہوں۔ یہاں موسم کچھ ایسا بُرا نہیں ہے۔ دن میں گرد و غبار تو رہتا ہے لیکن گرمی زیادہ نہیں۔ اور راتیں کافی خوشگوار ہوتی ہیں۔ ہم خیر و عافیت سے ہیں اور باقی معاملات ایسے ہی چل رہے ہیں جیسے توقع تھی جیسے پہلے بھی لکھ چکا ہوں بہت یقین سے کسی بات کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے لیکن غالباً اب زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اپنا جی یہی چاہتا ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد یونیورسٹی میں کوئی جگہ مل جائے لیکن ہمیں دے گا کون؟ خیر خسارہ اُن ہی کا ہے۔

(۴۴)

۱۶ جولائی ۱۹۵۲ء

میں گزشتہ دونوں اتوار مسلسل لکھنے میں مصروف تھا۔ یہ سلسلہ بیچ میں توڑنے کو جی نہ چاہا۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ خیال کا سلسلہ بیچ میں ٹوٹ جائے تو پھر ٹوٹی ہوئی کڑیاں دوبارہ جوڑنے میں بہت دقّت پیش آتی ہے۔ اس ہفتے میں نے ایران اور مصر کے شہید طلبہ پر ایک نظم شروع کی ہے۔ جیل میں آنے کے بعد پہلی دفعہ اپنی کسی تخلیق سے کچھ اطمینان ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اظہار کی جس ہیئت اور پیرائے کی تلاش تھی اس نظم میں پہلی بار ہاتھ آئے ہیں۔ یہ بالکل خلاف روایت انداز ہے جس سے پرانے اساتذۂ فن ضرور خفا ہوں گے لیکن اس کی پروا کون کرتا ہے۔ اُمید ہے کہ اگلے ہفتے تک مکمل کر کے تمہیں بھیج سکوں گا۔ صوفی صاحب سے فرمائش کرنا کہ اگر انہیں پسند ہو تو اس کا فارسی میں ترجمہ کر دیں۔ تمہارا جی چاہے تو ان کی مدد سے انگریزی میں بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔

تمہارے آنے کے بارے میں یہ ہے کہ اگر بچے ساتھ آ سکتے ہیں تو تھوڑی دیر اور انتظار کر لو۔ اس پر جو زائد خرچ ہوگا وہ قطعی جائز ہے اور یوں بھی جیسے میں نے کئی بار کہا ہے تھوڑی سی فضول خرچی روحانی آسائش کے لئے بہت اچھی چیز ہے۔ غالباً یکم یا دو دسمبر کو عید پڑے گی۔ اگر سفر ملتوی ہی کرنا ہے تو بہتر یہ ہے کہ اُسی دن آؤ تاکہ ہم پورا دن ساتھ گزار سکیں۔ میزو کی سالگرہ کا بھی ایسا ہی اہم دن ہے اس لئے اُس سے بھی مشورہ کرنا ہوگا۔ لیکن غالباً دونوں تقریبیں یک جا نہیں ہو سکتیں۔ بہرحال تم اگر عید کے دن آؤ تو ہم یہ وعدہ کر سکتے ہیں کہ تمہیں ایسا کھانا کھلائیں گے جو تم نے عرصے سے نہیں کھایا ہوگا۔ سفر خرچ کے لئے کتاب کا مسودہ تمہیں بھجدوں گا لیکن اگر یہ وقت پر نہ بھی پہنچے تو اس آمدنی کی امید پر اپنی گرہ میں سے خرچ کر لینا۔

عنایت[1] کے ہاں پھر بیٹی ہوئی ہے۔ اس خبر سے ہنسی آئی۔ ہماری اماں کا اپنی سب بہوؤں سے ناک میں دم آ چکا ہوگا۔ ہر ایک نے ولادتوں کے بارے میں ایک ہی جیسا نامعقول رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ اتنی بہت سی پوتیاں ہو گئی ہیں اور پوتا ایک بھی نہیں۔ ساسوں کا ذکر آیا تو ہمارے جس دوست[2] کی بیوٹی کے بارے میں تم نے پوچھا ہے اُن کا مسئلہ وہی ہے جو اور ہزاروں لاکھوں کا ہے یعنی جائداد اور روپے پیسے کے جھگڑے۔ جب تک ذاتی ملکیت کا موجودہ نظام قائم ہے اس مسئلے کا کوئی قطعی حل تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہر ذاتی مسئلے کی طرح اس سے نپٹنے کی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اُس سے بلند و بے نیاز ہو جائے اور دوسرے یہ کہ آدمی اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔ دوسری صورت کچھ ایسی سود مند نہیں اس لئے پہلی ہی صورت کا کوئی نسخہ برتنا چاہئے، اس کی خاطر ظاہر داری، مصلحت کوشی، لجاجت، تغافل جو کچھ بھی کرنا پڑے ٹھیک ہے تاکہ اپنے اور دوسروں کے رنج و ناخوشی میں کچھ کمی ہو سکے، یہ کوئی سیدھا اور بندھا ہوا نسخہ نہیں ہے۔ جس کسی سے جیسے بھی بن پڑے ویسے کرے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی اپنی ساری توجہ

۱؎ فیض کے چھوٹے بھائی عنایت احمد خاں ۲؎ نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔

زیادہ بارآور زیادہ بامعنی اور زیادہ اہم چیزوں پر مرکوز رکھے جو ایک طرح سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما راستہ ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور راستہ موجود ہی نہیں۔

کچھ دن ہوئے آمنہ کتابوں اور سگریٹوں کا ایک پورا انبار ساتھ لائی تھیں۔ مجھے اس طرح کی نیکی کا شکریہ ادا کرنے کا بالکل ڈھنگ نہیں آتا۔ ان کی مالی حالت مجھے معلوم ہے اور ان چیزوں کی لاگت کا اندازہ کرتا ہوں تو پریشانی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی اس کا بدلہ چکا دیں گے لیکن یوں ہوتا نہیں ہے۔ اس لئے نہیں ہوتا کہ زندگی میں ایک ہی جیسے موقعے بار بار نہیں آتے۔

یہ سن کر افسوس ہوا کہ تمہارے ابّا پھر علیل ہیں۔ اگلے سال ہم یقیناً ان سے ملنے جائیں گے۔ یوں بھی آئندہ سال انگلستان جانے کے لئے مناسب ہے جب ہم ملکہ کی تاجپوشی بھی دیکھ سکیں گے اور ملکہ معظّمہ سے درخواست کریں گے کہ ہمیں بیرونیٹ (لارڈ وغیرہ) بنا دیا جائے اور ہمارے نام ایک جاگیر لکھ دی جائے جہاں ہم زندگی کے باقی ایّام علیا حضرت کی مدح و ثنا میں گزار سکیں۔

۱۷ جولائی ۱۹۵۲ء **(۴۵)**

کل رات تمہیں خط لکھا تھا۔ غالباً ابھی بھجوایا نہیں گیا۔

آج صبح میرے[۱] بھائی کی جگہ موت میری ملاقات کو آئی۔ سب لوگ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ یہ لوگ میری زندگی کی عزیز ترین متاع، مجھے دکھانے لے گئے۔ وہ متاع

۱؎ روداد قفس مندرجہ، زندان نامہ کے مطابق فیضؔ کے بڑے بھائی طفیل احمد خاں "حیدرآباد اُن (فیض) سے ملنے آئے تھے اور اپنے ایک روحانی پیشوا کی طرف سے اُن کی رہائی کی خوشخبری لائے تھے۔ ابھی حیدرآباد میں ہی تھے کہ ۱۷ جولائی ۱۹۵۲ء کی صبح کو نماز پڑھتے ہوئے اس دُنیا سے رحلت کر گئے۔" ۱؎ بیگم مجید ملک

جواب خاک ہو چکی ہے۔ اور پھر وہ اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔

میں نے اپنے غم کے غرور میں سر اونچا رکھا اور کسی کے سامنے نظر نہیں جھکائی، یہ کتنا مشکل، کتنا اذیت ناک تھا صرف میرا دل جانتا ہے۔

اب میں اپنی کوٹھری میں اپنے غم کے ساتھ تنہا ہوں۔ اب مجھے سر اونچا رکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں اس غم کے بے پناہ ظلم سے ہار مان لینے میں کوئی تذلیل نہیں ہے۔

میں اس کے بیوی بچوں اور اپنی امّاں کے خیال کو دل سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی انہیں کچھ لکھنے کی سکت بھی نہیں ہے۔ لکھ ہی کیا سکتا ہوں۔ میں نے اپنی ماں کی پہلی اولاد اُن سے چھین لی ہے۔ ہاں میں نے ہی سب کو اس کی زندگی سے محروم کر دیا ہے۔

اس وقت حواس اتنے پراگندہ ہیں کہ زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ لیکن آپ لوگ میرے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ یہ زخم بہت اچانک بہت بے سبب لگا ہے لیکن اسے سہنے کا بل مجھ میں ہے اور اس کے سامنے بھی میرا سر نہیں جھکے گا۔ صرف یہ جی چاہتا ہے کہ اس وقت میں باہر ہوتا اور اُن بیچاروں کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے سکتا جن کے تن مجھ سے زیادہ کم طاقت اور جن کا دکھ میرے غم سے زیادہ بھاری ہے۔

۲۱ جولائی ۱۹۵۲ء (۴۶)

تمہیں یہاں آنے میں تکلیف تو بہت ہوئی ہو گی لیکن بہت اچھا ہوا کہ تم آگئیں بہت سی باتوں کے بارے میں دل بہت پریشان تھا اور تمہارے آنے کے بعد کچھ تشفی ہو گئی، اب بھی کبھی کبھی جب خیال آتا ہے کہ طفیل کو پھر کبھی نہیں دیکھ سکیں گے تو دماغ سُن سا ہو جاتا ہے اور دل یہ بات ماننے پر کسی طور تیار نہیں ہوتا لیکن اب اس درد میں ہر وقت پہلے کی طرح ٹیسیں نہیں اُٹھتیں اور دل کے مجموعۂ درد میں یہ درد بھی کہیں جذب ہو گیا ہے۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ عمر بھر وقتاً فوقتاً یہ درد پہلو میں بیدار ہوتا رہے گا لیکن انسانی تعلقات کا نظام یوں ہی چلتا ہے اور

آدمی اس کے ساتھ دن بسر کرنا جلد سیکھ لیتا ہے۔ وہاں کی صورتِ حال سے مجھے اطلاع دیتی رہنا۔ میں کسی بات میں امداد تو نہیں کر سکتا ہوں لیکن تم لوگوں کی تکالیف میں شرکت کر کے ذہنی طور ہی سے سہی کم از کم یہ تو احساس ہوتا ہے کہ ہم بالکل بے تعلّق اور ناکارہ نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس مشترکہ مشکل میں تم بھی کچھ زیادہ نہیں کر سکتی ہو اس لیے کہ تم پر اپنا بوجھ بہت ہے لیکن انسانی خوشی میں جو تھوڑا بہت اضافہ اپنی شفقت یا ہمدردی کر سکتی ہے اس کی اہمیت کم نہ سمجھنا چاہیئے۔ خواہ اس کی قدر ہو یا نہ ہو اور کوئی اس کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

ایرانی طلبہ پر نظم[۲] اور جو نوحہ[۳] لکھا تھا بھیجتا ہوں یہاں ایک دوست[۴] نے اس نوحہ کے جواب میں جو اشعار لکھے تھے وہ بھی ملفوف ہیں۔

۹ اگست ۱۹۵۴ء (۴۷)

اب تک تمہیں میرا مسوّدہ پہنچ گیا ہوگا۔ یہ بالکل مکمّل نہیں ہے اس لئے کہ ابھی دو تین چیزیں باقی ہیں جو غالباً اگلے ہفتے تک مکمّل ہو جائیں گی اور جب تک یہ سب کچھ اشاعت کے لئے تیار ہو گا ممکن ہے کچھ اور بھی بھیج سکوں۔ مجھے افسوس ہے کہ مظہر[۵] کے لئے ابھی تک کچھ نہیں لکھ سکا۔ یہاں حوالے کے لئے کتابیں دستیاب نہیں ہیں اور ذہن پر بوجھ اتنا ہے کہ دل لگا کر کوئی ٹھوس چیز لکھنا مشکل ہے۔ ذہن جب بھی ذرا فارغ ہوتا ہے، میں شاعری میں لگا دیتا ہوں جو میرا اصلی کام ہے۔ اور اب لکھنے میں کچھ سہولت بھی محسوس ہونے لگی ہے۔ اب بھی ہر ولادت درد سے بالکل خالی تو نہیں ہوتی لیکن یہ عمل پہلے جیسا

۱۔ طفیل مرحوم کے گھر کی صورتِ حال ۲۔ ایرانی طلبہ کے نام۔ یہ کون سخی ہیں جن کے لہو کی اشرفیاں چھن چھن چھن چھن
۳۔ مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
۴۔ سجّاد ظہیر۔ ظلم کے پنجۂ منحوس نے بڑھتے بڑھتے۔ شجرِ زیست سے اک اور ثمر توڑ لیا۔
۵۔ مظہر علی خاں مدیر پاکستان ٹائمز

طویل اور اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا. خرابی یہ ہے کہ BLOODY PERFECTIONISM کے طعنوں سے تنگ آکر اب ہیں نے پہلے کی طرح الفاظ کو بنانے سجانے اور تراش خراش کا کام چھوڑ دیا ہے، اس لئے کبھی پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا کہ جو کچھ لکھا ہے وہ ٹھیک بھی ہے کہ نہیں یہاں کوئی ایسا نکتہ چیں بھی نہیں جو امداد کر سکے اس لئے ہمارے اُستاد[1] سے کہنا کہ ہر چیز کو ذرا احتیاط سے دیکھ لیا کریں۔

رشیدہ[2] کے ماسکو میں مرنے کی خبر کل پڑھی۔ اگر میں جیل سے باہر ہوتا تو شاید زار و قطار روتا لیکن اب تو رونے کو آنسو ہی باقی نہیں رہے ہے۔ اس حادثے کا شُن کر رونے دھونے کے بجائے دل پر عجیب مُردنی سی چھائی رہی۔ شاید اُس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب کے موت رات کے رہزن کی طرح اچانک اور بے اطلاع نہیں آئی تھی یا شاید اپنے لاشعور میں یہ خیال بھی ہو کہ مرنے والی کی بہادر روح بیکار اور بزدلانہ غم و اندوہ کو پسند نہیں کرے گی۔ جب سے اُس کی مُہلک بیماری کا سُنا تھا دل میں بہت شدّت سے تمنّا تھی کہ کاش وہ ہمارے باہر آنے تک زندہ رہے اور ہم سب ساتھ اس سے ملنے کے لئے جا سکیں۔ اُسے بچّوں سے بہت پیار تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ ہمارے بچّوں کو دیکھے گی تو کتنا خوش ہو گی۔ افسوس کہ موت کے خلاف اُس کی طویل جنگ اتنی جلد ختم ہو گئی۔ اُس کے جانے سے ہمارے برِّصغیر سے نیکی اور انسان دوستی کی بہت بڑی دولت چھن گئی اور اس کے دوستوں کی محرومی کا کیا کہیئے جن کی زندگیاں اس کے ایثار و مروّت سے اس قدر آسودہ اور مزیّن ہوئیں۔

(۴۷) ۱۴ اگست ۱۹۵۲ء

تمہارے خط سے خاندانی معاملات کے بارے میں کچھ تسکین ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم مالی طور سے طفیل کے بچّوں کا مُستقبل محفوظ ہے۔ لیکن امّاں کے بارے میں مجھے پُورا

---

[1] صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم [2] ڈاکٹر رشید جہاں

اطمینان نہیں ہے۔ اس وقت تو اچھا ہے کہ وہ سرور کے گھر میں بچوں کے پاس رہیں اور کام کاج میں ان کا دھیان بٹا رہے۔ جیسے تم نے لکھا ہے کہ ان کی محبت اور خودداری کا تقاضہ بھی یہی ہے لیکن تشویش اس وجہ سے ہے کہ کوئی بے خیالی میں ایسی بات نہ کہہ بیٹھے جس سے اُن کی خودداری کو ٹھیس پہنچے۔ تمہیں حالات بہتر معلوم ہیں۔ اگر مناسب سمجھو تو اُن سے کہہ دو کہ ہمارا گھر بھی اُن کا اپنا ہے اور وہ جب چاہیں یہاں واپس آسکتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ نہیں آئیں گی۔ لیکن کم از کم انہیں یہ بھروسہ ہونا چاہیئے کہ ان کی پذیرائی کے لیئے ایک سے زیادہ گھر موجود ہیں اور جہاں بھی وہ رہیں ان کی اپنی خوشی اور مرضی کی بات ہے۔ اس میں کسی مجبوری یا احتیاط کو دخل نہیں۔

آج تمہارا دوسرا خط ملا۔ گزشتہ چند دن پھر افسردگی کا ہلکا سا دورہ پڑا تھا جس سے آج افاقہ ہے۔ غالباً موسم کی وجہ سے۔ آجکل یہاں گرمیوں کے بجائے بہار کا سا موسم ہے۔ صبحوں میں کچھ ایسی موہوم سی ٹھنڈک اور بے چینی ہے جیسے بہار نے پہلا سانس لیا ہو، معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ میں گرمی کے بجائے صرف رنگ ہی رنگ ہے۔ شام کی ہوا سے سمندروں کی باس آتی ہے اور یوں لگتا ہے کہ آسمان جیل کی بے رنگ دیواروں کے بجائے دُور دراز ساحلوں پر ناریل کی قطاروں پر غروب ہو رہا ہے۔ اور یہ سب بہت غمناک ہے۔ ہر اُس حسُن کی طرح غمناک جو نظر میں ہو مگر بس میں نہ ہو۔ ہر اُس حسُن کی طرح جو معلوم ہو کہ محض سراب یا نظر کا دھوکہ ہے۔

۱۵ اگست:۔ کل یہاں کے منظر میں ایک انقلاب دیکھنے میں آیا۔ جیل کے دروازے پر سُرخ، سبز اور نیلی بتیوں کی لڑیاں روشن ہوئیں اور چار لاؤڈ اسپیکروں نے اپنی پھٹی ہوئی اور بے سُری آوازوں میں ریڈیو نغمے نشر کیئے۔ رنگ اور بتیاں اور شور و غُل۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم حیدرآباد جیل میں نہیں ہیں انار کلی بازار میں ہیں۔ صبح آنکھ کھُلی تو دل میں عجیب طرح کی خوشی محسوس ہوئی اور میں نے اُسی وقت بیٹھ کے لکھنا شروع کیا جو اس خط کے

ساتھ بھیج رہا ہوں۔ مجھے انتہائی تعجب ہوا کہ لکھنے میں کچھ وقت ہی نہ لگا اور ناشتے کے وقت تک میں اسے قریب قریب ختم کر چکا تھا۔ ابھی تک اس کا نشہ موجود ہے اور کچھ خدشہ محسوس ہو رہا ہے کہ شائد ہم واقعی کسی دن شاعر ہو جائیں۔

تمہارا یوم آزادی نمبر بہت اچھا ہے۔ میں نے اسے بہت ناقدانہ نظر سے دیکھا لیکن اصلاح کی کوئی گنجائش نظر نہیں آئی۔ مظہر کا اداریہ بہت اچھا تھا۔ انور کا کارٹون بھی اور برطانیہ میں پاکستانی حکومت والا طنزیہ مضمون بھی۔

میں بہت سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ تمہاری ینگ ریڈرز لیگ میں شامل ہو جاؤں تاکہ ہمیں بھی کچھ قلمی دوست میسّر آسکیں۔ یہاں بعض ساتھیوں کی ڈاک اتنی آتی ہے کہ رشک آنے لگا ہے۔

۲۳ اگست ۱۹۵۲ء (۴۸)

تمہارا ایک خط تین دن پہلے ملا تھا۔ ایک کل آیا۔ بچّوں کے خطوط اور تصویریں بھی ملیں اس لئے دل بے حد خوش ہے۔ لڑکیاں بڑی ہو گئی ہیں۔ اُن کی صورتیں دیکھ کر خواہ مخواہ مسکرانے کو جی چاہتا ہے۔ میرا مسوّدہ تمہیں مل گیا ہو گا۔ لیکن نہیں بھی ملا تو تم اب آجاؤ۔ سفر پہ جو بھی خرچ ہو گا بعد میں منہا کر لینا۔ اور عید پہ ظاہر ہے سب لوگ اچھے کپڑے پہنیں گے اس لئے تم بھی اپنا لباس فاخرہ ساتھ لے آؤ۔

امتیاز اور بنّے کے بھائی آئے تھے اور چونکہ امتیاز نے مجھ سے بھی ملنے کی درخواست دے رکھی تھی اس لئے ہم سب کی ایک ساتھ ملاقات ہوئی۔ بہت لُطف رہا۔ بنّے کے بھائی حُسین ظہیر نے ہم سب کو حیدر آباد دکن آنے کی دعوت دی۔ اس لئے ہمارے سفر کے پروگرام میں یہ شہر بھی شامل کر لو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں آدھی دُنیا کا دورہ کرنا پڑے گا

۱؎ نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں۔

اس لئے کہ ایک دعوت دہلی سے بھی آئی رکھی ہے۔ یہ حمیدہؔ سلطان کی جانب سے ہے۔ انہوں نے فرمائش کی ہے کہ ہم دلّی کی یاد میں ایک نظم لکھ دیں۔ وہ دلّی نہیں جو آجکل ہے بلکہ وہ دہلی جو کہ اب سے پہلے تھی اور جس سے ہم آشنا تھے۔ شاید کبھی لکھی جا سکے۔

اگر تمہیں میری آخری نظم مل چکی ہے تو غالباً تم نے مسوّدے میں شامل کر لی ہوگی۔ دو اور تیّار ہیں جب تم آؤگی تو ساتھ لے جانا۔ یہ دونوں کچھ طویل نظمیں نہیں ہیں اور ان سے کتاب کا مجوّزہ نقشہ مکمّل ہو جانا چاہیئے۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ کتاب کی اشاعت تک کچھ اور چیزیں بھی ہو جائیں گی۔ آجکل میں ابتدا سے اب تک کی اردو شاعری کے انتخاب پر کام کر رہا ہوں۔ ہر روز دو تین گھنٹے اس میں صرف ہوتے ہیں لیکن کام بہت لمبا ہے۔ اس کے لئے کئی مہینے درکار ہوں گے۔ اگر ختم کر سکا تو قابلِ ذکر چیز ہوگی۔ جیل خانے میں تو شاید ختم نہ ہو سکے، لیکن اگر کم دلچسپ حصّہ یہاں نپٹ جائے تو شاید بعد میں یہ کام خود بخود رواں رہے۔

امروز میں موسیقی پہ رفیق غزنوی کا مضمون اس موضوع پر شاید بہترین تحریر ہے۔ اگرچہ مجھے کچھ چھوٹے موٹے نکات سے اختلاف ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی ناشر میں سمجھ بوجھ ہو تو کچھ دوسرے اساتذہ کے تبصرے کے ساتھ اسے کتابچے کی صورت میں الگ شائع ہونا چاہیئے۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ یہ کوئی بھی نہیں کرے گا۔

۱۵ ستمبر ۱۹۵۲ء (۵۰)

تمہاری موجودگی اور بچّوں کی ہنسی کا کچھ کچھ تاثر ابھی تک فضا میں باقی ہے اور باعثِ تسکین، تمہارے جانے کے بعد کہنے کی بہت سی باتیں یاد آئیں جو کہہ نہیں سکے اس لئے کہ گفتگو کا وقت مقرّر ہو تو ٹھیک سے گفتگو ہو نہیں پاتی۔ مقرّرہ وقت کے خاتمے کا خیال ذہن پر اتنا چھایا رہتا ہے کہ جو تھوڑا سا وقت میسّر ہو وہ بھی ٹھیک سے استعمال نہیں ہو سکتا۔

۱؎ انجمن ترقّیِ اُردو دہلی کی منتظم اور نواب مُشتاق احمد خاں گُرمانی کی خواہرِ نسبتی۔

خیر مجبوری ہے۔ کسی دن تو یہ دیواریں گر جائیں گی اور تن و دماغ کی آزادی دوبارہ ہاتھ آجائیگی۔ جب تک اس کے سوا چارہ نہیں کہ انتظار کریں اور اس خیال سے تسکین حاصل کرتے رہیں کہ اپنے جسم و تن سلامت ہیں اور اپنی رگوں میں زندگی کی جو لہر رواں ہے آخر ایک دن طوق و سلاسل کے انبار پر غالب آجائے گی۔ یہ زنجیریں کیسی ہی قوی اور گراں کیوں نہ ہوں بہر صورت مردہ اور بے جان چیزیں ہیں۔

تمہارے جانے کے بعد میں نے کوئی کام نہیں کیا اور دن خواب آلود یادوں میں گزرتے رہے۔ آج فیصلہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو جھنجھوڑیں اور پھر سے کام شروع کر دیں۔ اگرچہ ہم یہاں جو کچھ کرتے ہیں۔ یعنی کچھ پڑھ لیا کچھ لکھ لیا کچھ سوچ لیا۔ اس کے لئے کام کا لفظ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ جیل میں بیشتر وقت کام میں نہیں کام کی آرزو میں گزرتا ہے۔ ایسا ٹھوس، محنت طلب اور دقت طلب کام جس کی تکمیل میں جان و تن کی سب طنابیں کھنچنے لگیں اور ذہن کے رگ و ریشے چور ہو کر دُکھنے لگیں۔ جیل میں ایسا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس کا ارادہ تو کئی بار کیا ہے۔ کوشش بھی کی ہے لیکن دماغ اتنا سرکش ہو گیا ہے کہ مانے نہیں مانتا۔ پھر بھی یہاں سب سے زیادہ اسی چیز کی ہوس ذہن پر مسلّط رہتی ہے کہ دوبارہ کسی کام سے لگیں۔ کوئی ایسا کام جو مفید بھی ہو اور تسلّی بخش بھی۔

ابھی ابھی میں نے وہ ناول[1] ختم کیا ہے جس پر گزشتہ برس نوبل انعام دیا گیا تھا۔ اس کا عنوان ہے MAGISTER LUDI۔ بہت طویل، تھکا دینے والی شیطان کی آنت تمثیل ہے جس کے صرف چند ٹکڑے کچھ اچھے ہیں۔ اگر نوبل انعام کا معیار یہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر کوشش کریں تو ہم یہ انعام حاصل نہ کر سکیں۔ اب ایک نظم جو بہت دنوں سے رُکی ہوئی ہے نپٹانے کی کوشش کروں گا اور ایک آدھ دن کے بعد کچھ تعارفی جملوں کے ہمراہ

---

(۱) مصنف سوئٹزرلینڈ کا ادیب ہرمن ہیس ہے

جو رؤف کو درکار ہیں بھجوا دوں گا۔

(۵۱)

۱۷ستمبر ۱۹۵۲ء

دنوں کی گنتی یاد نہیں رہی اس لیے شاید اس خط کے لیے تمھیں کچھ انتظار کرنا پڑا ہو اس کا عُذر خط کے ساتھ منسلک ہے اور رؤف کے لیے پیش لفظ بھی۔ یہی وہ نظم[1] ہے جس کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ اُسے کہلوا دو کہ اب کتاب مکمّل ہے۔ ایک مطبوعہ نظم جو اس میں شامل نہیں ہے وہ خود حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے بعد طباعت شروع ہو سکتی ہے۔ مسوّدے پر اب تک نظرِ ثانی بھی ہو چکی ہو گی اور اگر اس سلسلے میں صوفی صاحب کی کوئی تجاویز ہوں تو مجھے بھجوا دیں۔

بہت دنوں کے بعد تمہارے خط میں کچھ خوش دلی کی جھلک نظر آئی جس سے خوشی ہوئی لیکن اماں کے بارے میں دل بہت پریشان ہے۔ میں انھیں خط لکھ رہا ہوں۔ لیکن اس سے کیا حاصل ہو گا جب تک میں خود وہاں نہیں ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ غم و آلام کے ہجوم میں کہیں اُن کی ہمّت جواب نہ دے جائے۔ کتنی ظالمانہ بات ہے کہ تنِ تنہا ہمیں پالنے پوسنے اور کسی قابل بنانے کے لیے عمر بھر کی طویل اور کڑی جدوجہد کے بعد اب اس عُمر میں انھیں پھر ویسی ہی تنگ دستی اور محرومی کا سامنا ہے جو اس جدوجہد کے آغاز میں تھا۔ اور بہت سے جانکاہ صدمے اس کے علاوہ۔ لیکن مَیں جانتا ہوں کہ یہاں اپنے بس میں کچھ بھی نہیں ہے اس لیے اس احساس کو اُس وقت تک اُٹھا رکھنے کی کوشش کرتا ہوں جب امداد اور تسکین و تسلّی کے لیے کچھ کر سکیں گے۔

کل صغریٰ[2] نے بہت حسین پھولوں کی دو شاخیں میرے لیے اور ایک نسیم[3] کے لیے بھیجی۔ بعض لوگ کتنے اچھے ہیں۔ نسیم نے بھی اپنے پھول مجھے دے دیئے (وہ کہتی

۱۔ شورشِ بربط و نے ۲۔ بیگم منظور قادر ۳۔ بیگم اکبر خاں

ہیں کہ ان کا گھر ان پھولوں کے قابل نہیں ہے) یہ پھول اس وقت میرے سامنے ہیں۔ کمرے میں ان کی بو جھل شیریں خوشبو پھیل رہی ہے اور اُن کی پتّیاں چھیمی کی تصویر کو اس طرح حلقہ کئے ہوئے ہیں جیسے پوجا کے پھول ہوں۔ یہ کیسی خوبصورت تصویر ہے ذہنی ملازم لڑکی کے ساتھ۔ بنّے اِسے دانش اور محنت کا اتحاد کہتے ہیں) جب مَیں اپنی میز پر لکھنے بیٹھتا ہوں تو اکثر اِسے دیکھتا ہوں اور اُس کے چہرے میں اُس کے مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اَب تک بہت کچھ نظر آ گیا ہے۔ چہرے میں بدنیتی بدمزاجی یا کینہ پروری کی کوئی لکیر کوئی شکن کوئی نقش نہیں ہے۔ اس کا چہرہ کیا ہے ایک کھُلی ہوئی سی کتاب ہے۔ چنانچہ میں جانتا ہوں کہ وہ بڑی ہو کر ایک صاف دل دوسروں پر بھروسہ کرنے والی خوش مزاج اور محبتی شخصیت ہو گی۔ لیکن اپنے ابّا کی طرح کچھ احمق بھی۔ دُنیا والوں کے بل فریب سے قطعی نا آشنا۔ اس کے معنی ہیں کہ کبھی کبھی وہ اپنا دل بھی دُکھائے گی۔ کبھی کبھی لوگ اُسے دھوکا بھی دینگے لیکن اُس کی خوش مزاج مسکراہٹ بجھنے نہیں پائے گی، اور اُس کی زندگی کبھی ناخوش نہیں ہو گی۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ دُکھ اور ناخوشی دو مختلف اور الگ الگ چیزیں ہیں اور بالکل ممکن ہے کہ آدمی دُکھ بھی سہتا رہے اور خوش بھی رہے۔ دُکھ درد خارجی چیزیں ہیں جو بیماری یا حادثے کی طرح باہر سے وارد ہوتے ہیں جیسے ہماری موجودہ جدائی ہے۔ یا جیسے ایک بھائی کی موت ہے لیکن ناخوشی جو اس درد سے پیدا ہوتی ہے اپنے اندر کی چیز ہے، یہ اپنے اندر ہی بڑھتی پنپتی رہتی ہے اور اگر آدمی احتیاط نہ کرے تو پوری شخصیت پر قابو پا لیتی ہے۔ دُکھ درد سے تو کوئی مفر نہیں لیکن ناخوشی پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی کسی ایسی چیز سے لو لگائے جس کی خاطر زندہ رہنا اچھا لگے۔

۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء

(۵۲)

رؤف کو ایک غزل بھیج چکا ہوں تمت بالخیر کے طور سے ایک اَور نظم[1] منسلک ہے۔ اس نظم سے مَیں خاص طور سے خوش ہوں اسلئے کہ مجید[2] صاحب کے مرغوب الفاظ میں I DON'T MIND TELLING YOU آجکل کوئی اور ایسا نہیں لکھ سکتا۔ نہ بہت عرصے تک لکھ سکے گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے اپنی استعداد پر کوئی گھمنڈ ہے۔ اپنی صلاحیتِ ہنر تو بہت محدود ہے اور بہت سے لوگ مجھ سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ بات صرف محنت اَور عرق ریزی کی ہے۔ خاص طور سے بیانیہ تحریریں۔ اس نوع کی تحریریں سہل انگاری کی وجہ سے میلان یہ ہوتا ہے کہ جو بھی گرا پڑا لفظ ہاتھ آجائے یا ذہن میں جو تصویر ہے اُس سے ملتی جلتی جو بھی صورت الفاظ میں ڈھل جائے، اُسی سے کام چلا لیا جائے۔ اگر اس سہل انگاری سے کام نہ لیا جائے تو پڑھنے والے کو کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ ہر لفظ پر کتنی محنت صرف کی گئی ہے اور کسی لفظ کے آخری انتخاب سے پہلے کتنے بے شمار مترادفات ذہن نے رد کئے ہیں۔ تم شاید ہنس رہی ہوگی کہ ہم اترا رہے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ بھی کرنا ہی چاہئیے۔

رؤف سے کہہ دینا کہ آخری تین مصرعوں میں شاید ہم کچھ ترمیم کریں۔ لیکن اگر کچھ اور ذہن میں نہیں آیا تو جیسے ہیں ٹھیک ہیں۔ رہی انتساب کی بات تو اگر تم اپنے آپ کو ایلس[3] کہنا چاہتی ہو تو تمہیں اختیار ہے اس لئے کہ کتاب بھی تمہاری ہے۔ میں نے کلثوم اس لئے لکھا تھا کہ اوّل تو یہ مشرقی نام ہے۔ دوسرے یہ کہ لوگ اس کے بارے میں تم سے ضرور سوال کریں گے جو شاید تمہارے لئے تفریحِ طبع کا سامان ہو۔ بہر حال جو تمہارا جی چاہے کرو۔ صرف "میری بیوی کے نام" پر مجھے اعتراض ہوگا یہ انگریزی میں تو ٹھیک ہے لیکن اردو میں کچھ چھچھورا معلوم

---

[1] زنداں کی شام [2] کرنل مجید ملک صاحب

[3] پہلے ایلس جارج، نام تھا۔ شادی کے بعد ایلس فیضؔ کہلائیں۔ فیضؔ کی والدہ نے کلثوم نام رکھا۔

ہوتا ہے۔

تمہارے گزشتہ خط سے دل بہت خوش ہوا۔ یوں لگا جیسے ہم ابھی تک ساتھ ہیں
دراصل اس بار تمہارے جانے کے بعد وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی جو ایسے موقعوں پر پہلے محسوس
کرتے رہے۔ جب تو جُدا ہونے کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ ملے ہوئے برسوں گزر چکے ہیں
اور یہاں تمہاری موجودگی کسی دُور دراز دُنیا اور کسی بہت پُرانے زمانے کا ایک واقعہ ہے
جس پر یکایک فراق کا بھاری پردہ گرا دیا گیا۔ اس بار ابھی تک جدائی کا احساس ہی نہیں ہوا۔
شاید تمہارے خطوط کی وجہ سے یا میری میز پر رکھی ہوئی تصاویر کی وجہ سے یا اس وجہ سے
کہ اُمّید کی لو پہلے سے زیادہ روشن ہے اور انتظار کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔ امّاں
کی وجہ سے ابھی تک پریشانی ضرور ہے اور اُن کا دھیان دل سے نہیں جاتا لیکن اس کے
علاوہ طبیعت پہلے سے کہیں زیادہ خوش اور بشاش ہے۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ میں نے
پھر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ آج کل یہاں موسم پھر گرم ہو چلا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان دنوں ہوا بند
ہو جاتی ہے اور سندھ کے خفیف جاڑوں کے انتظار میں ہر چیز ساکن اور بے حرکت معلوم
ہوتی ہے۔

۸ اکتوبر ۱۹۵۲ء **(۵۳)**

آج صبح چاند کی تیز روشنی چہرے پر اس طرح پڑی کہ آنکھ کھل گئی۔ جیل کی گھڑیال
نے ساڑھے چار بجائے۔ میں بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ٹھیک اُسی لمحے ساتھ کے پلنگ پر
ارباب[1] بھی اُٹھ بیٹھا اور مسکرا کر میری طرف دیکھا ارباب تو فوراً ہی دوبارہ سو گیا لیکن میں اُٹھ کر
برآمدے میں آ بیٹھا اور صبح کی آمد کا نظّارہ کرتا رہا۔ پہریدار بدلے تو جیل کے صدر دروازے
کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ دور کہیں زنجیروں اور چابیوں کی جھنکار سنائی دی اور

۱؎ جیل کے ساتھی ارباب نیاز محمدؒ

مختلف فولادی دروازوں کے جبڑے اس طرح کھلنے اور بند ہونے لگے جیسے وہ آخرِ شب کی تاروں بھری تاریکی کو جلد جلد چبا رہے ہوں۔ پھر ایک خواب آلود حسینہ کی طرح ہلکے سے صبح کی ہوا بیدار ہوئی۔ آسمان دھیرے دھیرے پیلا ہونے لگا اور ستارے موتیوں کے گرداب بن کر تہہ و بالا ہونے لگے۔ میں بیٹھا رہا اور دیکھتا رہا اور کئی طرح کے خیال اور یادیں دل میں آتی رہیں جاتی رہیں۔ شاید ایسی کسی صبح میں اسی چاند نے اسی جگہ سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک تنہا مسافر کو پکارا تھا اور اسے کسی نامعلوم دنیا میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور وہ مسافر میرا بھائی تھا۔ شاید اس وقت یہی چاند ایسے بہت سے چہروں پر چمک رہا ہے جو مر کر درد سے آزاد ہو چکے ہیں۔ کوریا کے کیمپوں میں مقتول قیدیوں کے چہرے اور یہ سب مقتول نوجوان بھی میرے بھائی تھے۔ جب وہ زندہ تھے تو ایسی دور دراز سرزمینوں پر زندہ تھے جو میں نے نہیں دیکھیں لیکن وہ میرے تن میں بھی زندہ تھے اور میرے لہو میں ان کا لہو بھی شامل تھا۔ جن قاتلوں نے انہیں قتل کیا ہے انہوں نے میرے تن کا کوئی حصہ بھی قتل کیا ہے اور میرا بھی کچھ لہو بہایا ہے۔ بہرحال اب یہ سب مر چکے ہیں۔ جیسے میرا بھائی مر چکا ہے اور مرنے والوں کا پورا ماتم مرنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ جینے والوں کو جینے والوں کی خوشیوں میں شریک رہنا چاہیئے۔

شاید کسی دن میں اس صبح کو شعر[1] میں ڈھال سکوں۔ اور میں نے ارباب کو متنبہ کر دیا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو اس کے زندہ جاوید ہو جانے کا خدشہ ہے۔

وکٹر[2] کا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اسے جواب لکھ چکا ہوں اور مہربانی سے اسے میری ایران والی نظم بھیج دو اور گزشتہ خط میں زنداں کی شام پر جو نظم ارسال کی تھی وہ بھی۔

تم نے اپنے علاج کے لئے کسی دیسی حکیم کا پوچھا ہے جو مجھے بہت عجیب لگا۔ اگر کسی

---

[1] زنداں کی صبح [2] پروفیسر وکٹر کیرنن جن کی کتاب POEMS BY FAIZ اسی سال یونیسکو کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

حکیم سے رجوع کرنا ہی ہے تو حکیم نیّر واسطی صاحب سے ملاقات طے کرلو جو منٹو پارک کے قریب رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے جانتے ہیں اور شاید تمہیں یاد ہو کہ آغا عبدالحمید کے بھائی آغا حبیب اُن کے داماد ہیں۔ اگر ان سے ملنے جاؤ تو خدا کے لئے بائیسکل پر مت جانا۔ تانگے پر جاؤ۔

(۵۴) ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۲ء

میں نے یہ خط دو تین دن کے لئے روک لیا تھا تاکہ تمہیں ایک نئی نظم بھیج سکوں۔ لیکن یہ ختم نہیں ہو سکی اس لئے اگلے اتوار تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ہفتے کے باقی دنوں میں کوئی کام ہو نہیں سکتا امید ہے کہ اپنے اگلے خط کے ساتھ روانہ کر سکوں گا۔ آخری نظم جو بھیجی تھی شفیع[۱] کو پہنچا دو یا پھر یہ نئی نظم بھجوا دینا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آجکل کسی گردش میں ہیں جو شاید ان کے لئے اچھا ہے۔

سلامت اللہ[۲] شاہ کی وفات کا سُن کر بہت رنج ہوا۔ بہت اچھے آدمی تھے۔ مجھے علم نہیں کہ تعزیّت کا خط کیسے لکھنا چاہیئے۔ تم جیسے بھی ہو سکے ان کے گھر والوں کو میری تعزیّت پہنچا دو۔ کسی رپورٹر کے ہاتھ پیغام بھجوایا جا سکتا ہے یا مسلم ٹاؤن میں ملکہ پکھراج کو ٹیلی فون کر دو اور میرے سلام کے ساتھ یہ پیغام پہنچا دو۔ ملکہ پکھراج کو یہ بھی بتا دینا کہ ہم ریڈیو پر اُن کے پُرانے ریکارڈ اکثر سُنا کرتے ہیں۔ اور ہمارے ساتھیوں کا اصرار ہے کہ جب ہم باہر آئیں گے تو انہیں ضرور اپنا گانا ہمیں سُنانا ہوگا۔

تو آخر تم نے ایک اچھی فلم دیکھی STREET CAR NAMED DESIRE لیکن اس پر ہمیں کچھ ایسا رشک نہیں آیا اس لئے کہ بہت پہلے ہم نیویارک میں یہ کھیل اسٹیج پر

۱۔ جریدہ نگار محمد شفیع جو "م ش" کے نام سے لکھتے اور مشہور ہیں۔

۲۔ دوست، ایک نیلام گھر کے مالک اور موسیقی کے سرپرست

دیکھ چکے ہیں۔ اگرچہ جب کچھ ایسا لطف نہیں آیا تھا اس لئے کہ سب اچھی نشستیں بہت پہلے سے پُر ہو چکی تھیں اور ہمیں بہت دُور اور بہت غیر آرام دہ جگہ ملی تھی۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء **(۵۵)**

آجکل لیلائے سخن غیر حاضر ہے۔ اور شب و روز پر خزاں کی اُداسی چھا رہی ہے۔ اب میں نے رات کو کام کرنا چھوڑ دیا ہے اس لئے کہ روشنی سے بینائی پر اثر پڑنے لگا ہے۔ اس وجہ سے شامیں لمبی اور ویران معلوم ہوتی ہیں اور آجکل میں کچھ لکھ ہی نہیں رہا ہوں۔ یادوں کے ساتھ اکیلے زیادہ وقت گزارنے کو جی نہیں چاہتا اس لئے میں سرِ شام ذہن پر تالا ڈال کر نیند کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔ دس بجے تک سو جاتا ہوں اور صبح پانچ بجے جب پہرہ بدلتا ہے تو آنکھ کھُل جاتی ہے۔ اس وقت جیل کی دیواروں سے باہر پہلے مختلف اذانوں کی آواز بلند ہوتی ہے اور پھر پرندے غُل مچانے لگتے ہیں۔ صبح کے منظر پر جو نظم شروع کی تھی وہ پہلے بند سے آگے نہیں بڑھ سکی اس لئے مَیں نے اسے فی الحال سرد خانے میں رکھ دیا ہے۔ اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں یہ فقط الفاظ کی مشق ہے جو صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ اوزار سان پر لگے رہیں۔ تمہارا جی چاہے تو یہ شفیع کو دے دو ورنہ نقوش کو بھیج دو۔ وہ لوگ بہت دنوں سے تقاضہ کر رہے ہیں۔

کتاب کی اشاعت کہاں تک پہنچی ہے۔ پریشان افکار کے اس مجموعے کے لئے پریس کانفرنس منعقد کرنا مجھے کچھ مبالغہ سا معلوم ہوتا ہے لیکن شائد اس میں کچھ فائدہ ہو۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ ایسے موقعوں پر کیا کہنا چاہیئے۔ شائد یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام ادب خواہ وہ کسی سیاسی نظریے کسی مکتبِ فکر یا کسی شخص سے متعلق ہو بہر صورت قومی اثاثے کا جزو ہے اس لئے حالات کچھ بھی ہوں ادب کی تخلیق بہر صورت ایک قومی خدمت کی ادائیگی ہے جس کا کچھ اعتراف اور کچھ قدر ہونی چاہیئے۔ شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر خادمِ قوم کی طرح ہر ادیب کو کم از کم اتنی آزادی ضرور میسّر ہونی چاہیئے کہ وہ یہ خدمت انجام

دے سکے۔ اِس اعتبار سے اگر اُس کی شخصی آزادی کو گزند پہنچایا جائے تو اس اقدام سے صرف اُس کی ذات ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ بخاری[1] دسمبر میں آ رہے ہیں۔ شاید ہم بھی مل سکیں۔ خیر ہم نہ بھی مل سکے تو اور دوست مل لیں گے اور اُن کی باتیں اُن دوستوں کی زبانی سُن لیں گے۔

FOR SINGING TOMORROWS[2] بہت حسین ترکیب ہے۔ ہاں سَب کچھ آنے والے نغمہ سنج دنوں کے لئے ہے۔ آج کا دَرد بھی، آنسو بھی، کُلفت بھی اور محرومی بھی۔ اور اگر آج کا دن موجود ہے تو کل کا دن بھی برحق ہے۔ اس طرح ہر دُکھ بھرا دن جو گزرتا ہے۔ اپنی تسکین اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہ تسکین ساتھ لاتا ہے کہ جو دِن گزر چکا ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکا اور اُس کے بعد جو بھی دِن آئے گا اُس سے مختلف ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بہتر ہو، اس لئے لازم یہی ہے کہ آنے والے دنوں پہ نظر جمائے رکھیں گے اور بیتے ہوئے دنوں کو جملہ ساکنانِ عدم کے ساتھ دفن ہو جانے دیں۔

(۵۶)

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۲ء

تمہارے ابّا کا پڑھ کر بہت پریشانی ہوئی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر اُن کی حالت میں افاقے کی خبر نہ آئے تو تم جانے کی تیاری کر لو۔ تمہاری امّاں نے جو پیسے بھیجے تھے وہ واپسی کے ٹکٹ کے لئے کافی ہونے چاہئیں اور اگر تم اُن میں کتاب سے جو بچا ہے وہ اور مزید ایک ہزار روپے اپنی بچت سے نکال کر شامل کر لو تو اتنی رقم بن جائے گی کہ بچّے بھی تمہارے ساتھ جا سکیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم انہیں بھی ساتھ لے جاؤ ورنہ تمہیں اِن کے بارے میں تشویش رہے گی اور ذہن پر بے جا بوجھ پڑے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے اور یہ خرچہ بہت بھاری معلوم ہوتا ہے لیکن میں اگر تمہاری جگہ ہوتا تو اس کی مطلق پروا نہ کرتا۔ کھویا

---

[1] پطرس بُخاری [2] چلی کے ممتاز شاعر BABLO NERUDA کی نظم کا عنوان۔

ہوا پیسہ تو کسی نہ کسی صورت واپس آ جاتا ہے لیکن کھوئے ہوئے انسان واپس نہیں آتے اور اگر کچھ دِن فاقہ بھی کرنا پڑے تو وہ عمر بھر کے اس تاسف سے بہتر ہے کہ ہم کسی عزیز کے لئے کچھ کر سکتے تھے جو نہیں کیا اور اب کبھی نہ کر سکیں گے۔ جہاں تک میرا اور یہاں کے معاملات کا تعلق ہے اُن کے لئے تمہاری یہاں موجودگی ضروری نہیں۔ اس بارے میں نہ تم کچھ کر سکتی ہو، نہ کوئی اور۔ تمہاری مُشکل کا مجھے احساس ہے اور میں جانتا ہوں کہ تمہارا بوجھ بٹانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ اِتنا بھی نہیں کہ اِن مُشکلات میں تمہیں کوئی مشورہ ہی دے سکے۔ لیکن مجبوری میں آدمی اس کے سوا کر ہی کیا سکتا ہے کہ جی کڑا کر کے سب کچھ برداشت کئے جائے۔ حتیٰ کہ امتحان ٹل جائے۔ بہر صورت جو بھی تم فیصلہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اپنا سر اونچا رکھو اس لئے کہ بہت کچھ اسی پر منحصر ہے اور اُن کمینہ فطرتوں کو نظر انداز کر دو جو اس صورت حال کے ذمّہ دار ہیں۔ وہ ہماری حقارت کے قابل بھی نہیں۔

۶ نومبر ۱۹۵۲ء

(۵۷)

کاش مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ تم سیالکوٹ جا رہی ہو تو فرمائش کرتا کہ ہمارے بچپن کے ٹھکانوں کی زیارت بھی کر آؤ۔ میرے بچپن کے دوست اور اُن کے گھر والے تم سے مل کر یقیناً باغ باغ ہوتے۔ خیر۔ پھر کبھی ساتھ وہاں چلیں گے۔ فی الحال تم مجھے بتا دینا کہ وہاں کیسے گزری۔

غالباً تمہیں اطلاع ہو گئی کہ یہاں کے طول طویل ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا ہے اور باقی اب جو تقدیر دکھائے ـــــ سنسر نے کاٹ دیا ـــــ صرف چند ہفتے باقی ہیں اور اگرچہ مجھے اپنے دل میں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اگر ہمیں کلفت اور انتظار کے کچھ اور دِن بھی بسر کرنے پڑے تو مجھے اس سے بھی قوی یقین ہے اور اُمید اور تحمّل کے سہارے ہم انھیں بھی گزار دیں گے۔ جب تک زندگی باقی ہے کسی مصیبت کے سامنے سرنگوں نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ کسی نہ کسی طرح سب نقصانات پورے ہو جاتے ہیں اور سب

دُکھ درد کی تلافی ہو جاتی ہے، اہم چیز صرف اپنی زندگی اور اپنی جان ہے جو خیر تمام بھی ہے اور اُمید برحق بھی۔ اور مجھے معلوم ہے کہ زندگی باقی ہے۔

کتاب کے سرورق کا ابھی سے طے کرلیں تو اچھا ہو۔ حیدر[1] اس بارے میں مشورہ دے سکیں گے۔ جہاں تک لوگوں کو تحفتاً بھیجنے کا تعلّق ہے جب کتاب تیّار ہو جائے گی تو یہ بھی طے کرلیں گے۔ جیسے تم نے لکھا ہے میری ایسی سہیلیوں کی تعداد جنھیں خوش کرنا مقصود ہو کچھ ایسی زیادہ نہیں جو بہت افسوس کی بات ہے۔ آمنہ[2] تو ہیں ہی۔ اور پھر میری نئی دوست شوکت[3] ہارون ہیں۔ ہندوستان میں چمپا[4] اور بس۔ میرے خیال میں ہمارے مرد دوستوں کی تعداد بھی اتنی ہی ہو گی۔

تو آخر[5] تم سے ملنے آ ہی گئیں۔ یہ سُن کر خوشی ہوئی۔ اور زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی کہ تم اُن سے ہمیشہ کی طرح ملیں۔ اگر اپنا دل بڑا ہو تو اُسے اس وجہ سے چھوٹا نہیں کرنا چاہیئے کہ کسی دوسرے کا دِل چھوٹا ہے۔ دوستوں کے بارے میں اپنے مغالطے یا خوش فہمی دُور کرلینا اچھّی بات ہے لیکن ان کے چھوٹ جانے پر اپنا دِل جلانا یا اُن پر یہ الزام دھرنا کہ وہ تمہاری خوش فہمیوں کے مطابق ثابت نہیں ہوئے صحیح بات نہیں ہے۔ کسی کے بارے میں خوش فہمی یا مغالطہ تو اپنی ہی خطا ہوتی ہے نہ کہ دوسرے کی۔ جو کوئی جیسا بھی ہے اُسے ایسا ہی قبول کرلینا چاہیئے اس سے قطعِ نظر کہ تمہارے خیال میں اسے کیسا ہونا چاہیئے تھا۔ اور کسی سے بھی زیادہ توقع وابستہ نہیں کرنی چاہیئے۔ ایک نامکمّل نظم[6] بھیج رہا ہوں۔ رؤف

---

[1] کمال حیدر نیوز ایڈیٹر پاکستان ٹائمز   [2] بیگم آمنہ مجید ملک

[3] حاجی سر عبداللہ ہارون مرحوم کی صاحبزادی ڈاکٹر شوکت ہارون جن کا انتقال ہو گیا ہے۔

[4] مسز چمپا منگت رائے۔ لاہور کے ایک ممتاز عیسائی خاندان سے ہیں۔

[5] نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔   [6] زندان کی ایک صبح

سے کہو اسے کتاب میں شامل کرلیں اور کسی کو چھپنے کے لئے نہ دیں۔ عدالت کے بارے میں تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر تم چاہو تو شکریہ کا خط لکھ دو۔ مگر کتاب کی اشاعت کی اجازت کے لئے شکریہ کی ضرورت نہیں۔ اس سے تو عدالت کا کوئی علاقہ نہیں، البتہ اس بات کا شکریہ ادا کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے یہ نظمیں باہر بھجوانے کی اجازت دے دی۔

(۵۸)

۷ نومبر ۱۹۵۲ء

تمہارے لندن جانے میں رکاوٹ کا افسوس ہے لیکن ممکن ہے کہ بعد میں سب ٹھیک ہو جائے۔ کچھ کہہ نہیں سکتے۔ سرکاری کاروبار یوں ہی چلتا ہے کہ بعض اوقات دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی خبر نہیں ہوتی اس لئے فیصلے، فیصلوں کے مخالف فیصلے اور مخالف فیصلوں کے مخالف فیصلے سرکاری دفتروں کا عام معمول ہیں۔ لیکن وقت اتنا تنگ ہے کہ معاملہ صاف ہونے تک شاید ہاں یا نہ سے کچھ فرق ہی نہ پڑے۔ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ میرے باہر آنے سے پہلے تم (اپنے) ابّا کو دیکھنے نہیں جاسکتیں۔ انگلستان جانے کے لئے نہ ویزا درکار ہے اور نہ کوئی تصدیق۔ ہم ابھی تک دولتِ برطانیہ کی رعایا ہیں اور ملکہ BESS ہیں اپنی سلطنت کے کسی بھی علاقے میں کیسے روک سکتی ہیں۔

میں نے گزشتہ خط میں تمہیں جلد آنے کے لئے لکھا تھا تاکہ چند ذاتی معاملات کے بارے میں کچھ طے کرلیں۔ اس خیال سے کہ شاید ہم کرسمس تک گھر نہ پہنچ سکیں اور گھر آنے کی دعوت پھر ملتوی کرنی پڑے۔ بہتری کی اُمید تو ہمیشہ رکھنی چاہیئے۔ دانشمندی اسی میں ہے کہ ناگوار صورتِ حالات کا امکان بھی پیشِ نظر رہے، آئندہ کے بارے میں انسانی علم بہت محدود ہوتا ہے اور تکلیف دہ حادثات کے امکانات ہمیشہ موجود، اس لئے ہر کسی کو اس حد تک فلسفی ضرور ہونا چاہیئے کہ جو بھی صورت پیش آئے اُسے زیادہ ششدر یا سراسیمہ ہوئے بغیر قبول کرلے۔ ہم تو اس بارے میں بہت زیادہ فلسفی ہیں۔ اوّل یہ جانتے ہوئے کہ خیر کی ہار کبھی نہیں ہوتی اور دوم یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم میں اتنی ہمت اور سمجھ بوجھ موجود

ہے کہ کل جو بھی سامنے آئے گا تم اُسے دلجمعی اور حوصلے سے برداشت کرو گی۔ اصل میں تمہیں یہی کچھ کہنے کے لیے بلایا تھا۔ اگرچہ یہ سب کچھ کہنے کی ایسی کچھ ضرورت بھی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی خاص معاملہ نہیں جسے فوری طور پر حل کرنا ضروری ہو۔ کبھی فراغت سے سب باتیں طے کرلیں گے۔ گھر بیٹھ کر یا جہاں بھی مقدّر ہمیں ملنے کی اجازت دے۔ میرا ہرگز یہ منشا نہیں کہ ادھر جو کچھ مَیں نے لکھا ہے اُس سے تم کوئی اور نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرو۔ یا کوئی نئے وسوسے اپنے دل میں لاؤ۔ یہاں کی صورتِ حال میں کسی نئی بات کا اضافہ نہیں ہوا ہے۔ وہی صورت ہے جو ہمیشہ سے تھی۔ یعنی اُمید کا ایک دودھیا بادل ہے اور اُس کے ساتھ بے یقینی کی ایک سیاہ دھاری۔ مَیں نے جو کچھ لکھا ہے اُس کے معنی صرف اِس قدر ہیں کہ اِس سیاہ دھاری کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور اپنے ذہن کے دفاعی اِنتظامات ٹھیک رکھنے چاہئیں چونکہ تھوڑے دن باقی ہیں اس لیے یہ سب کچھ ذہن میں رکھ کر اپنے سفر کے بارے میں جلد فیصلہ کرو۔ اور اگر تمہارا چھٹّی لینے کا ارادہ ہے تو بہتر ہوگا کہ دو تین دن یہاں گزار کے تبدیلِ آب و ہوا کی خاطر کچھ دنوں کے لیے کراچی چلی جاؤ۔ مَیں اس سے زیادہ کوئی قطعی مشورہ نہیں دے سکتا۔ ویسے میرا اپنا اُصول تو یہی ہے کہ جب کسی بات میں شک ہو تو اپنے دل کی بات مانو۔ تمہارے لیے جیسے بھی آسانی ہو ویسے کرو، مجھے اتفاق ہوگا۔

۱۰ نومبر ۱۹۵۲ء **(۵۹)**

مجھے افسوس ہے کہ تمہارے ابّا[1] کے بارے میں نئی اِطلاع تشفّی بخش نہیں۔ بہرحال بہتری کی اُمید رکھنی چاہیے۔ دُنیا میں دُکھ اتنا زیادہ ہے اور اپنا اختیار اتنا کم کہ اس دُکھ سے نمٹنے

---

[1] فیض کے جیل جانے سے چند ماہ پیشتر ڈاکٹر تاثیر کا اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اِنتقال ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر اور فیض ہم زُلف تھے۔ اِنتقال اور اسیری کی ناگہانی مصیبتوں نے مسز جارج کی علالت میں اضافہ کر دیا۔

کے لئے اپنی پوری ہمت درکار ہے، اسی سبب سے اُمید کی شمع جلائے رکھنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

اب سے پہلے مجھے اس بات پر بڑا مان تھا کہ اپنے میں اور جو بھی عیب ہو ہم نے جان بوجھ کر کسی کے دُکھ میں اضافہ نہیں کیا۔ اب یہ مان بُری طرح ٹوٹ چکا ہے اگرچہ اس میں بھی خطا میری نہیں۔ جیسے تم نے لکھا ہے تمہارے ابّا کی علالت میں بھی زیادہ دخل اپنی بچیوں کی ناگہانی مصیبتوں پر ان کے دلی رنج وغم کو ہوگا۔ ان کے نحیف ونزار دل کو کتنا ملال ہوگا کہ ان کی دونوں بچیاں جو کہیں کالے کوسوں دُور نکل گئی ہیں اپنی مصیبت میں اُنہیں پکار رہی ہیں لیکن وہ ان تک پہنچ نہیں سکتے۔ مَیں ان کا درد اپنے دل میں محسوس کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ ہم بھی ایسی ہی اُفتاد سے دوچار ہیں۔ لیکن اوّل تو ان کے پاس وہ ذہنی سہارے موجود نہیں جو مجھے میسّر ہیں۔ پھر ہم ایک دوسرے سے اتنے دُور بھی نہیں اور اس کے علاوہ آج کل کے اندھیرے سایوں سے پرے بقیہ زندگی کا روشن راستہ بھی ہماری نظر میں ہے۔ لیکن خدا نہ کرے کہ مجھے بڑھاپے اور ضعیفی کے عالم میں کسی ایسے دُکھ کا سامنا کرنا پڑے جب آدمی صرف ماضی ہی پر نگاہ دوڑا سکتا ہے اور مستقبل کا سہارا باقی نہیں رہتا۔ بہر حال جن حالات کا مداوا اپنے بس میں نہ ہو ان کی خاطر دل جلانا بے کار ہے، ہم اپنے بیچارے غمزدہ والدین کے لئے یہی کر سکتے کہ جس قدر محبت اور دلجوئی ممکن ہو سکے انہیں بہم پہنچائیں اور ان پر یہی ظاہر کریں کہ ہم زندگی سے اتنے زخم خوردہ نہیں ہیں جیسا کہ معلوم ہوتا ہے اور کسی نہ کسی دن ستارے موافق ہو ہی جائیں گے۔ تو بات وہیں پہنچتی ہے جہاں سے چلی تھی یعنی یہ کہ ہم دوسروں کو رنج و خوشی برداشت کرنے میں جبھی امداد دے سکتے ہیں جب ہم اپنی ناخوشی کو قابو میں رکھیں کیسی دوسرے کو خوش کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی خود خوش نظر آئے یہ بعض اوقات مشکل تو ہوتا ہے لیکن کرنا ہی چاہیئے۔

یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ تم نے باغبانی شروع کر دی ہے۔ آج کل ہم بھی کر رہے ہیں اور ہم نے بہت سے پھول بوئے ہیں۔ اُن کے اُگنے میں تو کافی دن لگیں گے لیکن غالباً کچھ پھول تو

دکھائی دے ہی جائیں گے، جو ہم نہیں دیکھیں گے، ان سے بعد میں آنے والوں کا دل خوش ہوگا۔ آج کل میں ایک بہت عمدہ کتاب پڑھ رہا ہوں یہ SITWELL بھائی بہن کے والد SIR GEORGE SITWELL کی تصنیف THE MAKING OF ITALIAN GARDENS ہے۔ اس میں کچھ باغبانی کے فنّی نکات ہیں اور کچھ اُن کے تاثرات۔ کتاب کا بہت حصّہ تو میری سمجھ سے بالا ہے اس لئے کہ مجھے پھلوں اور اشجار کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم (ہم تو صرف انہیں دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں) لیکن جب چٹخارے سے بڑے میاں لان، اور پائیں باغ اور فوّاروں اور بارہ دریوں کا ذکر کرتے ہیں اس لطف میں مَیں بھی شریک ہو لیتا ہوں۔

نئے موسم کے خیر مقدم کے لئے کچھ تُک بندی کی ہے جو بھیج رہا ہوں[۱] اس کی خوشی ہے کہ اب عام فہم زبان پر کچھ عبور حاصل ہو چلا ہے لیکن جو کچھ میں لکھ رہا ہوں یہ تو محض اسلوب و اظہار کے پھٹکل تجربے ہیں اور اس امید سے کہ شاید بعد میں زیادہ وزنی موضوعات پر کچھ لکھا جا سکے۔

(۶۰)

۲۰ نومبر ۱۹۵۲ء

تمہارا گزشتہ خط اتنا اُداس تھا[۲] کہ دِل کچھ سہم سا گیا اور میں نے جواب اس خیال سے روک لیا کہ کہیں میں بھی ایسی ہی افسردہ باتیں نہ لکھ دوں۔

اَب تمہارا دوسرا خط آیا تو بات سمجھ میں آ گئی۔ اگر دلی جذبات کے بارے میں میری باتیں کچھ سنگ دلانہ معلوم ہوتی ہیں تو مجھے افسوس ہے، اصل میں میری مراد یہ نہ تھی، خود میرا دل بھی ایسا سخت نہیں جیسا میں ظاہر کرتا ہوں، ذرا سی بے احتیاطی کرو تو بُری طرح دُکھنے

۱؎ فیض اوج خیال سے ہم نے — آسمان سندھ کی زمین کی ہے۔

۲؎ ایلس کے والد فوت ہو گئے

لگتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آنسو اور دردِ دل کوئی عیّاشی یا خطا کاری نہیں جس پر نکتہ چینی یا حرف گیری کی جائے۔ ہمارے ایسے حالات میں تو یہ زندگی کا تقاضا ہیں اور انہیں بالکل دبانے کی کوشش نہ صرف اپنے پر بے وجہ اور ناقابلِ برداشت بوجھ ڈالنا ہے بلکہ ایک طرح سے جھوٹ اور ریاکاری بھی ہے جو غیر اخلاقی باتیں ہیں۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ میں نے تم سے اس نوع کے جان لیوا بیراگ کا مطالبہ کیا ہے تو غلط ہے۔ یہ مطالبہ تو میں اپنے آپ سے بھی نہیں کرتا مجھے مشکل اوقات میں جس چیز سے تشویش یا ڈر محسوس ہوتا ہے وہ یہ چیز نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ جب دل میں درد و کرب کا طوفان بپا ہے تو سر اتنا بلند ضرور رہنا چاہیے کہ مستقبل میں اُمید کی کرن نظر آ سکے، زندگی پر اپنا ایمان قائم رہ سکے اور حسن و خوبی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ضائع نہ ہونے پائے۔ اگر ان پانیوں کو سر سے گزر جانے دیں تو آدمی کھو جاتا ہے اپنا توازن ایک دفعہ ہاتھ سے نکل جائے تو پھر مشکل سے گرفت میں آتا ہے۔ خوف و خطر کا مرحلہ یہی ہوتا ہے۔ جب موجیں دہاڑتی ہوئی ٹھاٹھیں مارتی آتی ہیں اور تیرہ و تار سیلاب کا خاتمہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ جب ہاتھ پاؤں سرد اور شل ہو جاتے ہیں اور مزید جد و جہد انتہائی اذیت ناک معلوم ہوتی ہے لیکن یہ جد و جہد تو جاری رکھنی ہی پڑتی ہے صرف اپنی جان کے بچاؤ کی خاطر نہیں بلکہ ان سب چیزوں کی خاطر بھی جنھیں آدمی عزیز اور مقدس اور بیش قیمت جانتا ہے، اس لئے تم اپنے آنسو بچا کر نہ رکھو صرف اپنا سر نیچا نہ ہونے دو۔ اس لئے کہ طوفان گزر جائے گا، بادل کھل جائیں گے اور سورج کی روشنی پھر ہر سو پھیلے گی، کل نہیں تو پرسوں یا شاید بہت دِن کے بعد جب بھی ہو یہ ہونا یقینی ہے۔

اگر تم نے میری گزشتہ نظم امروز کو بھیج دی ہے تو مضائقہ نہیں۔ سبھی پڑھنے والوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ادیب کسی ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ سب چاہنے والوں کی گرہ میں ایک جیسے دام نہیں ہوتے۔

۲۲ نومبر ۱۹۵۲ء (۶۱)

گزشتہ پیر تمہارے تین خط ایک ساتھ ملے تھے، اس کے بعد کوئی خبر نہیں آئی، کچھ دنوں تک خط نہ آئے تو یہاں کی تنہائی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور چونکہ تم اپنے نالائق میاں کی طرح کاہل اور کام چور نہیں ہو اس لئے تشویش ہونے لگتی ہے۔

یہ لکھا ہی تھا کہ تمہارا خط آ گیا۔ یہ سال ختم ہونے کو ہے اور شاید ہماری آزمائش بھی۔ اس لئے دل خوش رکھو اور براؤننگ کی نظم ربی بن عذرا یاد کرو۔

میرے ساتھ ساتھ بڑھاپے کی منزل تک چلو
بہترین دن تو ابھی آگے آئیں گے

یہ سوال نہیں ہے کہ کونسی چیز کس چیز کے قابل ہے، کیا شہرت اس قابل ہے کہ اس کے لئے دل لہو کیا جائے یا وصال اس قابل ہے کہ اس کے لئے فراق جھیلا جائے۔ بات یہ ہے کہ اگر تن میں جان ہے اور آدمی اپنی دیانت اور خلوص باطن کے بھروسے پر سر اٹھا کر چل سکتا ہے تو زندگی میں جو بھی پیش آئے، رنج ہو یا راحت، ہر چیز اپنی اپنی جگہ اچھی ہے اور اس کا کسی اور چیز کا بدل ہونا ضروری نہیں یہ خط اس خیال سے لمبا نہیں کرنا چاہتا کہ اگر اس ہفتے کے آخر میں تمہارا آنے کا ارادہ ہے تو چلنے سے پہلے تمہیں مل جائے۔

۲۶ نومبر ۱۹۵۳ء (۶۲)

یہ خط میں نے اس امید میں روک لیا تھا کہ تمہیں دو نظمیں ایک ساتھ بھیج سکوں گا تاکہ حساب برابر ہو جائے لیکن عروس سخن بالکل اور بے وجہ غیر حاضر ہے۔ یہ جو چند سطور اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں صرف ہاتھ کی صفائی ہے اور اس میں آمد کا خاص دخل نہیں۔ میرا خیال ہے کہ جیل کے تجربے کا میں نے آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے اور اس بارے میں اب کچھ کہنے کو نہیں رہا، ذہن کو غذا بہم پہنچانے کے لئے زندگی اور تجربات اور دوسرے انسانوں سے میل ملاپ ضروری ہے لیکن ہم جس علیحدگی میں رہتے ہیں اس میں آدمی پہلے سے

جمع شدہ تجربات کا مصالحہ اپنے اندر سے نکالتا رہتا ہے اور باہر سے کچھ وصول نہیں ہوتا۔ آخر کار یہ ذخیرہ ختم ہونے لگتا ہے اور ذہن سوکھ جاتا ہے، لیکن امید اور تخیل کی مہربانی سے کچھ نہ کچھ پھر بھی بچ رہتا ہے۔ خیر اب میں اور نہ بھی لکھوں جب بھی باہر جو کچھ لکھا جا رہا ہے پڑھتا ہوں تو دل اپنے آپ سے خوش بھی ہوتا ہے، نازاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب لوگوں کی زبانیں پھر سے کھل گئی ہیں، اب ان کی تحریروں میں رنگ اور جذبہ پہلے سے کہیں فراواں ہیں اور ہم اپنے سے خوش یوں ہوتے ہیں کہ دو سال پہلے جو جمود طاری تھا اسے توڑنے میں شاید کچھ تھوڑا سا بالواسطہ ہی سہی ہماری اسیری کا اور جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کا بھی حصہ ہو بہت شدت سے جی چاہتا ہے کہ ہمیں قدرت سے ذرا زیادہ جوہر ملا ہوتا اس لئے کہ جہاں تک میں چلتا ہوں وہیں تک اور لوگ چلتے ہیں، جہاں میں رک جاتا ہوں وہ بھی رک جاتے ہیں، ان کے پاؤں ہم سے کچھ آگے بڑھتے تو ہم بھی کسی کی پیروی کر سکتے۔ تم کہو گی ہم پھر اٹھلا رہے ہیں۔ لیکن بیوی کے سامنے تو آدمی یہ کر ہی سکتا ہے خوب جانتے ہوئے کہ اس پر خاک رعب نہیں پڑے گا۔

سردی شروع ہو چکی ہے اور میں نے اپنی شبینہ بیٹھک پھر کھول دی ہے جہاں لوگ کھانے کے بعد کافی کے لئے جمع ہوتے ہیں، تم کبھی آکر دیکھو کہ ہم اپنا کمرہ کتنا صاف ستھرا رکھتے ہیں تو بالکل ہکا بکا رہ جاؤ۔ پلنگ سے لگی ہوئی میز پر کچھ گلاب کے پھول ہیں جو ارباب کا تحفہ ہیں۔ کتابوں کے شیلف پر جنگلی پھول پتوں کا گلدستہ ہے جو نسیم کا تحفہ ہے ایک جانب سے شنیل نمبر ۲۲ کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی ہے جو بیگم ارباب میرے لئے چھوڑ گئی تھیں اور دوسرے کونے سے اس عطر کی تیز لپٹیں آ رہی ہیں جو آمنہ نے بھجوایا تھا۔ رات ڈھلے جب چاند نکلتا ہے تو یہ کسی نواب کا خلوت کدہ معلوم ہوتا ہے۔ صرف اپنا دل اجاڑ ہے کہ اس فضا کو پُر کرنے کے لئے اپنی چھوٹی بڑی محبوباؤں کی ہنسی اور محبت

۱۔ ایلیس، جھیمی، میزی

یہاں موجود نہیں لیکن وہ دِن بھی آجائے گا اگلے ہفتے، اگلے مہینے، اگلے سال کبھی تو آئے گا تو بس اسی دِن کا سوچو اور یہ تصوّر کرو کہ جب وہ آئے گا تو کتنا اچھا دِن ہو گا۔

(۶۳)

۲ دسمبر ۱۹۵۲ء

کتاب کا نیا گرد پوش ٹھیک ہے لیکن اس پر میرا پورا نام لکھنا چاہیئے۔ میرے علاوہ کچھ اور لوگ بھی فیض تخلّص کرنے لگے ہیں۔

میں نے سُنا ہے کہ میاں صاحب[1] یہاں آئے تھے لیکن مل نہیں سکے مجھے کچھ علم نہیں کہ انھیں ملاقات کی اجازت کیوں نہیں ملی اور میں اس بارے میں کچھ کر بھی نہیں سکتا اگر ان کا دوبارہ اِدھر آنے کا ارادہ ہو تو انہیں چاہیئے کہ اس بارے میں پہلے سے کچھ بندوبست کروالیں تاکہ اگر کوئی مغالطہ ہوا ہے تو صاف ہو جائے۔ کتاب کا اقرار نامہ لوٹا رہا ہوں، ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔

تم نے بالی کے لیئے کسی پیغام کا ذکر کیا تھا جو میں سمجھا نہیں ظاہر ہے ہم ایک ہزار روپیہ تو جمع کر ہی سکتے ہیں اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی دے سکتے ہیں۔ یہ کچھ رنج دہ سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن آخر میں نے بھی تو اپنی شادی کے وقت کرائے کیلئے پیسے کسی[2] سے اُدھار لئے تھے۔ دِن بدلتے رہتے ہیں۔ یہ تنگ دستی کے دن بھی بدل جائیں گے تو ملول اور رنجیدہ ہونے سے مطلب؟

(۶۴)

۷ دسمبر ۱۹۵۲ء

آج کوئٹہ سے رفیق[3] ملنے آئے تھے۔ میرے لئے کچھ پھل اور دوسری چیزیں لائے تھے اور ایک سو روپے بھی چھوڑ گئے ہیں۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ چنانچہ اب مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] میاں افتخار الدین مرحوم [2] میاں افتخار الدّین مرحوم سے تین سو روپے قرض لئے تھے۔

[3] رفیق احمد لیبر کمشنر حکومت پنجاب۔ فیض کے بھانجے

آٹوگراف جو تم نے مانگے تھے منسلک ہیں۔ دوستوں کا انتخاب تم خود کر لو۔ نظامی[1] نے لکھا ہے کہ جتنے اشتہار تم چاہو وہ مفت چھاپ دیں گے۔ رؤف[2] سے کہنا کہ کتاب کا ایک نسخہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو علی گڑھ بھجوا دیں اور ایک ڈاکٹر سلیم الزماں کو کراچی میں۔ نقش فریادی کے بارے میں کارواں[3] کا کوئی جواب نہیں آیا۔ تم آؤ گی تو طے کر لیں گے۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ چغتائی صاحب[4] نے سرورق بنا دیا ہے۔ اُمید ہے کہ اچھا ہوگا۔ اُن کا ایک محبت بھرا خط بھی آیا تھا۔

ہمارے چھوٹے سے باغیچے میں اب پھول کھلنے لگے ہیں جو لطف و انبساط کا مستقل سامان ہیں۔ ہر صبح آنکھ کھلتے ہی میں تصور کرتا ہوں کہ آج سبزہ زار پر کونسے نئے رنگ ہمارا خیر مقدم کریں گے اور بستر سے اُٹھتے ہی یہ دیکھنے جاتا ہوں کہ آج کونسی نئی ولادت ہوئی ہے۔ عام طور سے مایوسی نہیں ہوتی اور کوئی نہ کوئی نیا پھول دیکھنے میں آتا ہے۔ جس دن پہلا کھلا تھا — نام تو نہیں جانتا — شوخ قرمزی رنگ کا چھ پتیوں والا پھول تھا، اُس دن مجھ جیسے پتھر دل پر بھی عجیب کیفیت طاری ہوئی تھی۔ اب ہم نے انڈوں سے کچھ چوزے بھی پیدا کر لئے ہیں۔ اُن چوزوں کی اور ہماری بہت بارآور بلی کی کوششوں کی وجہ سے یہاں سب لوگوں کے مادرانہ اور پدرانہ جذبات کی تسکین ہوتی رہتی ہے۔ تمہارے لئے ایک چھوٹا سا تحفہ ملفوف ہے۔ غالباً یہ اس جگہ پر آخری نظم[5] ہوگی اور اس سے تمہاری قمیص کا حساب پورا ہو جائے گا۔ آجکل بہت سے سالنامے نکل رہے ہیں اور مجھ پر فرمائشوں کی بھرمار ہے اس لئے جسے جی چاہے بھیجدو۔ آج ایک اچھی ہسپانوی کہاوت سنی۔

HOW NICE IT IS TO DO NOTHING AND REST AFTER WARDS.

۱۔ حمید نظامی مرحوم مدیر نوائے وقت، لاہور ۲۔ رؤف ملک

۳۔ مکتبہ کارواں، لاہور ۴۔ عبدالرحمن چغتائی

۵۔ یاد (دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں)

کیسا بھلا لگتا ہے کہ آدمی کچھ نہ کرے اور اُس کے بعد ستانے بیٹھ جائے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۵۲ء (۶۵)

یہ مختصر خط تمہارے حوصلا افزا خط کے شکریے کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ یہاں ابھی تک کوئی خبر نہیں ہے اور غالباً ابھی کچھ دنوں تک مقدمے کے متعلق کوئی خبر ہوگی بھی نہیں۔ آج میں نے اپنی کتابیں دوبارہ کھولی ہیں اور پھر پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ اگر دل نے ساتھ دیا تو شاید ایک دو دن میں کچھ لکھ بھی سکوں۔ اخباروں میں ہمارے شاہکار کا کوئی ذکر دیکھنے کا انتظار رہا لیکن ابھی تک کچھ نظر نہیں آیا۔ اُمید ہے کہ اگلے خط میں تم کچھ بتا سکو گی اور اگر کتاب تیار ہے تو کچھ نسخے بھی بھجوا دو گی۔ کاروان والوں سے بات ہوئی کہ نہیں۔ بہر صورت میں ایک اقرار نامہ بھیج رہا ہوں جس سے تمہارا جی چاہے بات چیت کر لینا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ رائلٹی پیشگی ادا کی جائے۔ میں اگلے تین چار دن میں اپنے مضامین[1] بھی بھجوا دوں گا اور رؤف سے کہنا کہ باقی جو کچھ کرنا ہے وہ خود کر لیں۔ یہ کوئی ایسی خاص کتاب تو نہیں ہوگی لیکن تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ پرُزے محفوظ ہو جائیں تو اچھا ہے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء (۶۶)

کل خط لکھنے کا وعدہ پورا نہیں کر سکا جس کا افسوس ہے۔ لیکن دل اتنا خوش تھا کہ کچھ کرنے کو جی ہی نہ چاہا اور میں نے تمام دن بستر میں گزارا۔ آج بھی کھیل کے وقت سے پہلے اُٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور یہ خط بستر ہی سے لکھ رہا ہوں۔ آخر ایسی چھٹیاں روز روز کب آتی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اُن میں مکمل عیاشی نہ کریں۔ عیاشی کی انتہا یہ ہے کہ میں نے دو دن سے اخبار نہیں پڑھا لیکن بدقسمتی سے آج کے بعد شاید یہ کیفیت قائم نہ رہ سکے گی، ابھی سے کچھ کچھ بوریت ہونے لگی ہے۔ مستقل کاہلی شاید صرف ہسپانویوں یا چینیوں ہی

---

[1] میزان۔ فیض کے مضامین کا مجموعہ

کو راس آسکتی ہے۔ (ماؤ اور اس کے ساتھیوں کے رنگ میں بھنگ ڈالنے سے پہلے کے چینیوں کا ذکر ہے)

تم جیسی جفاکش اور محنتی شخص کو یہ انتہائی خود غرضی معلوم ہوتی ہو گی لیکن وعدہ ہے کہ گھر آئیں گے تو ایسے ہی آرام کا کچھ لطف تمہیں بہم پہنچائیں گے۔ کچھ دن صبح کی چائے میں بناؤنگا بچوں کو اسکول کے لئے تیار کروں گا اور باورچی خانے کا سامان خود نکالوں گا۔ تم سمجھتی ہو گی کہ یہ بالکل ناممکن ہے اور یہ وعدہ ایسا ہی ہے جیسا سگریٹ چھوڑنے کا وعدہ۔ خیر تم دیکھ لینا۔

یہ بکواس میں اس لئے کر رہا ہوں کہ تم سے ملنے کے بعد دل بہت ہلکا اور بے فکر محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ ابھی دل میں کہیں اُس غم کا بوجھ بھی ہے جو تم اپنے ساتھ لائی تھیں اور اُن غموں کا بھی جو پہلے سے میرے ساتھ تھے۔ لیکن میں نے فی الحال کچھ عرصے کے لئے اُن غموں کو الگ رکھ دیا ہے۔ جب تک کوئی تازہ زخم بھر نہ جائے اور دل کسی غم کو مستقل مہمان کے طور سے قبول نہ کرے اُس وقت تک بہتر یہی ہے کہ اس غم سے کنارہ کشی کر لی جائے۔ اگرچہ پھر بھی کبھی کبھی اس سے اچانک مڈبھیڑ ہو ہی جاتی ہے جیسے دہکتے ہوئے کوئلے یا کانچ کے ٹکڑے پر پاؤں پڑ جائے تو ایک لمحے کے لئے دِل بلبلا اُٹھتا ہے لیکن یہ لمحہ بہت جلد پیچھے رہ جاتا ہے۔ اسی لئے میں تمہارے تازہ صدمے کا ذکر نہیں کروں گا۔ نہ تمہیں دلاسہ دینے کی کوشش کروں گا۔ موت کی خوفناک ابدیت کے لئے کوئی بھی موزوں الفاظ نہیں صرف محبّت اور شدّتِ غم کچھ تلافی کر سکتے ہیں اور ان دونوں کیلئے الفاظ درکار نہیں ہوتے۔

۲۹ دسمبر ۱۹۵۲ء

(۶۷)

کتابیں ابھی تک نہیں پہنچیں۔ غالباً کہیں راستے میں ہوں گی۔ کارواں والوں نے جو اقرار نامہ بھیجا ہے اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔ وہ لوگ نقشِ فریادی رائلٹی کی شرائط پر چھاپنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ بعد کی اشاعتوں کے حقوق انہیں منتقل کر دیئے جائیں۔ میں نے انہیں لکھا ہے کہ تم سے براہِ راست تفصیلات طے کر لیں۔ رؤف نے باقی مضامین بھیج

دیتے ہیں لیکن بہتر ہے کہ اب وہ یہاں کچھ فیصلہ ہونے تک انتظار کریں۔ اب تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے۔ انہوں نے پہلے جو کچھ بھجوایا تھا ابھی اس کی تصحیح بھی مکمل نہیں کر سکا۔ آجکل اس گومگو میں کہ نہ جانے کیا فیصلہ ہوگا کوئی ٹھوس کام کرنا مشکل ہے۔ تاہم اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کچھ اشعار[1] گھڑے تھے وہ بھیج رہا ہوں۔ میرے خیال میں ایسے برے نہیں ہیں۔ ہمایوں کو بھیجنے کا ارادہ تھا لیکن جیسے تمہارا جی چاہے کرو۔

یہاں پچھلے چند دن سخت سردی پڑی لیکن اب یہ لہر گزر گئی ہے اور موسم خوشگوار ہوگیا ہے۔ لاہور کا درجۂ حرارت دیکھتا ہوں تو جھرجھری سی آجاتی ہے اور اس خیال سے کہ اس غضب کی ٹھنڈک اور تنہائی میں تم پر اور بچوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ دل دکھتا ہے لیکن یہ بھی اسی طرح گزر جائے گا جیسے اور بہت کچھ گزر چکا ہے۔ آج کل نہ پیچھے کی طرف دیکھنا چاہیے اور نہ دائیں بائیں۔ صرف سامنے مستقبل پر نظر جمائے رکھنا چاہیے تاکہ ہمارے سرد ہاتھ اور تنہا آنکھیں اس سورج کی گرمی اور ملائمت محسوس کر سکیں جو کل ملاقات کی صبح میں طلوع ہوگا جب رات بیت چکی ہوگی اور بادل چھٹ چکے ہوں گے۔ یہ کل اور یہ صبح کوئی ہم سے چھین نہیں سکتا اس لئے مسکراؤ اور روشن اور پرامید دل سے نئے سال کا خیر مقدم کرو۔

(۶۸)

۲ جنوری ۱۹۵۳ء

کل تمہیں یہ لکھنے بیٹھا تھا کہ نیا سال تمہیں زیادہ خوشی کے دن دکھائے لیکن باربار اس بارِ غم کا خیال آتا رہا جو اس دن طفیل کی میت کے ساتھ لاہور کی جانب رواں تھا اور میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ دو روز طوفانِ باد و باراں کے بعد (چھ مہینے میں یہاں یہ پہلی بارش تھی) دھوپ نکلی تھی اور بہت روشن اور درخشاں دن تھا جسے سب لوگوں نے نیک شگون سمجھا۔ میں تمام صبح انتظار میں بیٹھا رہا یہ جانے بغیر کہ کس چیز کا انتظار ہے اور پھر تمہارا اور بچوں کا

---

[1] غزل۔ یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں

سوچتا رہا۔ پھر وہ سب میٹھی اور غمگین باتیں یاد آئیں جن سے میری زندگی کے شب و روز عبارت ہیں۔ تمہاری ماں اور اپنی ماں کے بارے میں سوچا جو دونوں اپنے اپنے غموں سے نڈھال ہیں اُن لکھو کھا ماؤں بیویوں اور بچوں کا سوچا جو اس نوزاد آسمان کو تک رہے ہیں اور اس تلاش میں ہیں کہ شاید اس میں کہیں اُن کے سفّاک درد و غم سے نجات کی کوئی نشانی یا کوئی اشارہ موجود ہو۔ پھر مجھے پُشکن کی خوبصورت دُعا یاد آئی۔ "اے خدا لوگوں کی راہوں پر رحمت کر"۔ اور دل محبت اور تقدیس سے کچھ اس طرح لبریز محسوس ہوا کہ چین آ گیا۔

سہ پہر میں دستِ صبا کی تقریب منانے کے لئے (کتاب ہم نے ابھی تک نہیں دیکھی) ساتھیوں نے میری چائے کی دعوت کی (پھولوں کے ہار وغیرہ وغیرہ سمیت) کتنی اچھی اور پیاری بات تھی۔ پھر اصل اچنبھے کی بات ہوئی۔ جیلر نے مجھ سے آ کر کہا آپ کی "ملاقات[1] آئی ہے"۔ یہ آمنہ تھیں جو حسبِ معمول تحفوں کا انبار ساتھ لائی تھیں۔ اتنی خوشی ہوئی کہ قریب قریب رونا آ گیا۔ ہم اتنی گرمجوشی سے ملے کہ دیکھنے والوں کو ہمارے بھائی بہن ہونے میں شبہ ہونے لگا ہوگا۔ کل وہ تم سے ملنے لاہور جا رہی ہیں اور شاید اس خط کے ساتھ ہی وہاں پہنچیں گی۔ چنانچہ اگلے کچھ دِن یہاں کے فیصلے کے اِنتظار تک ان کا تمہارا ساتھ رہے گا۔ فیصلہ اب آج کل ہی کی بات ہے۔

یہ سُن کر دل بہت متاثر بھی ہوا اور بہت مطمئن بھی کہ بابی[2] کے میاں نے تمہیں تحفہ[3] بھجوایا ہے۔ مجھے شُبہ تھا کہ شاید دوستی کا رشتہ ہمارے حالات کا بوجھ برداشت نہ کر سکے بہت اچھّا ہوا کہ یوں نہیں ہے۔

---

[1] یہ جیل کی خاص اصطلاح ہے۔ [2] پطرس بخاری۔ خط میں عمداً اُن کا نام نہیں لکھا گیا تھا [3] پانچ سو روپے

۵ جنوری ۱۹۵۳ء (۶۹)

اَب تک بُری[1] خبر تمہیں پہنچ چکی ہوگی۔ اِس سے اپنا دِل زیادہ پریشان نہ ہونے دو۔ جیسے ہم نے پچھلے دو سال گزار لئے یہ بھی گزار لیں گے۔ اصل میں کوئی مصیبت اتنی بُری نہیں ہوتی جیسی کہ بظاہر نظر آتی ہے اور جب گزر جائے تو بہت عجیب لگتا ہے کہ ہم اس کے بارے میں اتنے ہراساں کیوں تھے۔ ذرا سوچو تو اِس نئی مُصیبت کے آخر کیا معنی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال کی مزید جُدائی۔ اگر تم گردوپیش نگاہ دوڑاؤ تو ہندوستان پاکستان میں تمہیں شاید ہی کوئی نیک آدمی ایسا ملے گا جس نے برطانوی عہد میں اس سے زیادہ جیل نہ کاٹی ہو۔ اور کسی کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ بدقسمتی سے نیکی اور نجات کی کوئی سہل راہ نہیں ہے، اِس راہ میں ہم سے جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ کسی طرح غیر معمولی نہیں ہے۔

۶ جنوری:۔ مجھے افسوس ہے کہ کل کے واقعہ کی گہما گہمی میں یہ خط ختم نہ ہو سکا۔ ابھی سے کل کے واقعات بالکل مہمل اور دِل سے دور معلوم ہونے لگے ہیں۔ حقیقی اور بامعنی بات صرف اتنی ہے کہ میں نے کوئی جُرم نہیں کیا، کوئی گناہ نہیں کیا اور میرا دِل بالکل مطمئن اور پُرسکون ہے۔ آج صبح ہمارے ساتھی اِسی بات کی شکایت کر رہے تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ کل رات نو بجے کے قریب جب وہ میرے ہاں سے اُٹھ کر گئے تو بس دس منٹ کے اندر میں سو گیا اور خراٹے لینے لگا جس سے اُن کی نیند خراب ہوئی۔ ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا اس لیے کہ صبح جب میری آنکھ کھُلی تو کمرے میں دھوپ آ چکی تھی۔ اچانک میں نے سوچا کہ کل ہو کیا تھا۔ اور اس ساری خرافات پر ہنسی آنے لگی۔ پھر ہم فلسفہ چھانٹنے لگے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ایک آدمی جو زندہ اور صحت مند ہے کیسا بھی غمگین اور دردمند کیوں نہ ہو اُس شخص سے بہر صورت بہتر ہے جو زندہ ہے لیکن بیمار ہے۔

---

[1] مقدمے کا فیصلہ

اور وہ شخص جو زندہ اور بیمار ہے لیکن اُسے صحتیاب ہونے کی اُمید ہے اُس شخص سے بہتر ہے جو زندہ اور بیمار ہے لیکن شفا سے نا اُمید

اور یہ آخری شخص اُس شخص سے بہتر ہے جو کہ مَر چکا ہے

اور جو مَر چکا ہے وہ تو کوئی شخص ہی نہیں اس لئے وہ نہ کسی سے بہتر ہے اور نہ بدتر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص بھی زندہ ہے وہ کسی نہ کسی سے بہتر ہے اس لئے اُسے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا اس سے مجھے گرمانی کا وہ قصّہ[1] یاد آگیا جس میں "دو صورتیں ہیں" کی تکرار ہے اور پھر مجھے ہنسی آگئی۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ بہت وزنی اور سنجیدہ معاملات کے بارے میں ہمارا رَویّہ قطعی غیر سنجیدہ ہے، تو ہم معافی چاہتے ہیں۔ لیکن یہ معاملہ ہے ہی اس قدر واہیات۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ تمہارے لئے یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے اور تمہارے تھکے ہوئے کاندھوں پر لمبے عرصے کے لئے مزید بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ لیکن اپنا دل مضبوط رکھو اور اُن لوگوں کے بارے میں سوچو جو تم سے کہیں زیادہ کم نصیب ہیں۔ یہ امتحان کیسا ہی سخت کیوں نہ ہو آخر گزر جائے گا تم اس کا سوچو کہ جس دن یہ ختم ہوگا وہ دن کیسا

---

[1] نواب مُشتاق احمد خاں تقسیم سے پہلے برطانوی ہند میں افرادی طاقت کے محکمے کے ڈائرکٹر تھے۔ دو صورتیں والا قصّہ انہوں نے اس طرح سُنایا۔ پچھلی جنگِ عظیم (۱۹۳۹-۱۹۴۴) میں فوجی بھرتی کا کام ہو رہا تھا۔ بھرتی کرنے والے افسر اور بھرتی ہونے والے اُمیدواروں میں سے ایک کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ افسر نے اُس اُمیدوار سے کہا "اگر تم بھرتی کر لئے گئے تو دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ اپنے ہی وطن یعنی ہندوستان میں تمہیں رکھا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تمہیں پردیس بھیجا جائے۔ اپنے مُلک میں رکھے گئے تو ٹھیک ہے اور کوئی فکر کی بات نہیں۔ اور جو کسی اور مُلک بھیجے گئے تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ ایسے ملک بھیجے جاؤ جہاں بالکل امن ہو۔ دوسری صورت یہ کہ وہاں بھیجے جاؤ

عمدہ ہوگا۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ صورتِ حال جیسی بُری نظر آتی ہے ویسی ثابت نہیں ہوگی۔ مجھے خوشی ہے کہ نصیر[1] تمہارے پاس آگیا ہے۔ اُمید ہے کہ وہ کافی دنوں تک تمہارے پاس رہے گا۔ کل آمنہ کا تار بھی آیا تھا جس سے مزید تقویت ہوئی۔ صرف اپنی دُکھیا ماں کے خیال سے دِل دہلتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اور آمنہ دونوں اُن کی کچھ دلجوئی کر سکو گی اور انہیں منوا سکو گی کہ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ آخر میں سَب حالات سُدھر جائیں گے۔ میری طرف سے اُن سے دَرخواست کرو کہ میری وجہ سے انہیں جتنا دُکھ پہنچا ہے اس کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ میرے ضمیر پر اگر کوئی بوجھ یا گناہ کا احساس ہے تو صرف یہی ہے۔

۱۲ جنوری ۱۹۵۳ء (۷۰)

کل تمہیں تار بھیجا تھا۔ اَور اُس کے بَعد ہی کتابیں پہنچ گئیں۔ چھ عدد۔ اپنے جیل کی تخلیق دیکھ کر دل خوش ہوا۔ اس کی پیدائش میں بہت سا دُکھ شامل تھا اور بہت سی اُمید بھی۔

جہاں جنگ ہو رہی ہے۔ اگر تم ایسے مُلک بھیجے گئے جہاں امن و امان ہے تو یہ تو ٹھیک ہے اور جو جنگ والے علاقے میں بھیجے گئے تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک یہ کہ تمہیں ہیڈ کوارٹر ہی میں رکھا جائے۔ دوسری صورت یہ کہ محاذِ جنگ پر بھیجا جائے۔ ہیڈ کوارٹر میں رکھے گئے تو ٹھیک ہے اور جو محاذِ جنگ پہ بھیجے گئے تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک صورت یہ کہ دشمن سے مقابلہ ہی نہ ہو اور دوسری صورت یہ کہ مقابلہ ہو جائے۔ مقابلہ نہ ہوا تو ٹھیک ہے اور جو مقابلہ ہو گیا تو پھر دو صورتیں ہوگی۔ ایک صورت یہ کہ تم دشمن کو مار ڈالو۔ دوسری صورت یہ کہ دُشمن تمہیں مار ڈالے۔ اگر تم نے دشمن کو مار ڈالا تو ٹھیک ہے۔ اور اگر دشمن نے تمہیں مار ڈالا تو پھر دو صورتیں ہوں گی۔ ایک صورت یہ کہ تم جنّت میں داخل ہو جاؤ۔ دوسری صورت یہ کہ جہنّم واصل کر دیئے جاؤ۔ جنّت بھیجے گئے تو ٹھیک ہے اور جو جہنّم بھیجے گئے تو وہ جہنّم کسی طرح فوجی بھرتی کے اس دفتر سے تو بُری نہ ہوگی۔

1/ نصیر احمد خاں۔ فیض کے بھانجے

چغتائی صاحب کو بہت عمدہ سرورق کے لئے میرا شکریہ پہنچا دینا اور رؤف کو بھی کہ انہوں نے کتاب اچھی چھاپی۔ صرف ایک نقص ہے۔ کتابت کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اتنی مختصر کتاب میں یہ غلطیاں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ میں نے پروف میں جو تصحیح کی تھی وہ بھی نہیں ہوئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اب اس بارے میں کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ رؤف کو چاہیئے کہ جو نسخے ابھی بکے نہیں ہیں ان میں خود تصحیح کر دیں اور عام پڑھنے والوں کے لئے امروز اور نوائے وقت میں ایک صحت نامہ چھپوا دیں۔ میں نے پہلی نظر میں جو غلطیاں دیکھی ہیں ان کی فہرست بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے کچھ اور بھی ہوں۔ تم نے لکھا ہے کہ آپ لوگ دوسرے ایڈیشن کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر کتاب بہت بک رہی ہے تو ہمیں بھی لکھو، تاکہ دل خوش ہو۔ تم نے انگریزی میں تبصرہ کرنے والوں کے نام پوچھے ہیں۔ تاثیر کے انتقال اور بخاری کے پردیس چلے جانے کے بعد مجھے تو کوئی سوجھتا ہی نہیں۔ خواجہ[1] منظور ہیں لیکن وہ اتنے سست ہیں کہ لکھیں گے نہیں۔ پہلا زمانہ ہوتا تو آغا حمید سے کہہ سکتے تھے لیکن آجکل اس کا سوال پیدا نہیں ہوتا اس لئے آفتاب[2] سے پوچھ لو یا اُن سے کہو کہ کوئی نام تجویز کریں۔

نہ جانے تم اس نئی افتاد سے کیسے نبٹ رہی ہو۔ میرا خیال تھا کہ پہلے ہنگامی ردِ عمل کے بعد ویران اور تنہا دنوں کے طویل سلسلے کے خیال سے اپنا دل ضرور پژمردہ ہوگا لیکن ابھی تک ایسا کوئی احساس نہیں ہوا۔ اس کے خلاف جو بھی دن گزرتا ہے اپنا ذہن کچھ زیادہ باآرام، متوازن اور پُر سکون معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب مستقبل کے بارے میں کوئی بے یقینی باقی نہیں رہی۔ منزل مقرر ہو چکی ہے اس لئے ہر بیتے ہوئے دن سے فاصلہ ایک قدم کم رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور سے پرسوں ایک ہفتہ پورا ہو جائے گا (سزا کی میعاد

---

[1] خواجہ منظور حسین سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور

[2] ڈاکٹر آفتاب احمد خاں سابق اُستاد گورنمنٹ کالج لاہور۔ ملٹری اکاؤنٹس سروس سے وابستہ

کا ایک ہفتہ) اور تین ہفتے کے بعد ایک مہینہ گزر چکا ہو گا۔ میں نے اس کا حساب یوں لگایا ہے کہ اگر کوئی رعایت نہ بھی ہو اور پوری میعاد (قیدِ بامشقت میں عام طور سے ہر سال مشقت کے عوض چند ہفتے معاف کر دیئے جاتے ہیں، جیل کے سالانہ معائنے پر بھی کچھ رعائت ملتی ہے) کاٹنی پڑے تو بھی تیس مہینے بنتے ہیں یعنی ایک سو بیس ہفتے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ پرسوں صرف ایک سو اُنتیس ہفتے باقی رہ جائیں گے اور بات ابھی شروع بھی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے اپنے لئے اِتنا کام تجویز کر رکھا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا اس مختصر عرصے میں اسے پورا کیسے کریں گے، تم یہ سمجھ لو کہ ہم بھیک[1] کی طرح ایف آر سی ایس کرنے چلے گئے ہیں یا کسی اور دوست کی طرح ڈاکٹریٹ کا تھیسس لکھ رہے ہیں۔ یہ کام ختم ہو چکے گا تو واپس آ جائیں گے۔ صرف ندامت اس بات پر ہے کہ ہم یہاں آرام سے بیکار بیٹھے ہیں اور تم پر اپنی اور بچّوں کے لئے روزی حاصل کرنے کی ذمّہ داری ہے جو مردوں کا کام ہے اور اچھے مرد یہ کام عورتوں پر نہیں چھوڑا کرتے۔ یہ خیال آتا ہے تو ندامت سے پسینہ آ جاتا ہے لیکن کر ہی کیا سکتے ہیں۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ اپیلیں دائر ہونے تک ہم لوگ یہیں رہیں گے یعنی اگلے ماہ تک۔ اور پھر شاید ہمیں گھر سے کہیں قریب لے جائیں اس لئے اگلی ملاقات اس وقت تک اُٹھا رکھو جب ہمیں اپنا ٹھکانہ معلوم ہو جائے۔ اپنا دِل مضبوط اور اپنا سر بلند رکھو اس لئے کہ کل ہمارا ہے۔ مجبوری کے عالم میں تلخی اور غم و غصّہ سب بیکار باتیں ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی سب صلاحیتیں زیادہ مفید اور تعمیری کاموں کے لئے محفوظ رہیں۔

(۷۱)

۱۶ جنوری ۱۹۵۳ء

تمہیں غالباً یہ پوچھنے کی فکر ہو گی کہ نئی صورتِ حال میں ہماری خط و کتابت کا کیا قاعدہ ہو گا۔ تمہاری پریشانی دُور کرنے کے لیے مجھے سب سے پہلے اسی بارے میں لکھنا چاہیئے تھا لیکن

---

[1] ڈاکٹر غلام بھیک۔ فیضؔ کے دوست۔

جب لکھنے بیٹھو اپنا کچھ لکھنے کو ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں ذہن سے اُتر جاتی ہیں۔ ہماری بود و باش کے سب طور طریقے قریب قریب وہی ہیں جو اب سے پہلے تھے اس لیے پریشانی کی کوئی وجہ نہیں اور تم پہلے کی طرح خط و کتابت جاری رکھو۔

میں نے گزشتہ خط میں لکھا تھا کہ سفر کے اخراجات کے پیش نظر ہمارے کسی اور جگہ منتقل ہونے تک تم ملاقات ملتوی کر دو معلوم ہوتا ہے اس میں ابھی دو ماہ اور لگ جائیں گے جو زیادہ ہی لمبا عرصہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے کو دیکھ لینے سے کچھ تشفی بھی ہو جائیگی اور ہم یہ نیا بوجھ زیادہ دلجمعی سے برداشت کر سکیں گے اس لیے اگر سفر خرچ کے پیسے ہیں تو تم ہی آجاؤ، مجھ سے ملنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی، اگرچہ اب ملاقاتوں کی تعداد شاید کم کر دی جائے۔ جو لوگ ہم سے پہلے مل چکے ہیں وہ اب بھی ویسے ہی مل سکتے ہیں۔ خاص اجازت تو صرف اُن ملاقاتیوں کے لئے درکار ہے جو پہلے یہاں نہیں آئے۔ اس میں بھی کوئی ایسی دقت نہیں۔ صرف کچھ پہلے سے اطلاع ہونی چاہیئے۔ لیکن غالباً اب تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ جو لوگ اب تک مل چکے ہیں اُن کے علاوہ اب شاید ہی کسی کو یہاں آنے میں دلچسپی ہو۔

جیسے میں نے لکھا تھا میں نے تو نئے حالات سے پوری طرح سمجھوتہ کر لیا ہے۔ صرف تم لوگوں کی خیر و عافیت کے بارے میں کبھی دل کو پریشانی ہوتی ہے لیکن تمہاری ہمّت اور بہادری کا سوچ کر اپنے دل کو تسلّی دے لیتا ہوں۔ اگرچہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس بہادری سے جسم و جاں پر کیا گزرتی ہے۔ ایسے حالات میں دردِ دل کی کچھ رعایت بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے اور اپنے غم کے سامنے سر جھکانے پر نادم نہ ہونا چاہیئے۔ البتہ تحمّل اور برداشت کے پُل صراط پر قدم میں کوئی لغزش نہیں آنی چاہیئے اور دُنیا والوں کے سامنے سر نہیں جھکنا چاہیئے۔

میں آجکل ایک بہت دہشت ناک کتاب پڑھ رہا ہوں UPTON SINCLAIR کا ناول THE JUNGLE۔ اس میں شکاگو کے فلاکت زدہ محلّوں میں بسنے والے مزدوروں کی جد و جہد بیان کی گئی ہے اسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ نکبت اور بدبختی کا یہ عالم تو ہمارے ہاں

بھی نہیں۔ ان کے مقابلے میں اپنی تکالیف بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہیں۔ آجکل مَیں نے کئی طرح کے کام شروع کر رکھے ہیں جو تسلی بخش طریقے سے ہو رہے ہیں۔ مَیں نے فرانسیسی بھی دوبارہ شروع کر دی ہے۔ اب جب تم آؤ ہمارے اُستاد[1] سے ایک فارسی لُغت لیتی آنا اور حفیظ ہوشیارپوری سے کہنا کہ عروض پر ایک آدھ کتاب عاریتاً بھجوا دیں۔

۱۷ جنوری ۱۹۵۳ء (۷۲)

فیصلے کے بعد یہ میرا چوتھا خط ہے اس لئے ہم تم سے کافی آگے ہیں۔ تم نے خط میں جو کچھ لکھا ہے اور جس پیرائے میں لکھا ہے اُسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اور اگر تشویش یا پریشانی کا کوئی شائبہ دِل میں تھا بھی تو اب نہیں رہا۔ سب آزمائشوں کے باوجود زندگی ایسی خوش آئند معلوم ہوتی ہے کہ صبح اُٹھتا ہوں تو بے وجہ گانے کو جی چاہتا ہے۔ اس میں بہت کچھ تمہارا بھی حصّہ ہے جس کے لئے شکرگزار ہوں۔

یہاں کوئی بات لکھنے کو نہیں ہے اور اب کچھ کرنے کو بھی نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ نجات اور مُلاقات کے دِن کا انتظار کریں۔ اب اس بارے میں کوئی بے یقینی باقی نہیں۔ اِسلئے انتظار کے دِن برابر بیتے جا رہے ہیں۔ ہر دن جو گزرتا ہے اور ہر رات جو ختم ہوتی ہے ماضی میں دفن ہو جاتی ہے۔ صرف آنے والا دِن زندہ ہے، اُس کی اُمید اور گیت زندہ ہیں صرف اُسی کا سوچنا چاہیئے اور اُس کی آمد کے جشن کی تیاری کرنی چاہیئے۔

سردیوں کا موسم گزر چکا ہے اور آجکل یہاں بالکل وسطِ بہار کا موسم ہے۔ ہمارا باغیچہ رنگوں سے دہک رہا ہے اور آجکل ہم ایک نیا باغ لگانے کے منصوبے بنا رہے ہیں، اگرچہ اس کی بہار شاید ہم نہ دیکھ سکیں۔

---

[1] صوفی تبسم

۱۹ جنوری ۱۹۵۳ء

(۷۳)

دیکھ لو دو ہفتے گزر بھی گئے (اب صرف ایک سو اٹھارہ باقی ہیں) اور دن بہت تیزی سے نہ سہی لیکن پھر بھی مستقل اور بدستور گزرتے جا رہے ہیں۔ تمہیں شاید کوہ پیماؤں کا قاعدہ معلوم ہو۔ وہ یہ ہے کہ اگر چڑھائی سخت اور طویل ہو تو صرف اگلے قدم کو دیکھنا چاہیئے اور جس چوٹی تک پہنچنا ہے اُدھر نگاہ نہ کرنی چاہیئے۔ ورنہ جب تک وہاں پہنچ نہ جائیں وہ ہمیشہ اتنی دُور دکھائی دے گی کہ حوصلہ ہار دینے کو جی چاہے گا۔ صرف ایک قدم اور اُس کے بعد اگلے قدم پر توجہ ملحوظ رکھو تو اچنبھا ہو گا کہ فاصلہ اتنی جلد کیسے کٹ گیا۔ اس یکسوئی کی وجہ سے خوف اور بددلی سے بھی نجات ہو جاتی ہے۔ تم نے پوچھا ہے کہ اس دوران میں عمر اور وقت اپنی جوانی اور شکل و صورت پر جو غضب ڈھائیں گے اس کا صلہ کیا ہے۔ ایک بڑی حقیقت جو میں نے یہاں دریافت کی ہے یہ ہے کہ اپنی عمر اور شکل و صورت صرف اجنبی اور بیگانہ لوگوں کے لئے اہمیت رکھتے ہیں اور جس عمر میں بیگانے اِدھر توجہ دینے لگتے ہیں اُس عمر میں آپ بیگانوں سے دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں جیسے جیسے اجنبی دُنیا سے تعلقات کا دائرہ تنگ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اپنی نجی دنیا کے رشتے زیادہ گہرے، زیادہ مکمّل اور زیادہ آسودہ ہوتے ہی جاتے ہیں۔ جس طرح ہر روز سماجی دُنیا بتدریج زیادہ بیگانہ ہوتی جاتی ہے اُسی انداز سے ہر روز اپنے عزیز عزیز تر ہوتے جاتے ہیں اس لئے کہ محبت اور دوستی کا صرف یہی ایک سرمایہ اپنے پاس رہ جاتا ہے اور جذباتی آسودگی کے لئے اُسی خزینے پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ فطرت کے نظام میں جوانی کی دولت سے محرومی کا صلہ یہی ہے کہ بیتے ہوئے دنوں سے جو کچھ ورثے میں ملتا ہے اس کا شعور اور اُس کی قدر پہلے سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ جب براؤننگ نے لکھا تھا کہ بڑھاپے تک میرے ساتھ چلو۔ تو یقیناً ذاتی تعلّقات کی یہی گہرائی اور استواری اُس کے ذہن میں ہو گی جو صرف عمر کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ مجھے تو اب یہ گمان ہونے لگا ہے کہ صحیح محبّت اور دوستی سن رسیدہ ہونے سے پہلے ممکن ہی نہیں۔ یہ رشتے اُن ہی لوگوں کے مابین ممکن ہیں جو جوانی کے لہو و لعب

کو پیچھے چھوڑ چکے ہوں جب طرح طرح کے دلکش چھلاوے دامنِ دل کھینچتے ہیں۔ جوانی کی عاشقی تو سب مایا ہے، سب فریبِ نظر ہے اگرچہ ہر فریبِ نظر حسین بھی ہوتا ہے اس لئے قابلِ قدر بھی۔ شاید تمہیں ہماری عقل و حکمت پر ہنسی آرہی ہو گی اس لئے بس کرتے ہیں۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہاں ہمارے رہن سہن کے بارے میں کسی پریشانی کی ضرورت نہیں، اس میں کچھ خاص فرق نہیں آیا سوائے اس کے کہ میل ملاقات میں کچھ کمی کرنی پڑے گی جو ہمیں پہلے بھی کچھ زیادہ نصیب نہیں تھی۔

تم نے سرکاری مراسلوں کی بوالعجبیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے دل میلا نہ کرنا چاہیئے۔ اوّل تو مراسلہ نویسوں کا معیارِ لیاقت تمہیں معلوم ہے دوسرے ہم مشرقی لوگ لکھتے وقت الفاظ پر کچھ زیادہ توجّہ نہیں دیتے۔ میری مُراد ہے اپنے الفاظ پر۔ ہم صرف دوسرے فریق کے الفاظ میں مین میخ نکالتے رہتے ہیں۔

(۷۴)

۲۸ جنوری ۱۹۵۳ء

دو دن ہوئے میں صبح بیدار ہوا تو صبح کی ہوا میں ایک نئی ملائمت محسوس ہوئی۔ بادِ بہار کی مانوس اور جانی پہچانی نرمی۔ میں ڈریسنگ گون پہنے بغیر باہر نکلا اور صبح نے اس تاثر کی توثیق کی کہ واقعی بہار آ چکی ہے اس لئے کہ صبح کی رنگت بدل چکی تھی۔ یہ صرف درجۂ حرارت کی بات نہیں ہے۔ روشنی، رنگ اور فضا کی کیفیت سب کچھ بدل جاتا ہے۔ جب بھی موسم بدلتا ہے ہر نئے دِن میں کچھ دھڑکن سی، کچھ ارتعاش سا، کچھ بے یقینی سی پائی جاتی ہے جو اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ اگلا موسم یعنی گرمی یا سردی کا موسم آکر جم نہیں جاتا۔ کچھ ہیجان آفرینی تو موسم کی ہر تبدیلی میں ہوتی ہے لیکن اسیری کے دنوں سے پہلے اس کا اتنی شدّت سے کبھی احساس نہیں ہوا تھا غالباً اُن دنوں اس کی فرصت ہی نہ تھی۔ نہ دل و دماغ اتنے فارغ تھے کہ ایسے محرّکات سے زیادہ متاثّر ہو سکیں۔

فیصلے کے بعد میں نے اب تک کچھ بھی نہیں لکھا۔ مستقبل کے بارے میں بے یقینی اور

اُس سے متعلّق وسوسے دُور ہو جانے سے سکون اور طمانیت کی ایسی لہر دل میں اُٹھی کہ اُس کی غنودگی سے اب کچھ بیدار ہونے لگے ہیں۔ اور اب جو بہار آئی ہے تو سازِ سخن میں کچھ موہوم سی لرزشیں بھی محسوس ہونے لگی ہیں۔ میں بہار کے نام ایک سلام لکھنا چاہتا ہوں اور زندگی اور اُمید اور محبت کے نام بھی جن کا ہر بار نیا جنم لینا ایسا ہی ابدی عمل ہے جیسا کہ خزاں کی غارت گری۔ ان دلوں کے نام بھی جو غم سے دُھل کر مُصفّا ہو جاتے ہیں اور ہر نئی کلی کے نام بھی جو بے دھڑک فنا اور نیستی کو للکارتی ہے۔ جی چاہا تھا کہ کراچی کے طلبہ کے لئے بھی کچھ لکھوں، لیکن اِس خیال سے نہیں لکھا کہ شاید میں اُن سے پورا انصاف نہ کر سکوں۔ یوں بھی ایسی نظم میں اُسی موضوع کی تکرار ہو گی جو میں ایرانی طلبہ کے بارے میں لکھ چکا ہوں یہ میری سب سے اچھی نظموں میں سے ایک ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اپنے بچوں کو اس سے کم درجے کی چیز پیش کروں۔ شاید بعد میں کبھی کسی اور موقع پر انہیں خراج ادا کر سکوں گا۔ اصل میں اب اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ اعتماد پیدا ہو جائے تو ارادہ ہے کہ پرانی رزمیہ نظموں کے پیمانے پر کوئی بڑی چیز لکھوں جس میں اپنے دَور کی عظیم انسان کشمکشِ حیات کا بیان ہو سکے اس لئے کہ ہمارا دور شاید تاریخ کا سب سے شجاعانہ اور ولولہ انگیز دَور ہے۔ نہ جانے یہ کبھی لکھا جا سکے گا کہ نہیں۔ لیکن ارادہ ضرور ہے۔

۴ فروری ۱۹۵۳ء **(۷۵)**

پہلے کاروباری باتیں ختم کر لیں۔ میں نے عدالت سے درخواست کی ہے کہ منظور رقادر اور محمود علی قصوری کو میری اپیل تیار کرنے کی اجازت دی جائے۔ افتی[1] سے کہو کہ مہربانی سے دونوں کو مطلع کر دیں۔ نقشِ فریادی کے بارے میں قانونی کاغذات پُر کر کے بھجوا دیئے ہیں۔ دستِ صبا کا نیا ایڈیشن کب نکلے گا؟ پہننے کی چیزوں کی پڑتال کر لی ہے۔ درجن کے قریب پاجامے ہیں اور نئے

---

[1] میاں افتخار الدین مرحوم

کرتے بل کرا جائیں تو کرتے بھی درجن بھر ہو جائیں گے۔ اگر تمہیں پیسے لٹانے پر اصرار ہے تو ایک معمولی پتلون اور از قسمِ چپّل کوئی چیز بھجوا دو۔ پیسوں کی مجھے ضرورت نہیں۔

جو کتابیں میں نے منگوائی تھیں وہ عام حوالے کی کتابیں ہیں۔ یعنی کوئی فارسی اُردو لغت اور عروض پر کوئی سی کتاب۔ جو نام تم نے لکھا ہے وہ یا ویسی ہی کوئی اور۔

اب یہاں بہار عروج پر ہے اور یہاں کی اہم خبر صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہاک پودوں میں پھول کھل گئے ہیں۔ ایسے پھول کبھی پہلے دیکھنے ہی میں نہیں آئے۔ کم از کم اس افراط میں نہیں۔ دُھندلے پیازی، ہلکے گلابی، نیلے جن میں سُنہری دھاریاں ہیں اور آتشیں بھڑکیلے سُرخ رنگوں کا طوفان بپا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں بھی یہ پھول بھیجوں لیکن یہ بہت بڑے ہیں۔ اُن کے بجائے سرسوں کی ایک کونپل بھیج رہا ہوں جو بہار کی علامت ہے یہ اتنی نازک ہے کہ شاید تم تک نہ پہنچ سکے لیکن وہ خیال جو اس کے ہمراہ ہے وہ تو پہنچ جانا چاہیئے۔

دوسری نشاط انگیز بات نئی کتابیں ہیں، کچھ وکٹر[۱] نے بھیجی ہیں۔ کچھ اور لوگوں نے۔ ابھی ابھی ایک پیٹ میں بل ڈال دینے والی کتاب ختم کی ہے۔ ایسی ظریفانہ اور مزاحیہ تصنیف بہت زمانے سے نہیں دیکھی۔ کتاب کا نام ہے THE HORSE'S MOUTH ۔ مُصنّف JOYCE CAREY ہیں اور پین گوئن نے چھاپی ہے۔ اگر کہیں سے حاصل کر سکو تو ضرور پڑھو۔ نئے لکھنے والوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جنہیں فرنگی عوام کی روزمرّہ زبان اور اُس کی چھوٹی چھوٹی باریکیوں پر اتنا عبور ہو۔

تو جانم آج فروری کی چار تاریخ ہے یعنی ایک مہینہ بھی گزر چکا اور وقت برابر گزر رہا ہے۔ دِل بشّاش اور مطمئن ہے اور میں تلاش بھی کرتا ہوں تو اس کی تہوں میں خوف و تشویش اور غم و غصّے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ صرف زندگی کی اچھائی کے لئے احسان مندی کا احساس ہے۔

---

[۱] وکٹر کیرنن

۸ فروری ۱۹۵۳ء (۷۶)

ایک اور ہفتہ ختم ہونے کو ہے اور یہاں ہولے کے بوجھل پن میں اور دھوپ کی تیزی میں موسمِ گرما کی تاثیر پیدا ہو چلی ہے۔ گرما کو انگریزی میں SUMMER کہتے ہیں اور بہار کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن ہماری گرمیوں کو بہار کا موسم کہنا بالکل مضحکہ خیز بات ہے اور اس موسم کے خاتمے کو خزاں کہنا بھی بے تکا پن ہے۔ اصل میں بہار اور خزاں تو جذباتی اور رمزیہ الفاظ ہیں جن کا گرمی سردی سے بہت کم تعلق ہے۔ ان کا مفہوم تو ہے ستمِ روزگار اور اس سے نجات، درد و غم کی ابتدار اور اس کا خاتمہ، دل جلانے کے دن اور پیار کرنے کے دن، سختی برداشت کرنے کا عزم اور سُکھ کا سانس، آسائش، خوشحالی اور افلاس و محرومی۔ ہمارے ہاں تو بہار کا ایسا کوئی موسم نہیں آتا۔ صرف گرمی سردی کا موسم آتا ہے۔ پھر مختلف لوگوں کے لئے موسمِ گرما کا پیغام بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ موسم قریب آئے گا تو تم اس کی آمد پر ہراساں ہوگی، لیکن میں اس کا خوشنودی خاطر سے انتظار کر رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں موسم کی ہر تبدیلی خوش آئند ہوتی ہے۔ کبھی کبھار کسی عزیز چہرے کے دیدار کے سوا یہاں کی زندگی میں یہی واحد تبدیلی ہے جسے ہم جانتے ہیں اس کے علاوہ موسم تبدیل ہوتا ہے تو اور بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں۔ زمین اور آسمان اور پیڑوں کی رنگت بدل جاتی ہے، رات کو سونے کی جگہ، پڑھنے، گپ کرنے اور سونے جاگنے کے اوقات، زندگی کا روزمرّہ معمول اور سوچ اور احساس کا پیرایہ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اور اگر کسبِ لُطف اور حیرتِ نگاہ کی حس باقی ہو تو یہ سب کچھ بہت عجیب اور بہت اچھا لگتا ہے، دل کو فرحت ہوتی ہے۔

جیل خانے میں آدمی کتنا خود غرض ہو جاتا ہے۔ میں اِن لذّتوں کا ذکر کئے جا رہا ہوں حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ تنہا محنت کش عورتوں کے لئے اور ہم جیسے تنگ دستوں کے بچّوں کے لئے اس موسم کے کیا معنی ہیں اور اُن لوگوں کے لئے کیا معنی ہیں جو ہم سے بھی زیادہ تنہا اور محتاج ہیں؟ اپنی مصیبت میں اُن کی مصیبت بھی شامل ہے۔ اپنی تنہائی کے ساتھ اُن کی

تنہائی بھی لگی رہتی ہے اور دُنیا بھر کی دُکھی ماؤں کا دُکھ اور سَب فرقت زدہ بیویوں اور محبوباؤں کا دَرد اور سَب بچّوں کے آنسو جنہیں ظالم ہاتھ اُن کے اپنوں کے پاس جانے سے روکتے ہیں لیکن اُن کے دَرد کے ساتھ اُن کی ہمت اور اُن کا تحمّل بھی اپنے سَاتھ لگا رہتا ہے، یہ ایک دوسرے کی تلافی کرتے رہتے ہیں اس لیئے دِل ٹھوکر نہیں کھاتا۔

تم اس بات سے رنجیدہ ہو کہ کسی نے تمہیں لارڈ کلایو اور وارن ہیسٹنگز کے جرائم کا طعنہ دیا۔ یہ واقعی بہت تکلیف دہ اَور دِل دُکھانے والی بات ہے لیکن قومی منافرت کا خاصہ ہے کہ وہ ہر شے پر محیط ہوتی ہے اور کوئی بھی شکار ہاتھ آجائے خواہ وہ کیسا ہی معصوم اور بے گناہ کیوں نہ ہو، اُسے ایذا پہنچانے سے نہیں چوکتی۔ اِسی لیئے ایسی منافرت اور تعصّبات سے جنگ و پیکار ضروری ہے۔ اِسی سبب سے ہم نفرت اور تنگ نظری کے خلاف انسان دوستی اور اخوّت کی عالمگیر جدوجہد میں شامل ہیں۔ جہاں تک طعنہ زنی اَور تہمت تراشی کا سوال ہے میرے اپنے ہم وطنوں میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو گزشتہ واقعات کے بعد مجھے بھی ایک خونخوار طالع آزما سمجھتے ہوں گے۔ ایسے الزامات پر مجھے اکثر ہنسی آتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ جو لوگ مجھ سے واقف ہیں اُن کی نظر میں یہ تہمتیں بالکل بے معنی ہیں اور جو ناواقف ہیں ان کی رائے بالکل بے وقعت ہے۔ یہی بات تمہارے بارے میں بھی صحیح ہے۔ "جو[1] لوگ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں" اُن کے بارے میں وہی رَویہ اختیار کرنا چاہیے جو حضرت مسیح کا تھا۔ صرف اخلاق کی وجہ سے نہیں بلکہ عملی مصلحت کی خاطر۔ یوں نہ کرو تو اپنا سکون و اطمینان اُنہی بہتان طرازوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اَور دُنیا میں ایسے افراد کبھی کم نہیں ہوتے۔

تمہارے خط میں یہ پڑھ کر بہت ہنسی آئی کہ کسی نے ہمیں ہیرو کہا ہے۔ جیسا تم جانتی

---

[1] انجیل مقدس کا اقتباس

ہو" ہیرو پن" بالکل ہماری لائن نہیں ہے۔ اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو بہادری کا ایک بھی ایسا کارنامہ نظر نہیں آتا جو ہم نے سر انجام دیا ہو۔ بلکہ ہم نے تو کبھی اس کی کوشش ہی نہیں کی اور آجکل جو یہ شہرت یا عظمت مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے اس میں بھی اپنا قصور نہیں ہے۔ میں نے تو یقیناً یہ نہیں چاہا تھا۔ ہم نے زندگی میں صرف ایک ہی بات کی کوشش کی ہے اور وہ یہ کہ اپنے مسلک پر ثابت قدم رہیں۔ اپنی ذاتی نیک نیتی برقرار رکھیں اور کسی لالچ میں آکر اپنی دیانت کا سودا نہ کریں۔ لیکن یہ ایک صفت توان گنت ہزاروں لاکھوں میں ہم سے کہیں زیادہ موجود ہے اس لیے کہ عوام کی اکثریت دیانت دار ہے چنانچہ یہ کوئی ایسی خوبی نہیں جسے کوئی اپنے سے مخصوص کر سکے۔

اپیل کے بارے میں یہ ہے کہ عدالت نے وکلا کو مہلت دینے سے انکار کر دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں کا انصاف اگر منصف نہیں ہے تو CONSISTENT ضرور ہے جمید نظامی اور شفیع کے بہت دوستانہ خط آئے ہیں جن کے لیے اُن کا شکریہ ادا کر دینا۔ میں غالباً کچھ عرصے تک انہیں جواب نہ بھیج سکوں گا۔ میرے پڑھنے لکھنے کے منصوبوں سے تمہیں زیادہ گھبراہٹ نہ ہونی چاہیے۔ ہم نے عمرِ عزیز میں جہالت کا اتنا سرمایہ جمع کر لیا ہے کہ اگلے چند ماہ میں اس سے عہدہ برا ہونا ممکن نہیں اور پھر کتابیں تو تجربے کا بدل نہیں ہیں اور تجربہ درد و محنت سے تمہیں حاصل ہو رہا ہے، ہیرو ہیروئن عمل اور تجربات پیدا کرتے ہیں۔ محض الفاظ کی گردان سے کیا ہوتا ہے۔

آجکل میں کچھ نہیں لکھ رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عروسِ سخن ہمیشہ کے لئے مفرور ہو گئی ہے لیکن یہ کوئی نئی حرکت نہیں اس لئے مجھے معلوم ہے کہ لوٹ آئے گی۔

(۷۷)

یکم مارچ ۱۹۵۳ء

اب کے تم نے بہت زندہ دلانہ خط لکھا، جس سے بہت خوشی ہوئی۔ اس کے علاوہ کل دن میں بھی بہت ہنگامہ رہا۔ صبح اطلاع آئی ایک صاحب ڈاکٹر امداد حسین ملاقات کے

لئے آئے ہیں اور ہم اُن سے ملنا چاہیں گے کہ نہیں۔ یہ محکمہ تعلیم میں ہیں اور میری اُن سے واجبی سی واقفیت ہے۔ ایم اے او کالج امرتسر میں میرے پیشرو تھے، اس کے بعد کچھ عرصے کے لئے گورنمنٹ کالج میں تھے اور پھر بیرونِ ملک مقیم رہے۔ چنانچہ اُن کے آنے سے مجھے کچھ تعجب بھی ہوا کچھ خوشی بھی ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی بیگم اور اپنی بیٹی سلمیٰ سمیت ملنے کے لئے آئے۔ یہ سلمیٰ[۱] ہماری سلمیٰ[۲] کی عمر کی ہے۔ بہت ہی پیاری سی بچی ہے۔ باتوں میں پتہ چلا کہ اصل میں وہی ہماری قدرداں ہے اور اپنے والدین کو ساتھ کھینچ لائی ہے۔ یہ سب بہت اچھا لگا اور ہم نے بہت احسان مند محسوس کیا۔ یہ لوگ کوئی بارہ بجے کے قریب رخصت ہوئے اور ایک گھنٹے بعد ملاقاتیوں کا ایک پورا قافلہ آ گیا۔ سہروردی[۳] تھے اطہر[۴] تھے عارف[۵] تھے اور ایک اور نوجوان جن سے کلکتے میں ملاقات ہوئی تھی جو امریکہ میں ہمارے سفیر[۶] کے چھوٹے بھائی[۷] ہیں۔

یہ خط اس لئے ختم نہ ہو سکا کہ گورنر صاحب جیل کے معائنے کے لئے تشریف لائے اور ہمارے قصرِ بکنگھم میں ہماری قیام گاہ میں بھی قدم رنجہ فرمایا اور رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ میں سہروردی صاحب اور پارٹی کا ذکر کر رہا تھا۔ اپیل کے بارے میں سب باتیں طے ہو گئی ہیں اور تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ عارف سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اس نے آتے ہی کینز کے نظریہ اور رسلانسکی کے مقدمے اور نہ جانے کس کس چیز کے بارے میں سوالات شروع کر دیئے۔ کہنے لگا مجھے یہ سب کچھ تفصیل سے سمجھایئے۔ اس لئے کہ مجھے

۱؎ یہ بچی چند برس پہلے جوان عمر میں فوت ہو گئی ۲؎ سلمیٰ تاثیر۔ شادی کے بعد بیگم محمود الٰہی
۳؎ حسین شہید سہروردی ۴؎ علی اطہر وکیل ۵؎ میاں افتخار الدین مرحوم کے صاحبزادے عارف افتخار ۶؎ محمد علی بوگرہ ۷؎ میاں امین الدین مرحوم جو ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے رشتے کے بھائی تھے ان سے فیض کے خاندانی تعلقات تھے۔

اس بارے میں اپنے ایک بہت رجعت پسند رشتے دار سے بحث کرنی ہے۔ اس نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کون ہے؟ بولا سہیل[1] اور کون

بہت خوشی ہے کہ تمہارا دوسرا ایڈیشن بہت مقبول ہوا۔ لیکن میں حیران ہوں کہ تم لوگ یہ کتابیں کس کے ہاتھ بیچ رہے ہو۔ اب سے دس برس پہلے تو دوسری بات تھی۔ جب ہمیں معلوم تھا کہ کالج کی لڑکیوں میں ہمارے مستقل خریدار موجود ہیں لیکن اُن کی جگہ اب کون نئے گاہک پیدا ہو گئے ہیں اور وہ ہماری خرافات کو کیا معنی پہناتے ہیں یہ سب ہمیں نہیں معلوم۔ میں جانتا ہوں کہ عام لوگوں کی گرہ میں اتنا مال نہیں ہے کہ کتابوں پر ضائع کرتے پھریں۔ اگر اس کے باوجود ہماری کتابیں خریدتے ہیں تو خوشی کی بات ہے۔ تم نے تیسرے ایڈیشن میں اضافے کا پوچھا ہے۔ شاید میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس میں ایک آدھ نظم شامل کر لیں جو پہلے ایڈیشن کی طباعت کے بعد میں نے بھجوائی تھی۔ اس ایڈیشن میں قاسمی[2] صاحب کا مضمون خوشی سے شامل کر لو لیکن اس میں میری تصویر ٹھونسنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے پاس میری ایک ہی تصویر تو ہے اور لوگ اسے بار بار دیکھ کر تنگ آ چکے ہوں گے لیکن میں اس بارے میں کوئی حکم لگانا نہیں چاہتا۔ مجھے دکھاوے اور نمائش سے کچھ فرنگیانہ قسم کی چڑ ہے لیکن اب ہم اس بارے میں اتنے نک چڑھے نہیں جیسے کہ پہلے تھے۔

کلثوم[3] کے بارے میں جو حال تم نے لکھا ہے بہت پُر لطف تھا۔ کچھ اخفا، کچھ شک اور گمان تشہیر کے لئے اچھی چیز ہے اور یہ بھی اچھا ہے کہ ہماری آشنائی کسی کلثوم سے نہیں ہے۔ دُور دُور سے بھی نہیں ورنہ کوئی خاتون دل ہی دل میں ضرور اس کتاب کو اپنا لیتیں

---

[1] میاں افتخار الدین کے دوسرے صاحبزادے سہیل افتخار جو مئی ۱۹۷۱ء میں فوت ہو گئے۔

[2] احمد ندیم قاسمی [3] ایلس کا نام شادی کے بعد فیض کی والدہ نے کلثوم رکھا تھا۔ دستِ صبا ایلس کے نام معنون ہے۔ انتساب کے صفحے پر "کلثوم کے نام" لکھا ہے۔

اَور سمجھتیں کہ ہم پہلی دفعہ کوئی پوشیدہ رازِ عشق ظاہر کر رہے ہیں اَور کچھ تعجب نہیں کہ اس انکشاف سے بے چاری کے دل کی کوئی شریان پھٹ جاتی۔

آج ایک اچھّا جُملہ پڑھا تھا۔ کوئی ماں آسانی سے اَپنا بچّہ کسی کے حوالے نہیں کرتی۔ اَور ہم میں سے ہر کوئی ایک بچّہ اپنے دِل میں لئے پھرتا ہے۔ یہ بچّہ مُستقبل ہے۔ صرف اپنا ہی نہیں ساری دُنیا کا مُستقبل۔

(۷۸)

۳ مارچ ۱۹۵۳ء

اِسلامی تاریخ کا نیا تجزیہ لکھنے کی پیشکش بہت دِل آویز ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام میں بہت شوق سے کروں گا۔ اگرچہ کچھ کہہ نہیں سکتا کہ میں اس کا اہل بھی ہوں یا نہیں۔ فی الحال میں اس تجویز سے زیادہ اُمید وابستہ کرنا نہیں چاہتا یقین نہیں آتا کہ یہ پوری ہو سکے گی۔ مہربانی کر کے حکیم صاحب[1] سے ٹیلی فون پر کہہ دو کہ اگر اس بارے میں پہلے وہ لکھیں تو مجھے سہولت ہوگی۔ لیکن اگر اس میں تکلّف یا حفظِ مراتب کا کوئی پہلو ہو تو مجھے انہیں لکھنے میں عذر نہیں، اگر وہ مجھے لکھنے پر رضامند ہوں تو مناسب ہوگا کہ شرائط وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ اشارہ کر دیں۔

ہندوستان میں دستِ صبا کے چھپنے کا یہ ہے کہ میں کے ایم احمد[2] کو جانتا ہوں۔ لیکن مجھے کچھ علم نہیں کہ وہ طبع واشاعت کا کوئی کاروبار کر رہے ہیں کہ نہیں۔ اگر ایسا ہے تو وہ رائلٹی کیسے ادا کریں گے اَور کب اور کیسے؟ بہتر ہوگا تم یہ معاملات پہلے سے صاف کر لو۔ غالباً سب سے اچھی بات یہی ہے کہ وہ بتنی رائلٹی چمپا یا پھر جُوگل کے پاس جمع کرا دیں۔ چمپا کا ایک اور خط آیا تھا۔ لکھا ہے کہ کے۔ رے (شاید تمہیں یاد ہو پنڈی والے رے جو پنڈی۔ پشاور وغیرہ میں لندن بُک شاپ کے مالک تھے) بھی یہ کتاب چھاپنا چاہتے ہیں۔ اگر احمد سے معاملہ نہ بنے تو رے کی

---

[1] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم [2] دلّی کے ایک پبلشر [3] ایلس کی سہیلی اور فیض کے دوست سُرجیت سنگھ کی بیوی

پیشکش پر بھی غور کر لو۔ شاید تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ گزشتہ تین ماہ سے یہاں کا میس اور حساب کتاب سب ہمارے ذمّے ہے۔ ایسا بہترین انتظام کیا ہے کہ جواب نہیں (دیکھا ہم کیسے کاروباری ہوتے جا رہے ہیں)۔

دستِ صبا کے ترجمے کے بارے میں وکٹر کا خط آیا تھا۔ ساری کتاب کا ترجمہ شاید ضروری نہ ہو۔ غالباً بہتر ہو گا کہ دونوں کتابوں سے انتخاب کر لیا جائے۔ اس طرح کام کم ہو جائے گا اور وکٹر نقشِ فریادی کے بہت سے حصّے کا ترجمہ کر بھی چکے ہیں تم لوگ آپس میں طے کر لو۔ اس پر یاد آیا کہ دوسرے ایڈیشن کے کچھ نسخے یہاں بھجوا دو۔ ابھی ہمارے آدھے ساتھیوں کو کتاب نہیں ملی ہے جس پر وہ ہنمناتے رہتے ہیں۔

تمہارے یہاں آنے کے بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ کچھ دن اور انتظار کر لو تاکہ چھیمی کے امتحانات اور تمہاری مقدمے بازی ختم ہو جائے اور اس ننھی بیوقوف چھیمی سے کہو کہ شہنشاہ شاہجہاں قطعی طور سے اُس کے قابل نہ تھا۔ اُس کی بہت بڑی توند تھی، بہت خوفناک داڑھی تھی اور اُسے مٹھائیوں سے بالکل رغبت نہ تھی۔ ہم اُس کے لئے یقیناً بہتر بر تلاش کرینگے۔ اگر بچّوں کو لاہور قلعے کا حال سمجھانا ہو تو تاریخِ لاہور کہیں سے تلاش کر لینا۔ گھر میں ہو گی یا دفتر میں۔ افسوس کہ اس کام کے لئے ہم خود وہاں موجود نہیں ہیں۔ سادہ لوح خواتین کا دِل لُبھانے کے لئے مُغلیہ عمارتوں کے قصّے کہانیاں بیان کرنا ہمارا محبوب مشغلہ تھا۔ شاید تمہیں وہ زیلما بریمنٹ[1] یاد ہو گی جو اسی بات پر بالکل فنا ہو گئی تھی۔

تم چاہو تو خواتین کے بارے میں اپنی فلسفیانہ بحث پھر سے شروع کریں۔ تم کہتی ہو کہ ہمارے فلسفے میں یہ نقص ہے کہ کج فہم لوگ اسے اپنے مقصد کے لئے مسخ کر لیتے ہیں جس سے بدمزگی اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر یہ لوگ ہر بات میں معقول اور نارمل ہوں

---

[1] ایک امریکی خاتون، صحافی اور سماجی کارکن

تو کج فہمی یا کج روی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے انہیں سمجھانے بجھانے یا اُن کی کسی طرح دستگیری کرنے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یوں نہیں ہے تو کیا انھیں بالکل ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ اگر جہنّم میں جاتے ہیں تو جائیں؟۔ مجھے تم سے اتفاق ہے کہ اپنے ذاتی آرام اور سکونِ قلب کی خاطر یہی بہتر ہے اور بیشتر دانشمند لوگ یہی کرتے ہیں لیکن ایک چھوٹی سی اقلیت اُن خدائی فوجدار قسم کے لوگوں کی بھی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس صورتِ حال میں انھیں ضرور مداخلت کرنی چاہیئے۔ اس خیال سے کہ شاید اس طرح کسی کی بہتری ہو جائے۔ یہ خیال عام طور سے غلط ثابت ہوتا ہے، تو پھر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟۔ میں اپنے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ بہت ہی کم انسان ایسے ہوتے ہیں جو فطری اور بنیادی طور سے بد ہوں (میں افراد کا ذکر کر رہا ہوں اداروں یا جماعتوں کا نہیں) اور بیشتر لوگوں کی فطرت میں مختلف تناسب سے نیکی اور بدی دونوں شامل ہوتی ہیں۔ ابتدائے عمر میں اس امتزاج کی صورت بدلتی رہتی ہے لیکن بعد میں دھیرے دھیرے یہ ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ تب اسے بدلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن جب بھی اسے کچھ زیر وزبر ضرور کیا جا سکتا ہے۔ عارضی طور ہی سے سہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے یا کڑکنے گرجنے سے یہ کام نہیں ہو سکتا البتہ محبت اور دوستی کچھ موثر ہو سکتی ہے۔ کیا اس دردِ سر سے کچھ حاصل بھی ہوتا ہے؟ عام طور سے نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھار، بادو شاید ہوتا بھی ہے۔ بہر صورت اس کام میں ہاتھ ڈالنے کو ضرور جی چاہتا ہے۔ شاید اپنی نیکی کی وجہ سے نہیں بلکہ خود پسندی کی وجہ سے اور حماقت یہی کہتی ہے کہ شاید تم اس قابل ہو کہ کسی کا بھلا کر سکو خواہ جواب میں تمہیں برائی ہی کیوں نہ ملے۔ اور اگر کوئی یہ جتلانے کی کوشش کرے کہ یہ محض حماقت ہے تو ضد میں آکر آدمی اپنی بات پر اور بھی ڈٹ جاتا ہے اور یہ بھی خود پسندی کی ایک صورت ہے۔ غالباً تم سمجھتی ہو گی کہ یہ سب خرافات ہے جو کہ غالباً ہے اس لئے بحث بند۔

تو میری تپِ دق کی مریضہ نمودار ہو گئی۔ مجھے اس کے بارے میں بس اتنا معلوم ہے

کہ وہ مشرقی پنجاب کی مہاجر ہے۔ اس نے ڈاڈر سینی ٹوریم سے مجھے امداد کے لئے لکھا تھا اور میں نے اُسے حکومتِ سرحد سے کچھ وظیفہ اور قائدِ اعظم فنڈ سے کچھ پیسہ دلوایا تھا۔ اگر وہ صحتیاب ہو جائے تو اس خیال سے بہت خوشی ہو گی کہ ہم نے کسی کی جان بچالی۔ عام طور سے تو آدمی کسی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

تم نے پوچھا ہے کہ میرا دل چین سے ہے کہ نہیں۔ بالکل ہے اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہے محسوس ہوتا ہے کہ اپنا ذہن یہاں کے گرد و پیش سے بالکل غافل اور بے خبر ہے۔ کبھی کبھی میں اسے جھنجھوڑ کر جگاتا ہوں تو سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ ہم جیل خانے میں کیا کر رہے ہیں۔ ہم نہ چور ہیں نہ سیاسی لیڈر اور ہمیں یہاں رکھنے میں کس کا بھلا ہو رہا ہے لیکن یہ دنیا عجیب چیز ہے۔ اگلے دن میں نے بیگم جُوناگڑھ کی سزا[۱] کا پڑھا تو کچھ دلچسپ حساب لگانا شروع کیا۔ اُنہیں ایک دِن کی سزا ہوئی تھی۔ چار سال میں چودہ سو ساٹھ دِن ہوتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قریباً پندرہ سو بادر کے ایک قاتل ہیں۔ دل ہلا دینے والی بات ہے کہ نہیں؟

(۷۹)

۱۱ مارچ ۱۹۵۳ء

میں نے یہ خط پہلے اس لئے نہیں لکھا کہ لاہور کی ڈاک بند[۲] تھی۔ میں اس دوران میں تمہارا اور اپنے آفت زدہ شہر کا سوچتا رہا۔ اپنے لوگوں کے مصائب پر دل کڑھتا ہے لیکن شاید اس بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا مناسب نہیں۔ تمہارا تار مل گیا ہے اور اب اس بارے میں پریشانی نہیں رہی۔ تم نے لکھا تھا کہ چھیمی کسی کی شادی میں گئی ہے اس وجہ سے ذرا تشویش تھی۔ اُمید ہے کہ وہ خیریت سے گھر پہنچ گئی ہو گی۔ وکٹر کے بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ غالباً وہ اتنے مصروف ہیں کہ دستِ صبا کا پورا ترجمہ نہیں کر سکیں گے اور میرے خیال میں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ نقش

---

[۱] بانو نام کی ایک کنیز کے قتل میں اعانت کا جُرم ثابت ہوا تھا

[۲] ختمِ نبوّت کی تحریک کے سلسلے میں لاہور میں مارشل لا نافذ تھا

فریادی کے کافی حصّے کا ترجمہ کر چکے ہیں اس لئے دستِ صبا میں سے چند نظمیں شامل کر لیں تو کافی ہے۔

خطوط کی اشاعت کے بارے میں مجھ سے نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کتابی صورت میں یہ بالکل احمقانہ معلوم ہوں گے۔ بہتر یہ ہے کہ اس بارے میں کسی غیر جانبدار آدمی سے پوچھو۔ کاش ایسے قصّوں کا فیصلہ کرنے کے لئے اے ایس بی یہاں موجود ہوتے۔ بہرصورت اگر انہیں چھپوانے کا فیصلہ کرو تو یہ اردو میں چھپنے چاہئیں۔ اگر میں بہت احتیاط اور سوچ بچار سے نہ لکھوں تو ہماری انگریزی تحریر بہت آرائشی اور گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ تمہارے کتاب کے مقدّمے کا کیا ہوا۔ اخبار میں دیکھا ہے کہ تمہیں عارضی حکم امتناعی مل گیا ہے۔ اگر تمہارے حقوق محفوظ ہو جائیں اور دوسرا فریق کسی معقول تصفیئے کے لئے تیار ہو تو زیادہ قصّہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ ہمارا مشورہ ہے حکم نہیں ہے۔

میں نے دوبارہ لکھنا شروع کر دیا ہے اور شاید اس ہفتے کے آخر تک کچھ اشعار ہو جائیں گے۔ اپنے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

(۸۰)

۱۸ مارچ ۱۹۵۳ء

آخر تمہارا خط ملا۔ اس سے پہلے ملنے کی اُمید بھی نہ تھی۔ اور تمہیں بھی میرے خط کا انتظار رہا ہوگا۔ میں تصوّر کر سکتا ہوں کہ تم لوگ کیسے مشکل وقت سے گزر رہے ہو۔ ہمارا جیل خانہ تو کسی اور دُنیا کا ایک گوشہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں نہ حادثاتِ زمانہ کا گزر ہے اور نہ زندگی کے خطرات کی آزمائش۔ یہاں نہ زندگی کا وجود ہے نہ موت کا اور جیتے جاگتے انسان جو ہنستے ہیں روتے ہیں پیار کرتے ہیں اور لڑتے جھگڑتے ہیں سب کسی گرانڈیل افسانوی کتاب کے کردار معلوم ہوتے ہیں جو ابھی تصنیف بھی نہیں ہوئی۔ یہ محسوس کرنے کے لئے کہ ہم بھی زندہ ہیں اور ہم بھی زندوں کی برادری میں اور ان کے دُکھ درد میں شامل ہیں تخیّل پہ کافی زور

۱؎ ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تری انجمن سے پہلے

دینا پڑتا ہے۔ لیکن شاید یہ بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے جیل خانے میں کوئی بھی بات پوری طرح صحیح نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ ان طویل اور بے رنگ شب و روز میں جہاں اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندگی اور موت سے پرے کسی غیر مادی دُنیا میں داخل ہو چکے ہیں وہیں یکایک ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب زندگی سے اپنی یگانگت اور وحدتِ وجود کا بہت شدت سے احساس ہوتا ہے۔ محبّت اور روشنی اور مُسکراہٹ کی تلاش بھی لکھوکھا دِلوں، ان گنت انسانی جسموں کے درد و شجاعت، عالی ظرفی اور کلفت و آلام سے یک جان ہونے کا احساس۔ اور پھر وہ لمحے آتے ہیں جب غلیظ، زرد دیواروں، دھول اور مٹی، زنجیروں، پہروں، وردیوں اور ان سب لعنتی چیزوں پر نظر پڑتی ہے جسے جیل خانہ کہتے ہیں تو یکایک کلیجہ مُنھ کو آنے لگتا ہے۔ موج در موج کراہت اور بیزاری کا سیلاب اندر سے اُٹھتا ہے جس میں اپنی ذات اور باقی ہر چیز غرق ہو جاتی ہے۔ پھر ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ کوئی ننھا سا بیج سیاہ بوجھل مٹی کو بہت سلیقے سے ہٹا کر ایک ننھی سی کونپل زمین سے برآمد کرتا ہے اور اُسے دیکھ کر دلِ بے پناہ اور ناقابلِ بیان مسرّت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اور تمام وقت دل جانتا ہے کہ اسی سبز کونپل کے ننّھے ہاتھوں میں حقیقت بھی ہے اور ابدیت بھی۔ جیل کی دیواریں اور پہریدار اور وردیاں سب جھوٹ ہیں سب غیر حقیقی ہیں۔ اسی صورت سے دل یہ بھی جانتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک لحد میں سو جانے کے بعد بھی جینے والوں کی ملکیت اور ان کے رنج و راحت میں دخیل رہتا ہے۔ جیل میں محرومیاں بہت ہیں۔ لیکن جینے اور ہنسنے اور پیار کرنے کے اسباب میں یہاں بھی کمی نہیں ہوتی۔ محرومیوں کا ذکر آیا تو کل شام کا ایک قصّہ سُنو۔ میں اور پوشنیؔ[1] کراچی ریڈیو سے امریکی POP موسیقی سُن رہے تھے۔ ایک ریکارڈ کے شروع ہونے سے پہلے اناؤنسر نے اپنے مخصوص امریکی لہجے میں کہا "تو لوگو تیّار! HERE WE GO اپنے اپنے

---

[1] جیل کے ساتھی ظفر اللہ پوشنی

پارٹنر کو دبوچ لو اور ناچ شروع"۔ پوشنی نے فی الفور ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا "دبوچ لوں تمہاری سؤر کی سی گردن؟ پارٹنر کا بچہ...... فلاں کی اولاد" وغیرہ وغیرہ۔

اب پھر سے تجویز سُنی گئی ہے کہ مقدمے کا فیصلہ وکلا۔ کو دکھایا جائے میرے خیال میں اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن اگر منظور قادر کو اطلاع نہیں ملی ہے تو تبلادینا۔

یہ ہمارا یار چارلی[1] کہاں سے آنکلا۔ اُس کے ذکر سے دل بہت خوش ہوا۔ اُس کا تو نام سُنتے ہی ہنسی چھوٹنے لگتی ہے۔ اُس کی مُسکراتی ہوئی بتّیسی کے بغیر اُس کا چہرہ تصوّر ہی میں نہیں آتا۔ اس نے شادی کرلی ہے کہ نہیں؟ اگر کرلی ہے تو اُس سے کہنا کہ مجھے شدید اصرار ہے کہ اپنی بیوی کی تصویر ہمیں بھیجے۔ جس لڑکی نے اُسے اپنا میاں چُنا ہے اُسے ضرور وکٹوریہ کراس ملنا چاہیئے۔ تم نے پوچھا تھا کہ ایک نیا لباس خریدنے کے بعد تمہیں کچھ گناہ کا احساس کیوں ہوتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اُس کا فرائڈ کے نظریے سے کوئی تعلّق ہے۔ میری رائے میں یہ احساس اس وجہ سے ہوتا ہے کہ کہیں دیکھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم ایّامِ غم میں سوگ منانے کے بجائے خوشی منا رہے ہیں اور ہمیں بے حس یا سنگدل نہ تصوّر کریں۔ لیکن یوں سوچنا بالکل احمقانہ بات ہے اس لئے کہ غم اور تکلیف ہی کا زمانہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب خوش دلی اور بشاشت سب سے زیادہ درکار ہوتی ہے اور دل کی ڈھارس باندھنے کے لئے ظاہری شکل وصورت کے بناؤ سنگھار سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ جیل میں ہم جو فیشن پریڈ کرتے رہتے ہیں اس کا راز یہی ہے۔ جسمانی راحت کے علاوہ اس سے حوصلہ بھی بلند رہتا ہے۔ جہاں تک رائے عامہ کا تعلّق ہے شاید میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ روحانی آسائش کے لئے نہ صرف اسے بھی کبھی نظر انداز کر دینا چاہیئے بلکہ اس پر کھُلّم کھُلّا لعنت بھیجنی چاہیئے۔

---

[1] رمیش چندر عرف چارلی۔ لاہور میں تانگے والوں کے لیڈر اور اب ہندوستان کی ٹیلیویژن سروس میں ملازم۔

۲۴ مارچ ۱۹۵۳ء (۸۱)

یہ سوچنا بالکل بے وقوفی کی بات ہے کہ تم یہاں خالی ہاتھ آؤ گی۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اپنی رفاقت سے زیادہ بیش قیمت کوئی تحفہ تم ساتھ نہیں لاسکتیں۔

لیکن تم آؤ تو کچھ فرانسیسی کتابیں، دستِ صبا کے کچھ نسخے، فارسی لغت اور عروض کی کتابیں جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں (دستیاب ہوسکیں تو) ساتھ لے آنا۔ پنجابی کی ہیر جو میں نے لوٹا دی تھی وہ بھی واپس چاہیئے۔ باسویل کی لائف آف جانسن، ٹوین بی کی اسٹڈی آف ہسٹری اور شیکسپیر کا پینگوئن ایڈیشن بھی مجھے درکار ہے۔ ان میں سے اگر کوئی کتاب نہ لاسکو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ میرے پاس پڑھنے کو کافی کچھ موجود ہے اور فی الحال ان سے کام چلا سکتا ہوں۔

نقشِ فریادی کے مقدمے کے بارے میں تم اور تمہارے وکیل بہتر جانتے ہیں۔ ہر پابند قانون شہری کی طرح مجھے فطری طور سے ساری عدالتوں سے ہول آتا ہے اور ان ہی کی طرح یہ فطری خواہش رہتی ہے کہ جو قصہ عدالت سے باہر جتنی جلد نپٹ سکے اچھا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ رجحان کچھ احمقانہ ہے۔ بد دیانت لوگ اسی پر تکیہ کر کے جان بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تمہارے آنے پر یہاں موسم بہت اچھا نہیں ہوگا لیکن کچھ ایسا ناخوشگوار بھی نہیں۔ بہر صورت لوگوں کی زندگی ایسی ناخوشگوار ہوتی جارہی ہے کہ موسم سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ تم اور تم جیسے لاکھوں کے لئے روز مرّہ زندگی کی اس رسّی پر قدم جمائے رکھنا کتنا مشکل ہوگا جو دن بہ دن باریک اور زیادہ طویل ہوتی جارہی ہے۔ لیکن اپنا توازن قائم رکھنا تو اس لئے لازمی ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کبھی کسی دن اُس رسّی سے اُتر کر ہم بھی کسی سبزہ زار پر آرام کریں گے اور پھولوں کو کھلتے ہوئے اور بچوں کو گاتے ہوئے دیکھیں گے۔ محنت اور سختی اور دُکھ تو جب بھی ہوگا لیکن اس کے مقابل محبت اور زندگی کی آسودگی اور بار آوری بھی ہوگی۔

۳۰ مارچ ۱۹۵۳ء (۸۲)

کل بہت شاندار دن گزرا۔ پہلے ہمارے دو ساتھی صادق[1] اور ضیاء[2]۔ دوسرے گھر (وارڈ) میں منتقل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد سے ضیاء جو کہ ہماری کمپنی کے مزاحیہ اداکار ہیں اپنے وارڈ میں ایک پائیں باغ تیار کر رہے ہیں جس میں ہتھیلی کے سائز کی روشیں اور نسوانی انگلیوں کے سائز کی آب جوئیں ہیں۔ پرسوں رات ہمیں ایک بہت ہی پُر تکلف دعوت نامہ ملا جس پر بہت سے نقش و نگار کے علاوہ یہ تحریر تھی

"اے کلاس کی جانب سے بی کلاس والوں سے

درخواست

کی جاتی ہے کہ فلاں دن بمقام اے کلاس
برلبِ آبِ رواں ناشتہ تناول فرمانے کی
زحمت گوارا فرمائیں۔

نوٹ

ازراہِ مہربانی اپنا ناشتہ ساتھ لائیں "

چنانچہ کل صبح ہم باقاعدہ تیار ہو کر آبِ رواں پارٹی پر گئے۔ شالامار میں شاہ ایران کی پارٹی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ پلنگ اس طرح بچھائے گئے کہ صوفے نظر آئیں سایہ دار گوشوں میں آرام کرسیاں بچھائی گئیں۔ بام کے بالشت بھر درخت کے نیچے ریڈیو سیٹ چھپا کر رکھا گیا تھا۔ پانی کے واحد نل کے نیچے ایک مُنّا سا حوض بنایا گیا جہاں سے پانی ننھی ننھی نہروں آبشاروں اور فواروں کی صورت میں رواں تھا۔ ہم نے تمام دن کھلی فضا میں درختوں کے نیچے گزارا۔ برج کھیلتے رہے، گپ کرتے رہے، آسمان کو تکتے رہے جیل

---

[1] بریگیڈیئر صادق خاں [2] کرنل ضیاء الدین

کی دیواریں نظر سے دُور بہت دُور کہیں غائب ہو گئی تھیں۔

شام کو ہمارے وارڈ کی بجلی فیل ہو گئی۔ دیر کافی ہو چکی تھی اور جیل کے مستری رُخصت ہو چکے تھے۔ مجھے بجلی سے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔ اوّل اس وجہ سے کہ بجلی کے دو ایک حادثے نظر سے گزر چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بجلی کے مزدوروں کے لئے میں نے بہت سی ایسی درخواستیں لکھی ہیں جن میں دستانے اور دوسرا حفاظتی سامان مہیّا نہ کئے جانے کی وجہ سے مزدوروں کے مجروح اور ہلاک ہونے کی شکایتیں کی تھیں۔ اسی سبب سے جب کبھی یہاں مستری وغیرہ بجلی ٹھیک کرنے کے لئے آتے ہیں تو میں ہمیشہ دیکھ لیتا ہوں کہ اِن کے پاس یہ سامان ہے کہ نہیں۔ یہ لوگ عام طور سے دن میں آتے ہیں اور سیڑھیاں اور بہت سا الّم غلّم ساتھ لاتے ہیں۔ چُنانچہ جب کل شام بجلی فیل ہوئی تو ہم سمجھتے رہے کہ یہ لوگ اپنا ساز و سامان لے کے آئیں گے کیونکہ نقص بجلی کے کھمبے کے تاروں میں تھا۔ کافی انتظار کے بعد ایک مُنحنی سا شخص کاندھے پر ایک تھیلا اُٹھائے ہوئے نمودار ہوا۔ ہم نے کہا میاں کوئی سیڑھی ویڑھی لے کے آؤ نقص تو کھمبے کے تاروں میں ہے۔ مگر اُس شخص نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ پل بھر میں وہ کھمبے کی چوٹی پر بھی پہنچ گیا۔ ہم سب نے پریشان ہو کر آوازیں دینی شروع کر دیں کہ دیکھو احتیاط کرو بجلی کے تار ہیں، مین سوئچ بند کرواؤ، دستانے منگواؤ وغیرہ وغیرہ۔ وہ شخص کچھ منمنایا جس سے غالباً مُراد یہ تھی کہ آپ لوگ بکواس بند کریں۔ پل بھر میں یہ حضرت کھمبے سے اُتر چکے تھے اور بجلی جل چکی تھی۔ بالکل کسی سرکس کا کرتب معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے عوام میں کتنی صلاحیت ہے اور کتنا جوہر ہے جو کسی کام ہی میں نہیں آتا اور جو محض تلخی، افلاس اور بُھوک کی نذر ہو جاتا ہے۔

۲۱ اپریل ۱۹۵۳ء (۸۳)

گزشتہ دن خط و کتابت میں گڑ بڑ ہو گئی جس کا افسوس ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب تو موسم ہے۔ اس موسم میں اُس اسفل مخلوق پر رشک آتا ہے جو خراب موسموں میں لمبی

تان کر دُنیا ومافیہا سے غافل ہو جاتی ہے اور جب موسم بدلتا ہے تو پھر بیدار ہوتی ہے۔ افسوس کہ فطرت نے انسانوں کو یہ استعداد نہ دی کہ وہ بھی اسی طرح چند ماہ کے لئے کہیں زیر زمین بے سُدھ پڑے رہتے اور پھر تازہ دم ہو کر باہر نکل آتے۔ ویسے اس جگہ یوں بھی بہت سا وقت نیم مدہوشی ہی کے عالم میں گزرتا ہے اور سوچنے یا محسوس کرنے کی ذرا سی کوشش سے پسینہ آنے لگتا ہے۔ جیل خانے میں اس کیفیت کے لئے آدمی کچھ احسان مند محسوس کرتا ہے جب وقت زیادہ تیز رفتاری سے گزرتا ہے اور دردِ دل کا احساس نہیں رہتا۔

کل عید کا دن تھا۔ اس بار یہ دن بہت خاموشی اور تنہائی میں گزرا اس لئے کہ اسحاق[۱] کے بھائی کے علاوہ کسی کے عزیز واقارب ملاقات کو نہیں آئے تھے۔ صبح جب میں کپڑے بدل رہا تھا تو بہت سی پرانی یادیں اور بہت سے بھولے بسرے خیال اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور میں نے دیکھا کہ عید گاہ میں گھنے بیڑوں کے تلے میرے ابا[۲] خطبہ دے رہے ہیں (عید کی نماز سے پہلے ہمیشہ وہ خطبہ دیا کرتے تھے) اور میں نے دیکھا کہ اگلی صف میں میں اور طفیل مخمل کے کوٹ پہنے بیٹھے ہیں اور پھر نماز کے بعد ہماری فٹن عید گاہ سے چلی ہے۔ گھوڑوں کی گردن میں بندھی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ سائیس سڑک کی دونوں جانب پیسے پھینک رہا ہے اور شور مچاتے ہوئے بچے گھر تک ہماری گاڑی کے ساتھ دوڑے جا رہے ہیں۔ پھر وہ گھڑی یاد آئی کہ ہم زنان خانے کے صحن میں داخل ہوئے ہیں جو بہت سی عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ میری سگی بہنیں ہیں، ان کے بچے ہیں، خادمائیں ہیں، اپنے گاؤں کی غریب مہمان عورتیں ہیں۔

ہمارے ابا کے داخل ہوتے ہی یکایک صحن میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ باری باری سب ان کا ہاتھ چومتے ہیں۔ پھر ہماری دادی راستہ ٹٹولتی ہوئی اپنے کمرے میں

۱۔ جیل کے ساتھی سابق میجر محمد اسحاق جنہوں نے زنداں نامے کا دیباچہ بھی لکھا ہے۔

۲۔ فیض کے والد کا نام سلطان احمد خاں تھا

سے نکلتی ہیں اور ہمارے ابّا ماں کی دُعا کے لئے اپنا بارُعب سَر ان کے آگے جھکا دیتے ہیں اور وہ اُن کے سَر پر ہاتھ پھیرتی اور دُعائیں دیتی ہیں، پھر ابّا باہر مردانے میں چلے جاتے ہیں سکوت ٹوٹ جاتا ہے اور صحن میں سَب لوگ ہنسی مذاق اور شور و غُل سے آسمان سَر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ سَب محبّتیں، سارے غم، سَب خوشیاں یاد آئیں اور دِل نے چاہا کہ اِن سَب کو گلے لگا کر آہ وزاری کرے لیکن آہ وزاری شروع ہونے سے پہلے مَیں نے اِن سَب کو رُخصت کر دیا۔ دوپہر میں ایک ضیافت ہوئی اور ہم ہنسی مذاق اور گپ شپ کرتے رہے لیکن وقت مُشکل سے گزرا اور سورج غروب ہوا تو تسکین محسوس ہوئی۔

اِس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ میری خرابیٔ صحت کی وجہ سے ہم یہ جنگ ہار جائیں۔ اس بارے میں میرا ارادہ بالکل پُختہ ہے۔ اگر کوئی بات ہوتی تو مَیں ضرور تمہیں لکھ دیتا۔ صرف اتنا ہے کہ کان میں تکلیف کی وجہ سے مَیں نے کچھ دن کھیلوں میں حصّہ لینا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن یہ بہت دِن پہلے کی بات ہے اور اَب مَیں نے دوبارہ وَرزش شروع کر دی ہے۔ اَب کان میں درد تو نہیں ہے لیکن کچھ INFECTION ابھی باقی ہے اس لئے بہت سی بور دوائیں کھانی پڑتی ہیں۔ جب تک ہم کسی زیادہ مہذّب جگہ نہ جائیں میرے دانتوں کا تو کچھ ہو نہیں سکتا۔ کبھی نہ کبھی اُس کی نوبت بھی آ جائے گی۔ اگرچہ کہہ نہیں سکتے کہ کب۔

بچّوں کی تصویریں جو تم نے بھیجی ہیں بہت خوبصورت ہیں۔ آج میں نے بہت سے خوشگوار لمحے اس تصوّر میں گزارے کہ جب یہ بڑی ہوں گی تو کیسی نظر آئیں گی۔ آنے والے برسوں میں ان کی دُنیا کیسی ہوگی اور اس دُنیا میں ان کی کیسے بسر ہوگی۔ اُمید ہے کہ ان کی دُنیا اُس دُنیا سے بہتر اور کم درد انگیز ہوگی جس میں ہم رہتے ہیں۔ اُمید ہے کہ انہیں عید کارڈ پسند آیا ہوگا۔

۸۴

۲۶ اپریل ۱۹۵۳ء

مجھے خوشی ہے کہ اس بار دوستوں کی مہربانی سے تمہارا قیام زیادہ آرام دہ تھا۔ آخر کار بچوں نے کراچی کی سیر بھی کر لی۔ اُمید ہے کہ تم نے بھی یہی محسوس کیا ہوگا۔ میری صحت کے بارے میں کسی تشویش کی ضرورت نہیں اس لئے کسی قسم کے پریشان کن خیالات کو اپنی مسرت میں حائل ہونے نہ دو۔ میرا کارڈیوگرام لیا جا چکا ہے اور کل ایکس رے ہوگا۔ ایک دندان ساز قسم کے کوئی صاحب آئے تھے۔ بہت سی دوائیاں دے گئے ہیں۔ میں نے درخواست دی ہے کہ مجھے چند دنوں کے لئے کراچی بھیج دیا جائے تاکہ کوئی ماہر ڈاکٹر معائنہ کر سکے نہ جانے یہ درخواست منظور ہوگی کہ نہیں، لیکن تم خاطر جمع رکھو۔ ڈاکٹر سیلرز کی دوائیوں کی فہرست مجھے مل گئی ہے اور آج کل میں انہیں شروع کر دوں گا۔ کارڈیوگرام اور ایکس رے کے نتائج آئیں گے تو بھجوا دوں گا وہ انہیں دکھا دینا اور ان کی تشخیص اور مشورہ یہاں بھجوا دینا۔ تمہارے یہاں آنے سے پہلے حکومت کے اعلیٰ ایوانوں میں کچھ عجیب تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ عجب لطیفہ ہے کہ ہمارے ہاں اہم سیاسی واقعات غور و فکر کا سامان بہم پہنچانے کے بجائے صرف کامیڈی کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ اس سے خیال آیا کہ تم لوگوں نے اپنی اخبار نویسی کے بارے میں عجب وتیرہ اختیار کر رکھا ہے۔ امروز میں پانچ دن کے بعد اس واقعہ پر تبصرہ ہوتا ہے اور پاکستان ٹائمز میں تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ کیا وہاں کوئی صاحب الہام کے انتظار میں بیٹھے ہیں یا اداریہ نویسوں نے ہڑتال کر رکھی ہے۔ خیر مجھے اس سے کیا غرض۔ ہم تو اب صحافی نہیں رہے۔

حکیم[1] صاحب کو کہلوا دو کہ اسلامی تاریخ کے بارے میں ایک دو دن میں انھیں تفصیلی خط لکھوں گا۔

---

[1] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

۲۹ اپریل ۱۹۵۳ء (۸۵)

اس جگہ گرمیوں کا یہ تیسرا موسم جارہا ہے اور یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ ہم ہمیشہ سے یہیں کے باسی ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ یہ تین موسم تیس برس کے برابر ہیں اور اُن دنوں کے بعد جب ہم نے آخری بار اپنے چہرے پر برسات کی بوندوں کا لمس اور اپنی آنکھوں میں سبزہ و مرغزار کی ٹھنڈک محسوس کی تھی۔ اَب تک آدھی عمر بسر ہو چکی ہے لیکن ان دنوں کی یاد اتنی دُھندلی ہو گئی ہے کہ اس سے دل زیادہ نہیں دُکھتا اور اب امید نے نت نئے سراب دکھا کر دل کو ستانا چھوڑ دیا ہے اس لئے اب ہم راضی بہ رضا ہیں، اور انتظار اور آرزو سے اپنا دل نہیں جلاتے (یعنی ایک حد تک)۔

میری صحت کے بارے میں تشویش نہ کرو۔ میں اچھی طرح اپنا خیال رکھتا ہوں۔ کارڈیوگرام اور ایکس رے دونوں ٹھیک ہیں صرف کان میں ابھی تک تکلیف ہے جس کا علاج ہو رہا ہے۔ بڑے صاحبوں سے زیادہ درخواستیں کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا لیکن اپنے دوستوں سے مشورہ کر لو۔ اگر وہ سمجھیں کہ اس میں کوئی فائدہ ہے تو درخواست بھجوا دو۔

جہاں تک گورنر جنرل کو اپیل بھیجنے کا سوال ہے میں صرف چند الفاظ لکھنا چاہتا ہوں اور قانونی دلائل میں نہیں جانا چاہتا جن سے ویسے بھی مجھے کچھ واقفیت نہیں۔ قانونی کارروائی کے بارے میں حکام کچھ فیصلہ کر نہیں پاتے اور ہمیں کچھ علم نہیں کہ ہمارے وکلاء کیا کر رہے ہیں اس لئے اگر اس بارے میں چند دنوں تک کوئی اطلاع نہیں آئی تو جو بھی سمجھ میں آئے گا ہم خود لکھ کر بھیج دیں گے۔

جیسے تم نے کہا ہے اس بات سے بہت ڈھارس ہوتی ہے کہ نیکی اور دوستی کا وجود فنا نہیں ہوا اور دُنیا سب ظلم و ستم کے باوجود دراصل مشفق اور مہربان ہے کیونکہ اُس کی اکثریت ہمارے تمہارے جیسے حقیر غم زدہ لوگوں پر مشتمل ہے جو بدی سے نفرت کرتے ہیں اور جو تھوڑا بہت ان کے پاس ہو اُسے اپنے سے زیادہ کم نصیبوں کو راحت پہنچانے کیلئے

قربان کر دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ مثلاً اگلے ہی دن کوئی بچی بہت بڑھیا مٹھائیوں کا ایک بڑا سا بکس میرے لئے چھوڑ گئی۔ دریافت کرنے پر صرف اتنا معلوم ہوا کہ کوئی مس صاحبہ چھوڑ گئی ہیں اس لئے میں یہ بھی نہیں جانتا کہ کس کا شکریہ ادا کروں۔ شاید تمہاری نئی سہیلیوں میں سے کوئی ہو۔ بہر حال یہ خیال جسے بھی آیا شیرینی سے زیادہ شیریں تھا۔

میں نے حال ہی میں ابسن کے ڈرامے اور اوکیسی کا ڈرامہ THE STAR TURNS RED پڑھا اور بہت لطف اندوز ہوا۔ اس سے احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں تھیٹر کا نہ ہونا کیسی بڑی محرومی ہے۔ شاعری کی واپسی کا کوئی پتہ نہیں چلتا اس لئے بہت جی چاہ رہا ہے کہ کوئی ڈرامہ لکھ ڈالوں۔ اگر جیسے میں چاہتا ہوں ویسا لکھا گیا تو رفیع پیر کے اپنے الفاظ میں "ضرور کرسی سے اچھل پڑیں گے"۔ افسوس ہے کہ ہم یوم اقبال کا پروگرام سن نہ سکے، لیکن ہمارا ریڈیو ایسا دردِ سر ہے کہ ہم خبروں کے سوا اور کچھ سنتے ہی نہیں۔

۸۶

۱۲ مئی ۱۹۵۳ء

گزشتہ تین دن میں حسب الحکم اپنی اپیل تیار کرتا رہا۔ یہ ٹائپ ہو رہی ہے اور آج بھجوا دی جائے گی۔ ذہن سے یہ بوجھ اُترا ہے تو شاید اب لکھنا دوبارہ شروع کر سکوں گا۔ اس وقت ذہن بالکل خالی خالی سا محسوس ہوتا ہے لیکن کام شروع ہوگا تو معمول پر آجائے گا۔ آجکل میں ہیولاک ایلیس کے مقالات پڑھ رہا ہوں۔ بہت تاسف ہے کہ یہ بیس سال پہلے کیوں نہیں پڑھے۔ عجیب بات ہے کہ گورکی اور رومیں رولاں کے علاوہ اپنے ہم عصر لکھنے والوں میں سے جن کا میں نے مطالعہ کیا ہے بہت کم ایسے ہوں گے جنہیں پڑھ کر ایسی گہری دانائی اور پاک باطنی کا احساس ہو۔ ہیولاک ایلیس کا بنیادی موضوع ظاہر ہے کہ جنسیات ہے لیکن وہ اس موضوع پر اس تحریم اور حسنِ نظر سے بحث کرتا ہے کہ اس بارے میں اپنے احمقانہ اور جاہلانہ خیالات پر ندامت ہونے لگتی ہے۔ لیکن ان خیالات کی صرف یہی خوبی نہیں ہے۔ بنیادی خوبی یہ ہے کہ ہیولاک ایلیس کو اس موضوع پر جو بصیرت حاصل ہے اُسی کی

روشنی میں اس نے زندگی کے دیگر معاملات کا محاکمہ کیا ہے اور اس سے جو نظریۂ حیات مرتّب ہوتا ہے وہ بہت پاکیزہ بھی ہے اور دلکش بھی۔ فرائڈ کے بالکل برعکس جس نے اسی صورت اپنے جنسی نظریات کو عالمگیر حقائق کے رنگ میں پیش کیا لیکن نتیجے میں ہر شے تاریک اور گناہ آلود نظر آنے لگی۔

اخباری زبان میں اب یہاں سے مزید صحت نامے جاری نہیں کئے جائیں گے اس لئے کہ کوئی نئی خبر قابلِ تحریر نہیں ہے۔ صرف اِتنا ہے کہ مقامی ڈاکٹروں نے دانتوں اور دوسرے امراض کے ماہرین کی خدمات کے لئے کراچی لکھا ہے اور اس سفارش کے جواب کا انتظار ہے۔ ویسے میں صحت مند اور خوش و خرّم ہوں اور اب بائیں کان سے سُنائی دینے لگا ہے۔

کتاب کے مقدمے کی کوئی مزید اطلاع نہیں آئی۔ اس کا گزشتہ مہینے فیصلہ ہونا تھا اب کیا صورت ہے؟

لاہور میں گرمی اور گھٹن سے جو کیفیت ہوگی اس کا میں تصوّر کر سکتا ہوں اور اس وجہ سے تمہارے اور بچوں کے دِن کیسی سختی میں گزر رہے ہوں گے۔ تمہیں سہارا دینے کے لئے میں تو صرف یاد اور محبت ہی کی پیش کش کر سکتا ہوں جو ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے۔ ہم موسم کے بارے میں اب تک خوش قسمت ہیں۔ صبح و شام بہت تیز اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہے، جب یہ ہوا ہمارے گنے چُنے پیڑوں اور بیل بوٹوں میں سے سنسناتی ہوئی گزرتی ہے تو سب پودے اُس کی لے پر رقص کرنے لگتے ہیں اور اس رنگ و آہنگ سے نظر کو عجیب عجیب دھوکے ہوتے ہیں۔ کبھی بچپن کی یادیں بسے ہوئے کسی پنجابی گاؤں کا دھوکہ ہوتا ہے، جہاں دُور کہیں گائیں بھینسیں ڈکر رہی ہیں اور کسی آنکھ سے اوجھل رہٹ کا پانی جلترنگ بجا رہا ہے اور بڑے بوڑھے گاؤں کے سایہ دار دائرے[1] میں حُقّے گڑگڑا رہے ہیں۔ کبھی شملے اور کشمیر

---

[1] پنجاب کے گاؤں میں چوپال کو دائرہ کہتے ہیں۔

کے دامن کو مہسار کا دھوکا ہوتا ہے۔ چیڑ کے پتّوں پر ہلکی ہلکی پھوار گر رہی ہے اور دُور بہتی ہوئی ندیوں کے نغمات کے لئے بادام اور بید مجنوں کے پیڑ گوش بر آواز ہیں۔ کبھی یہ کسی سمندر کا وسیع اور سرسبز ساحل نظر آتا ہے جہاں تیز ہوائیں چلتی ہیں اور دیو ہیکل موجوں کی چنگھاڑ سُنائی دیتی ہے۔ جیل کے گوشے میں بیٹھے ہوئے نظر کے سامنے یہ منظر اُبھرتے ہیں۔ ہوائیں لہراتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں اور اُن لمبے وقفوں میں نہ جیل خانہ باقی رہتا ہے نہ جیل کی دیواروں کا وجود۔

۱۹ مئی ۱۹۵۳ء (۸۷)

تمہارے خط سے بہت سی دلچسپ خبریں معلوم ہوئیں۔ پھر آمنہ آئیں اور ہم نے اتوار کا تمام دن ساتھ گزارا اور دُنیا بھر کی باتیں کیں اور بیگم امین الدّین کا بہت مشفقانہ خط لائی تھیں جسے پڑھ کر ہم کچھ ہکّا بکّا سے رہ گئے۔ اَب مجھے اس بات پر کچھ کچھ افسوس ہونے لگا ہے کہ میں نے کچھ مردم بیزار زندگی گزاری ہے اور اُن لوگوں میں جن سے ہم نے میل جول بڑھانے کی کوشش نہیں کی بہت سے ایسے ہوں گے جو آشنائی کے قابل تھے۔ اس میں کچھ ہماری کاہلی کا دخل ہے اور کچھ ہمارے نک چڑھے پن کو۔ یعنی ناک اتنی اونچی رکھ کر چلنا کہ نیچے کی مخلوق نظر ہی نہ آئے۔ خیر اُمید ہے کہ رفتہ رفتہ ہم زیادہ معقول اِنسان بن جائیں گے۔ پہلے طبّی رپورٹ سُن لو۔

کان ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا اور علاج ہو رہا ہے۔ خُون کے دباؤ کی کمی اور اینیمیا کی معمولی سی شکایت ہے۔ یہاں کی تجویز کردہ دَواؤں کے علاوہ ڈاکٹر سیلزر کا نسخہ بھی استعمال کر رہا ہوں۔ وٹامن سی، بی، کیلشیم وغیرہ وغیرہ۔ کراچی میں کسی ماہر سے معائنے کی درخواست ابھی تک سُرخ فیتے میں اُلجھی ہُوئی ہے۔ کبھی نہ کبھی کچھ ہو جائے گا۔ اس دوران میں یہاں باقاعدہ علاج ہو رہا ہے۔ پُرسش احوال کے لئے حمید نظامی کا شکریہ ادا کر دینا۔ اگرچہ مجھے یہ توقع نہیں کہ بندوں سے جو یہ دُنیاوی خداوند وعدے کرتے ہیں وہ انہیں

یاد رہیں یا پورے ہوں۔ لیکن اس سے ایسا کچھ فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ ابھی تک ہیش اپنی اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے قابل ہوں اور تشویش کی کوئی وجہ نہیں۔

یہ سن کر کہ اپنی دونوں بچیاں گورنمنٹ کالج کے ڈرامے میں پارٹ کر رہی ہیں، عجیب کیفیت ہوئی۔ ذہنی یا روحانی طور پر ہم بھی کہیں داد دینے کو موجود ہوں گے۔ تم نے یہ نہیں لکھا کہ کھیل کب ہوگا۔ اگر ہو نہیں چکا تو کچھ تصویریں اُتروا کے بھیجو تاکہ ہم دیکھ سکیں اور لوگ بھی دیکھنا چاہیں گے۔

تم نے کہا ہے کہ ہم قید کے باقی ایّام کا اندازہ کر کے رہائی کی کوئی تاریخ متعین کریں۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ بالکل غلط پالیسی ہے۔ سفر کی منزل کا کبھی نہیں سوچنا چاہیے اسلئے کہ وہ ہمیشہ دور نظر آئے گی۔ صرف اگلے دن اور اگلے قدم کا سوچنا چاہیے اور اس کے بعد جو کچھ ہے اُسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ بہرحال اگر تمہیں اصرار ہے تو حساب لگا سکتے ہیں۔ پانچ جنوری سے میعاد شروع کر کے معمول کے مطابق ایک تہائی مدت منہا کر دیں تو بقیہ میعاد دو سال آٹھ ماہ بنتی ہے۔ اگر اس میں سے ایک مہینہ سلطانی معافی کا اور جو چار ماہ اب تک گزر چکے ہیں اس طرح پانچ ماہ اور کم کر دو تو دو سال اور تین ماہ بنتے ہیں۔ اس طرح ۵ راگست ۱۹۵۵ء کی تاریخ متعیّن کر سکتے ہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ میعاد ہے اس لیے کہ وزرا اور دوسرے اعلیٰ افسروں کے آنے پر جو معافی ملتی ہے وہ میں نے شامل نہیں کی ہے اور میں نے یہ بھی فرض کر لیا ہے کہ اوپر والے حکمِ عقوبت کی پوری تکمیل چاہیں گے۔ اگرچہ مجھے امید ہے کہ شاید وہ ایسا نہ کریں۔

تم نے بلند کرداری اور کم ظرفی کا ذکر کیا ہے۔ بلند کرداری یا انسانی عظمت کا منبع کوئی کوشش یا جدوجہد نہیں ہوتی بلکہ وہ افراد ہوتے ہیں جو اس میں حصّہ لیتے ہیں۔ جس طور سے وہ اس کا سامنا کرتے ہیں، اور جو نیکی اور ایمان وہ اپنے اعمال میں برتتے ہیں۔ درد یا مصیبت یا جدوجہد یا کشاکش میں بجائے خود کوئی عظمت یا نجابت نہیں ہے۔ اس میں عظمت اور

بلندی کا عنصر اُس ہمّت، یقین، نیکی اور انسان دوستی سے پیدا ہوتا ہے جس کا جدوجہد میں مظاہرہ کیا جائے اور اگر تلخی یا خود غرضی یا کم ظرفی یا ڈر اور خوف کی وجہ سے جدوجہد کرنے والے یہ عنصر میسّر نہ کر سکیں تو دردِ کربہہ چیز ہے اور جدوجہد محض تذلیل ہے۔ لازمی بات صرف یہ ہے کہ اپنی ہمّت، محبّت اور نیکی میں فرق نہ آنے پائے اور انسان تلخی، کمینگی اور کم حوصلگی کا شکار نہ ہو جائے۔ باقی سب غیر اہم ہیں۔

یہاں کی خبریں صرف یہ ہیں کہ ایک بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کا اہتمام ہو رہا ہے۔ ہماری بلّی کا خاندان اب تیسری پُشت تک پہنچ چکا ہے اور ایک بلّی کی بچّی نے بچّے دیئے ہیں اور ہم نے بوگن ول کی دو بیلیں لگائی ہیں جن کے پھول اتنے نازک ہیں کہ مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔

۱۹ مئی ۱۹۵۳ء (۸۸)

یہ صرف کاروباری رقعہ ہے۔ میرے گزشتہ خط کے بعد نسیم نے لکھا ہے کہ منظور قادر ہماری اپیلیں تیار کر رہے ہیں اور انہیں جلد مکمّل کر لیں گے۔ اُن کا مشورہ ہے کہ ہم جب تک اور انتظار کر لیں اس لئے میں نے سوچا تھا اپنی اپیل کراچی بھیجنے کے بجائے تمہیں بھیجدوں تاکہ منظور قادر سے مشورے کے بعد تم کہو تو اُسے بھیجدیں کہو تو روک لیں لیکن جیل کے حکّام نے پیغام بھیجا ہے کہ کسی نامعلوم وجہ سے (اگرچہ اس کا مقدمے کی کارروائی یا کسی اور خفیہ بات سے کوئی تعلق نہیں ہے) یہ تمہیں نہیں بھیجی جا سکتی۔ میں نے وجہ دریافت کی جس کا ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا جو ظاہر ہے کہ سرکاری کارگزاری بلکہ عدم کارگزاری کا معمول ہے۔ بہرصورت اب میں نے اسے روک لیا ہے اور یہ اطلاع اس لئے بھیج رہا ہوں کہ میرے گزشتہ خط کی وجہ سے کوئی مغالطہ پیدا نہ ہو۔ میں نے اپیل میں جو کچھ لکھا تھا وہ ذاتی نوعیت کا تھا اور قانون یا مقدمے سے متعلّق نہیں تھا۔ اب اسے ارسال کرنے کے بجائے میں نے اپنے پاس محفوظ کر لیا ہے شاید کسی کام آئے۔

۲۲ مئی ۱۹۵۳ء (۸۹)

پہلے وکیل اور اپیل کی باتیں کریں۔ میں یہ سب کچھ لاہور میں تم لوگوں کے مشترکہ فیصلے پر چھوڑتا ہوں اس لیے کہ جو کچھ لکھا جائے گا سب کے لیے مشترک ہوگا۔ اگر محمود علی قصوری وغیرہ کو فیصلہ دیکھنے کی اجازت مل جائے تو اچھا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا کیونکہ ان اپیلوں کا فیصلہ قانونی بُنیاد پر نہیں ہوگا۔ بہر صورت اگر یہ لوگ یہاں آجائیں تو اچھا ہے۔ دوستوں کے چہرے دیکھنے کو ملیں گے اور یہی کیا کم ہے۔

تم نے جس زور شور سے اپنے ڈانٹ ڈپٹ والے فلسفے کی حمایت کی ہے اُس سے بہت لُطف آیا۔ میں جانتا ہوں کہ دُنیا کا کاروبار اِسی فلسفے کی بُنیاد پر چلتا ہے اسلئے اس کی تحقیر کیسے کر سکتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنی طرف سے پہلا پتھر نہ پھینک مارنے کا میرا جو فلسفہ ہے وہ تمہارے فلسفے کے مُقابلے میں نسبتاً غیر اہم ہے اور اس فلسفے سے صرف شاعری پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ بڑھیا شاعری ہو۔ لیکن ڈانٹ ڈپٹ کے فلسفے کی پیروی میں بعض اوقات پیچیدہ مسائل کو سادہ بنا کر یک طرفہ فیصلے کئے جاتے ہیں جس سے مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ بعینہ جیسے میرے فلسفے کی پیروی میں سادہ مسائل کو زیادہ پیچیدہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اُس سے بھی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اختلاف کے باوجود تمہارے فلسفے کا احترام کرتا ہوں لیکن تم میرے فلسفے پر کام کرنے کو قطعی تیار نہیں ہو۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیے ورنہ تمہارے فلسفے کی نفی ہو جائے گی۔ لیکن ہم دونوں مجبور ہیں۔ میں گُم کردہ راہوں، بدا عمالوں اور نکمّوں کی امداد کرنے پر ویسے ہی مجبور ہوں جیسے تم انہیں ناپسند کرنے پر مجبور ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ ان دونوں کے فلسفوں کے امتزاج سے کوئی جارحانہ انسان دوستی کا نظریہ تشکیل دیا جائے لیکن یہ تو ہمارے آنے کے بعد ہی ہوگا۔ جب تک ہم دونوں اپنی اپنی پسند اور ناپسندیہ قائم رہیں۔ میں نے ابھی فارسٹر کا ناول HOWARD'S END ختم کیا ہے جس میں دو

خاندانوں کا بیان ہے جو اسی تضاد کے شکار ہیں۔ ایک طرف جذباتی نہیں ہیں اور دوسری جانب دُنیادار WILCOXES ـــ نہ جانے تم نے یہ کتاب پڑھی ہے کہ نہیں۔ اب میں اہرینبرگ کا ناول STORM پڑھ رہا ہوں جو بہت مُفید ثابت ہو رہا ہے۔

سیف الدّین سیفؔ کا دیباچہ ملفوف ہے۔ تاخیر کے لئے معذرت کر دینا۔ دیر اس لئے ہوئی کہ میں کچھ بہتر لکھنا چاہتا تھا لیکن دماغ حاضر نہیں ہے۔

ایک مہینہ اور ختم ہو گیا اور منزل آہستہ آہستہ قریب آ رہی ہے۔

(۹۰) ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء

تمہارے بھیجے ہوئے خوبصورت تحفے اور اُس سے زیادہ خوبصورت تصویروں کا شکریہ۔ میں تصور میں یہ کھیل دیکھنے اور اس میں تمہاری بچیوں کی اداکاری کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کرتا رہا۔ ان کے لیے یہ بہت دلچسپ رہا ہوگا۔ اسٹیج پر لوگوں کے سامنے آنے سے بچّوں کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ البتہ ایک خطرہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ زیادہ داد و تحسین سے کسی کو بگاڑ نہ دیں۔ لیکن ان کی اس عمر میں تو ایسا کوئی خطرہ نہیں۔

اب یہاں واقعی گرمی ہے۔ اگرچہ راتیں اب بھی ٹھنڈی ہیں۔ اگلے چند ہفتے شاید ہم کچھ زیادہ نہ لکھ سکیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جی چاہتا ہے کہ آدمی کچھوے کی طرح اپنے سارے ذہنی اعضا اندر کو سمیٹ کر صرف ایک بے حس خول کو گرد و گرما کا سامنے کرنے کے لیے چھوڑ دے۔ اس میں پوری کامیابی تو نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ پچھلے ہفتے میں نے کچھ شعر بھی لکھے ہیں۔ لیکن ان دنوں زندگی کی عام روش یہی ہے۔ جیسے شاید پہلے بھی لکھا تھا۔ اس موسم کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ دن کا بیشتر حصّہ ایک طرح کی بے ہوشی کے عالم میں بسر ہوتا ہے اور وقت کے گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلتا اسی لیے تاریخوں، مہینوں اور دنوں کا حساب سب گڈمڈ ہو جاتا ہے۔

تصویروں اور سگریٹ نوشی کا سامان جو تم نے بھیجا تھا اس کے علاوہ پچھلے

ہفتے مجھے ایک عمدہ تحفہ ملا۔ آمنہ نے ہندوستانی مصوری پر تین بہت لاجواب کتابیں بھیجی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ انہوں نے خرید کر نہ بھیجی ہوں کیونکہ یہ بہت قیمتی کتابیں ہیں۔

میں نے فرانسیسی نصاب ختم کر لیا ہے اور اب ہسپانوی زبان سے دست و گریباں ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔

۸ جون ۱۹۵۳ء (۹۱)

خط لکھنے کے مقررہ دن صبح ہیں اپنے سیماب صفت میاں افتخار الدین اور امتیاز ایک ساتھ آگئے۔ اس کے بعد ایک اور بہت اچھے ملاقاتی آگئے یہ مقامی یونیورسٹی میں پروفیسر[۱] ہیں۔ ایک بہت مطلوبہ کتاب بھی میرے لیے ساتھ لائے یعنی سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے تراجم اور بہت سے مشفقانہ اور دلنواز الفاظ بھی۔ شاعری پر باتیں ہوئیں۔ تعلیمی مسائل کا تذکرہ ہوا اور بہت اچھا وقت گزرا۔ اس سے ایک دن پہلے تمہاری نوعمر سہیلی[۲] نے کچھ پھول بھجوائے تھے۔ بہت جی چاہا کہ اُسے دیکھ سکیں۔ غالباً آج کل لاہور میں ہوں گی۔ میرا بہت سا پیار بھجوا دینا۔ نیک بندوں کا شمار اتنا بڑھ چلا ہے کہ سب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے غالباً کئی برس درکار ہوں گے۔ نیک بندوں کا ذکر آیا تو مہربانی سے مجھے قدسیہ[۳] کا پتہ بھجوا دو۔ ان کی جملہ مہربانیوں کے لیے شکریے کا خط لکھنا چاہتا ہوں۔ خاص طور سے اس لیے کہ ہم قریب قریب نا آشنا ہیں۔ ویسے اس زمانے میں زیادہ کرم فرمائی انجان لوگوں ہی نے کی ہے۔

حکیم صاحب[۴] نے کتاب کا ارادہ ترک کر دیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ آج کل اِکا دکا شعر کے علاوہ میں کچھ نہیں لکھ رہا ہوں۔ فی الحال زیادہ وزنی کام کی سکت نہیں۔ منظور

۱۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ۲۔ نام یاد نہیں ۳۔ بیگم قدسیہ زیدی۔ اب انتقال ہو چکا ہے۔ علی گڑھ کے کرنل زیدی کی بیگم۔ ۴۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔

سے اپیل کی نقل وصول ہوگئی۔ چونکہ یہ سب کی جانب سے مشترکہ ہے اور گورنر جنرل کو بھجوائی جا چکی ہے اس لیے مجھے اس بارے میں کچھ کرنا نہ تھا۔ میں نے اپنا مسودہ بھی بھجوا دیا ہے اس لیے کہ مضمون واحد تھا۔ میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ صرف دانتوں کا علاج باقی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ خون کے دباؤ وغیرہ کا بھی دوبارہ معائنہ ہو جائے۔

پانچ مہینے گزر چکے۔ منزل اب بھی دور ہے لیکن جلد نظر آنے لگے گی۔ تو درد اور محرومی کے باقی دن بھی کسی صورت گزار لیں۔ ان سے پرے بہت سی مسرت انتظار میں ہے بہت سا ہنسنا، بہت سا پیار اور زندگی بہت سے اضافے کیساتھ وہ سب کچھ لوٹا دے گی جو اس نے ہم سے چھینا ہے

۱۹ جون ۱۹۵۳ء (۹۲)

تمہارا خط ملا۔ میرا بھی اب تک پہنچ چکا ہوگا۔ میں کراچی کے لیے سامان باندھ رہا ہوں اس لیے اگلا خط سپرنٹنڈنٹ ڈسٹرکٹ جیل کراچی کی معرفت لکھنا۔ ابھی یہ علم نہیں کہ ہم ہسپتال میں رہیں گے یا جیل میں۔ یہ جگہ اب بالکل اپنا گھر معلوم ہونے لگی ہے۔ اس لیے سفر اور رختِ سفر باندھنا بُرا لگ رہا ہے۔ لیکن اب کچھ تبدیلیٔ آب و ہوا کو بھی جی چاہتا ہے، دانتوں کا علاج بھی ضروری ہے۔ کچھ اور دوستوں کی صورت بھی نظر آئے گی اس لیے دل میں کچھ ہلچل سی ہے۔

ڈاکٹر بلوچ کی صحت یابی کا سُن کر خوشی ہوئی۔ ہم قریب قریب ان کے اُستاد ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اس لیے کہ میں نے "THE CIRRHOSIS OF THE LIVER" پر اُن کے مقالے کی تصحیح کی تھی۔ جانتی ہو یہ کیا بلا ہے؟ ہم کو سب معلوم ہے۔

تم راحت اور خوشی کے بارے میں اپنے فلسفے پر نظرِ ثانی کر رہی ہو؟ یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔ ہر دوسرے معاملے کی طرح راحت و مسرت کا بنیادی اصول تو یہی ہے کہ ہاتھ میں آیا ہوا ایک پرندہ جھاڑی میں چھپے ہوئے دو پرندوں سے بہتر ہے (اگرچہ یہ بھی اُمید رکھنی چاہیے کہ شاید جھاڑی والے دو پرندے بھی ہاتھ آجائیں)، لیکن دنیا کی بہت

سی آبادی نے اس خوف وتشویش کی وجہ سے اس فلسفے پر عمل کرنا ترک کر دیا جو ہمارے موجودہ معاشی اور معاشرتی نظام کی پیداوار ہیں۔ اس نظام میں مستقبل کے بارے میں اتنا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ آدمی پوری بے فکری اور کشادِ خاطر سے حال کا لطف لے ہی نہیں سکتا۔ ہمارے آباؤ اجداد کو جو اپنے اپنے رئیسانہ خلوت کدے میں مگن رہتے تھے ایسا کوئی خوف وخدشہ درپیش نہ تھا شاید ہمارے بچوں کو بھی نہیں ہوگا۔ جب ہماری دنیا کے درد و عذاب کے بجائے کوئی خوش تر نظام وجود میں آچکا ہوگا۔ صرف ہماری نسل وہ "ابنِ آدم" ہے جس کے مقدر میں لکھا گیا ہے کہ مصلوب ہو کر اپنے لہو سے دنیا کے درد و معصیت کا کفارہ ادا کرے۔ اپنی جان کے لیے۔ اس سے زیادہ گراں قدر خوں بہا کوئی کیا مانگ سکتا ہے اور اس سے زیادہ پر افتخار کونسا کام ہوگا جو وہ اپنے ذمے لے سکتا ہے۔

یہ سُن کر افسوس ہوا کہ تمہیں زیادہ ذہنی رفاقت میسّر نہیں۔ لاہور میں ذوق و دانش کا ایسا قحط تو نہیں تھا لیکن غالباً آج کل لوگ محض زندہ رہنے کی مشقت میں اتنے جُتے ہوئے ہیں کہ ذہنی کاوش اور سماجی راہ و رسم پر توجہ نہیں دیتے اور پھر شاید میرا خاموش سایہ بھی لوگوں کے سر پر منڈلاتا رہتا ہے اور انہیں زیادہ میل ملاپ سے ٹوکتا ہے۔

کراچی جیل اور جناح ہسپتال کراچی

۸ خطوط

۱۹۵۳

خط	تاریخ
۹۳	۲۵ جون
۹۴	۳۰ جون
۹۵	۷ جولائی
۹۶	۱۴ جولائی
۹۷	۲۳ جولائی
۹۸	۲۷ جولائی
۹۹	۱۲ اگست
۱۰۰	۲۳ اگست

۲۵ جون ۱۹۵۳ء (۹۳)

تو آخر ہم یہاں پہنچ ہی گئے اور اس وقت خاصا لطف آرہا ہے۔ ایک جیل سے دوسرے جیل میں جائیں تو کافی دیر تک جیل خانے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی نئے اور اجنبی ملک میں نکل آئے ہیں، فی الحال میں بھی یوں ہی محسوس کر رہا ہوں۔ میری رہائش گاہ کچھ جاذب نظر جگہ ہے۔ چھوٹی سی کُٹیا جس پر کھپریل کی سُرخ چھت ہے۔ پشت پر نازک نازک پتّوں والے پیڑ ہیں اور سامنے کے جنگلے پر ایک بہت پھیلی ہوئی بیل اپنے سُرخ اور نارنجی پھولوں کی بہار دکھا رہی ہے۔ جب چاند نکلتا ہے تو میرا صحن عشّاق کی سیر گاہ معلوم ہوتا ہے۔ کُٹیا اور اُس میں جھلملاتا ہوا پیٹرومیکس لیمپ، پس منظر میں ایک سفید اور سبز دھبا سا جو میرا غسل خانہ ہے اور سامنے کا جنگلہ اور اس کے پھول یہ سب چیزیں جیل کی دیوار پھاند کر کسی اور دنیا میں تحلیل ہو جاتی ہیں، اور یوں لگتا ہے کہ ہم جیل میں نہیں ہیں کہیں دیہات کی کھلی فضا میں پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ چند ہی دنوں میں یہ تاثر زائل ہو جائے گا اور جیل پھر لوٹ آئے گا۔

یہاں جس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ حیدر آباد کے دوستوں کی صحبت ہے۔ اگرچہ یہاں بھی سہ پہر میں اپنے ہمسایوں سے مل سکتا ہوں لیکن یہ مجمع کچھ عجیب سا ہے البتہ ایک خاصا بھلا سا انگریز قیدی بھی ہے (لندن کا رہنے والا ہے اور اس کا گھر پینڈلسٹن روڈ سے کچھ زیادہ دور نہیں جہاں تمہارے والدین کی قیام گاہ ہے۔ جرم خیانت) اور مولانا عبدالحامد بدایونی سے بھی کچھ اُنس ہو گیا ہے (وہ ختم نبوت کی تحریک کے سلسلے میں یہاں ہیں) اس لیے میرا خیال ہے کہ وقت کٹ جائے گا۔

دراصل مجھے تو اس تنہائی میں کچھ لطف بھی آرہا ہے اور حیدر آباد کی گہما گہمی کے بعد اس خلوت میں آرام اور سکون محسوس ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس وقت تک زیادہ

سکون تو نہیں مل سکا۔ نووارد ہونے کے سبب لوگوں کو ہمارے بارے میں تجسس بھی ہے اور شوقِ ملاقات بھی۔

باہر سے کچھ ملاقاتی بھی آچکے ہیں۔ پہلے جیل خانوں کے انسپکٹر جنرل آئے یعنی ضمیر ہاشمی صاحب۔ پھر سول سرجن کرنل شاہ۔ ان کے ساتھ چیف کمشنر کے ہاں کے ایک افسر بھی تھے۔ میجر رشید۔ کل آمنہ آئی تھیں اور شیشے کا ایک گلدان چھوڑ گئی ہیں جو اتنا خوبصورت ہے کہ ہر وقت اس کے ٹوٹنے کا ڈر لگا رہتا ہے۔

میرا علاج ابھی شروع نہیں ہوا لیکن غالباً ایک آدھ دن میں شروع ہو جائیگا جب تک میں اسی ہسپانوی کہاوت کے مطابق سستا رہا ہوں۔

(۹۴)

۳۰ جون ۱۹۵۳ء

تمہارے دو خط ملے۔ ایک حیدر آباد سے لوٹایا گیا ہے اور دوسرا اخبار کے تراشے کے ساتھ یہاں کے پتے پر ملا۔ شاید یہاں سے میرا پہلا خط کچھ زیادہ ہی شاعرانہ تھا۔ لیکن دو سال کے بعد یہ نقلِ مکان کافی دل خوش کن ہے۔ اگرچہ دل خوش کرنے کا اور کوئی سامان موجود نہیں۔ اب یہ تبدیلی کا احساس بھی گھٹتا جا رہا ہے۔ لیکن نئے منظر میں دلچسپی اب تک باقی ہے اس لیے ابھی اکتا جانے کی نوبت نہیں آئی اگرچہ یہاں اپنے ہم جنس برائے نام ہیں۔ دن میں کچھ وقت کے لیے کچھ ملنے والے آجاتے ہیں لیکن ایک آدھ کے علاوہ یہ دوسری قسم کے لوگ ہیں اور سُنی اَن سُنی کر دینے کا جو ملکہ مجھے حاصل ہے اس سے اکثر کام لینا پڑتا ہے۔ خیر فی الحال مجھے اس سے کوئی الجھن نہیں ہوتی بعد میں شاید ایسا ہو اور تمہارا خیال بالکل غلط ہے کہ یہاں ملاقاتیوں کا تانتا لگا ہوا ہوگا۔ ابھی تک آمنہ کے سوا کوئی بھی نہیں آیا اور میرا خیال ہے کہ کوئی آئے گا بھی نہیں۔ مجھے اس کی ایسی پروا بھی نہیں ہے جیسے جانسن نے کہا تھا۔ ساری دنیا پر تین حرف بجز چند نیک بندوں کے جن کی نیکی باقی مخلوق میں اس جنس کی کمی کی تلافی کر دیتی ہے۔

جیل میں مقامی ڈاکٹر میرا معائنہ کر چکے ہیں۔ مزید معائنہ ایک آدھ دن کے بعد ہسپتال میں ہو گا۔ اچھا ہوا کہ ہم یہاں آ گئے کہ دانتوں کے جن ڈاکٹر نے معائنہ کیا تھا وہ کہہ رہے تھے اگر مزید تاخیر ہوتی تو علاج بیکار تھا لیکن ابھی تک کچھ زیادہ نہیں بگڑا ہے کافی ہوشیار معالج معلوم ہوتے ہیں۔ سرکاری کارروائی ختم ہونے کے بعد علاج شروع کریں گے (یہ اس لیے کہ مجھے ان کے کلینک میں جانا ہو گا۔ جس کے لیے محافظ، سواری اور دوسری بہت سی خرافات کا اہتمام ضروری ہے) بہر صورت جو کچھ کیا جا رہا ہے میں اُس سے مطمئن ہوں۔

لکھنے کے جو خاکے ہم اپنے ذہن میں بناتے رہتے ہیں ان میں آج کل ایک یہ بھی ہے کہ اُردو میں جمالیات پر ایک کتاب لکھیں اس لیے کہ ایسی کوئی کتاب بازار میں نہیں ہے۔ بہت زمانہ ہوا جب ہاشمی[1] صاحب نے اس کی فرمائش کی تھی۔ حمید[2] (مکتبہ کاروان والے) سے پوچھو کہ انہیں یہ خیال پسند ہے کہ نہیں اور اگر ہے تو وہ ضروری کتابیں ہم پہنچا سکیں گے یا نہیں؟

(۹۵)

۷ جولائی ۱۹۵۳ء

مجھے یہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے اور اس دوران میں بقول بخاری[3] صاحب CAESARIAN آپریشن کے سوا باقی سب کچھ جھیل چکے ہیں۔ خون کا دباؤ اب معمول پر ہے اور کان اور دانتوں کے سوا اور کوئی شکایت نہیں لیکن خدا گواہ کہ آدمی کی خانہ ویرانی کو یہی کیا کم ہیں۔ مرض تو خیر اپنی جگہ ہے۔ میں علاج کی بات کر رہا ہوں جو مرض سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔ نازیوں نے ایذا رسانی اور عذاب دینے کے جو طریقے اختیار کئے تھے ان کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے لیکن ان میں "عذابِ گوش" کا کہیں ذکر نہیں جس سے

---

[1] بشیر احمد ہاشمی [2] چودھری عبدالحمید [3] پطرس بخاری

ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب مشغلے میں پوری طرح ماہر نہیں تھے ورنہ عذاب وایذا کی جو صورت یہ عضو بہم پہنچاتا ہے بالکل لاثانی ہے۔ "عذابِ دنداں" تو خیر مسلمہ اور جانی پہچانی چیز ہے لیکن اس کے مقابلے میں ہیچ۔ جیسے تم جانتی ہو اُف کیے بغیر درد برداشت کرنے میں ہم کسی سادھو سنت سے پیچھے نہیں لیکن اب کے میں نے بھی محسوس کیا کہ صبح کان پر کوئی مشقِ ناز کرے اور سہ پہر کو دانتوں پر — تو یہ کچھ زیادتی ہی ہے۔ خوش قسمتی سے اس عذاب کی زیادہ تکلیف دہ منزل گزر چکی ہے اور غالباً دو تین دن میں یہ قصہ تمام ہو جائے گا۔ جیل خانے سے چھٹی پا کر کچھ ایسا ولولہ تو دل میں پیدا نہیں ہوا جس کی توقع تھی لیکن پھر بھی جب کمرے سے باہر سبزے پر بچے کھیلتے نظر آتے ہیں اور اُن کی ہنسی سنائی دیتی ہے اور آس پاس برآمدوں اور دریچوں میں ایسے چہرے نظر آتے ہیں جن پر اسیری کی خستگی اور کجلاہٹ تحریر نہیں تو دل خوش ہوتا ہے۔

تو تم سارتر کا مطالعہ کر رہی ہو؟ ایک خط میں تو اس موضوع پر بحث بہت طویل ہو جائے گی (اور میں اس بارے میں زیادہ جانتا بھی نہیں) لیکن یہاں میرے پاس ایک کتاب ہے اس میں اس کی کافی وضاحت سے تشریح کی گئی ہے۔ تمہیں دے سکتا ہوں۔ یہاں آؤ تو ساتھ لے جانا ورنہ ڈاک سے بھجوا دوں گا۔ ابھی ابھی گزشتہ اتوار کے میگزین سیکشن (پاکستان ٹائمز) میں تمہاری کہانی پڑھی۔ کہانی بہت موثر تھی۔ لیکن میرے خیال میں دوکاندار کو ننھے بچے کی ماں کے مرجانے کا نہیں بتانا چاہیے تھا۔ اس سے انجام کے بارے میں وہم اور تذبذب ختم ہو جاتا ہے اور انجام یا کلائمیکس کمزور ہو جاتا ہے۔ اگر وضاحت سے بتانے کے بجائے دوکاندار کو مبہم سا اشارہ کر دیا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اس طرح بچے کی گھر کو واپسی زیادہ رقت انگیز معلوم ہوتی۔

۱۴ جولائی ۱۹۵۳ء (۹۶)

اخبارات میں منٹگمری کا ذکر میں نے بھی دیکھا ہے۔ یہ جگہ تمہارے ہاں سے کچھ ایسی دور نہیں اور اسی فاصلے پر کسی اور جگہ سے خاص بڑی بھی نہیں۔ درون خانہ ایک جیل دوسرے جیل سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔

پنجاب آنے کے بعد ملاقات کے انتظامات کے بارے میں تردد نہ کرو۔ یہ مسئلہ آسانی سے طے ہو جائیگا۔ میرے کان اور دانتوں کا علاج قریب قریب مکمل ہو چکا ہے اور اب بہت افاقہ ہے۔ دانتوں کے ڈاکٹر کا کلینک وسط شہر میں ہے اس لیے اتنے زمانے کے بعد گلیاں اور بازار ٹریفک اور بھیڑ بھاڑ دیکھتے ہیں تو کچھ عجیب سا بھی لگتا ہے اور کچھ نہیں بھی لگتا۔ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ دو سال تک یہ سب چیزیں نظر سے اوجھل تھیں۔ یہ لگتا ہے کہ ابھی کل ہم ان ہی کے درمیان تھے اور بیچ کے تاریک زمانے کا سایہ کہیں نظر نہیں آتا۔ شاید جس دن ہم جیل سے نکلیں گے جب بھی یہی ہوگا۔ شاید جب بھی یہی محسوس ہوگا کہ ہم ایک آدھ دن کے لیے غیر حاضر ہو گئے تھے اور عمرِ رائیگاں کا رنج و ملال ذہن سے یکسر محو ہو جائے گا۔ نہ جانے یہ اچھی بات ہے یا بُری بات ہے۔ اس طرح زندگی کچھ ہموار اور آسان گزار تو ہو جاتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ متوقع کیف و ولولہ بھی مفقود ہو جاتا ہے۔

شفیع[1] کا لندن والا حصہ کافی دلربا تھا۔ کچھ مفتخر بھی محسوس کیا کچھ ندامت بھی ہوئی اور پھر جی چاہا کہ کچھ زیادہ استعداد اور قابلیت ہمارے حصے میں آئی ہوتی تاکہ ہم بھی کچھ کر پاتے اور اتنے بہت سے لوگوں کی محبت اور احسانات کے مستحق ٹھہرتے۔

---

[1] "م۔ ش"

۲۳جولائی ۱۹۵۳ء (۹۷)

اس ہفتے کافی گہما گہمی رہی۔ اوّل تو ہر دوسرے دن دانتوں کے علاج کے لیے شہر کی سیر ہوتی رہی اور پھر بہت سے لوگ ملنے کو آئے۔ آمنہ اور ثمّو[1] کئی بار آئیں۔ افتی دو بار آئے اور سب سے دل پسند بات یہ کہ رشیدہ[2] کی بہن جو یہاں مقیم ہیں تشریف لائیں اور کافی دیر ٹھہریں۔ اپنی توقع سے بھی زیادہ اچھی ہیں۔ شاید اکتوبر میں تم سے ملیں گی۔ پھر قدسیہ کا ایک بہت عمدہ خط آیا اور بہت سے آشنا نا آشنا لوگوں کی جانب سے دوستی کے سلام و پیام پہنچے۔ یہ تکلف و کرم ایسا عالمگیر معلوم ہوتا ہے کہ ہم بالکل غرقاب ہو چلے ہیں۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یا تو ہم اچھے آدمی ہیں یا بدھو ہیں۔ ان سب باتوں پر خوشگوار موسم کا بھی اضافہ کر لو۔ بادل آتے ہیں لیکن بارش ہے نہ کیچڑ۔ ٹھنڈک ہے لیکن جھکڑ یا آندھی کا نام نہیں۔ درجۂ حرارت بدلتا رہتا ہے لیکن اعتدال سے۔ ہمارے صحن میں گھاس کا ایک چھوٹا سا قطعہ ہے اور شام کو ننھی سا چاند نکلتا ہے۔ صرف ایک خرابی یہ ہے کہ پڑھنا لکھنا بند ہے اس لیے کہ آج کل ہم استراحت کر رہے ہیں۔ آج کل صرف حافظ اور ڈاکٹر جانسن کو اپنے ہاں باریابی حاصل ہے۔ اس سے زیادہ میں انہیں کیا داد دے سکتا ہوں۔

اور ہاں لوگوں کے بارے میں کچھ زیادہ فصیح اسمائے صفت کا استعمال تم اگر کم کر دو تو اچھا ہے۔ ان سے خفگی اور برہمی سمجھ میں تو آتی ہے لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

۲۷جولائی ۱۹۵۳ (۹۸)

ہسپتال سے جتنے خط لکھے ہیں کسی کی رسید نہیں آئی (یہ چوتھا ہے) نہ جانے تمہیں پہنچ رہے ہیں کہ نہیں، بہر حال میں حسبِ معمول لکھتا رہوں گا۔ تمہارا آخری خط جس پر ۱۷ تاریخ

---

[1] شاہین ملک، اب شاہین سعید حسن

[2] بیگم خورشید مرزا

درج تھی ۲۴ تاریخ کو ملا تھا، لفافے پر لکھا تھا ضروری، میں سمجھا اس میں واقعی اہم بات درج ہو گی اس لیے گھبراہٹ میں بہت جلدی سے کھول کر پڑھا، لیکن اس میں ایک فرسودہ سوال کے سوا کوئی بھی ضروری یا اہم بات نظر نہیں آئی اور وہ سوال یہ ہے کہ ہم نے ایامِ ماضی میں اپنی عفت ٹھیک طرح بچا کر رکھی تھی کہ نہیں، لاحول ولا قوۃ، یہ کیا مسخرہ پن ہے، مجھے اس سوال سے شاید برہم ہونا چاہیے تھا یا پریشان ہونا چاہیے تھا لیکن مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ خیر اس بارے میں اب سوال کا جواب سُنو۔

سوال، کیا فلاں بنتِ فلاں تمہاری محبوبہ تھیں؟

جواب۔ نہیں۔

سوال، تو پھر مری اور کراچی میں کیا ہوا تھا؟

جواب، کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی تھی، کم از کم کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جسے ہمارے دوست قابلِ ذکر سمجھیں۔

سوال، تو پھر آخر کیا قصہ ہوا تھا؟

جواب، اوّل تو سوال مبہم ہے دوم جواب تفصیل چاہتا ہے اور اگرچہ مجھے اس کی چنداں پروا نہیں لیکن ایک نیم پبلک دستاویز میں خالص ذاتی معاملات کا بیان مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

سوال، تو تمہیں اقرار ہے کہ یہ کوئی ذاتی معاملہ تھا جسے تم پبلک میں ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔

جواب، مجھے بالکل اقرار نہیں ہے۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ ذاتی معاملات پر کھلے بازار بحث کرنا مناسب نہیں۔

سوال، تو تم مانتے ہو کہ اس معاملے کا کوئی نامناسب پہلو بھی تھا دوسرے الفاظ میں کوئی ایسا قابل اعتراض پہلو جو پبلک کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔

جواب، دیکھئے اب یہ کج بحثی ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ اوّل تو یہ کوئی قابلِ ذکر

قصہ ہی نہیں اور دردم اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر مجھے ندامت ہو۔

خیر مذاق ایک طرف، اگر سنجیدگی سے بات کریں تو تم یہ موضوع جاری رکھو، کوئی چھوٹا موٹا اسکینڈل نہ صرف زندگی میں چاشنی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے بلکہ دل بہلانے کے لیے موضوعِ گفتگو بھی مہیا کرتا ہے بشرطیکہ اس میں کوئی بدمزگی کا مضمون نہ ہو۔ اس کے علاوہ ایسی باتوں پر زیادہ توجہ دینا بے کار ہے، کم از کم میں تو نہیں دیتا۔

میرے کان کا ابھی تک علاج جاری ہے اور غالباً ابھی کچھ دن یہاں اور رکنا پڑے گا، سب لوگ بہت مہربانی سے پیش آ رہے ہیں، اگلے دن آفتاب کی بہن (ڈاکٹر آفتاب احمد ملٹری اکاونٹس سروس میں ہیں) سے مختصر سی ملاقات ہوئی تھی، ان سے پتہ چلا کہ تم غالباً مری جا رہی ہو، لیکن افتی نے بتایا تھا کہ تمہارے یورپ جانے کا امکان ہے، مجھے علم نہیں کہ کون سی بات پوری ہو سکے گی لیکن کچھ بھی ہو تم کچھ دن چھٹی ضرور کر لو۔ جیسا میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں ہمارے حالات میں یہ عیاشی نہیں، بلکہ اشد ضرورت ہے، میری فکر نہیں کرو، یہاں سے پنجاب جانے کے بعد اگر ملاقات میں چند دن کی تاخیر بھی ہو گئی تو مضائقہ نہیں، ویسے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تم بھی چھٹی کرو اس لیے کہ آج کل ہم بھی چھٹی پر ہیں اور پڑھنا لکھنا سب بند ہے۔

(۹۹)

۱۲ اگست ۱۹۵۳ء

اب کے تم نے سب اداس باتیں لکھیں اور یہ سُن کر افسوس ہوا کہ تمہاری صحت اچھی نہیں رہی۔ ہماری یہاں اتنی اچھی طرح دیکھ بھال ہو رہی ہے کہ اپنے بارے میں بالکل بے فکر ہو گیا ہوں۔ نہ جانے تمہیں آمنہ نے کس بات پر اتنا ڈرا دیا۔ کان کا زخم اب بالکل مندمل ہو چکا ہے اور رخصت سے پہلے صرف چند دن کے لیے ڈاکٹر نے زیر ملاحظہ رکھ لیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے آپریشن کی تجویز ضرور ہوئی تھی لیکن افاقہ ہو جانے پر اور مزید صلاح مشورے کے بعد یہ تجویز ترک کر دی گئی اور آپریشن ضروری نہیں سمجھا گیا۔ میں نے اس بارے میں لکھا اس لیے نہیں کہ تمہیں مزید

بیکار تشویش ہوگی اور پھر کچھ قطعی فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ جہاں تک غذا اور خوراک کا تعلق ہے وہ میں نے عمداً کم کر رکھی ہے۔ وزن دوبارہ بڑھنے لگا تھا اور میں گھٹانا چاہتا تھا۔ تو دیکھو یہ نہیں کہ میں کچھ چھپا رہا تھا بلکہ پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

اگر مجھے علم ہوتا کہ مجھے ہسپتال میں اتنے دن رہنا ہے تو ضرور تمہیں بلا بھیجتا لیکن یہاں کے قیام کی میعاد شروع سے غیر متعین تھی اور سرکاری فیصلوں کا پتہ چلانا ممکن نہ تھا اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ سفر پر بیکار پیسے ضائع کرو۔

انتظارِ ملاقات ناقابلِ بیان ہے لیکن اس بات سے ڈر لگ رہا ہے کہ تم بیمار اور کمزور نہ نظر آؤ۔ آجکل تو ہمارے لیے تم ہی مرکزِ کائنات ہو اس لیے تمہارا بال بیکا نہ ہونا چاہیے۔ میں تو بہت سخت جان ہوں اور مجھے کوئی زیادہ آزار نہیں پہنچ سکتا۔

اور کیا تمہیں احساس ہے کہ ۵ اگست کی تاریخ گزر چکی ہے جس کے معنی ہیں کہ اب برسوں کا نہیں صرف مہینوں کا حساب کرنا ہے اور کچھ دنوں میں ہفتوں کا حساب باقی رہ جائے گا۔ تمہاری تکالیف کے خیال کے علاوہ اپنا جی ہلکا اور مطمئن ہے۔ وقت توقع سے زیادہ تیزی سے گزر رہا ہے اور دل میں صبحِ فردا کی آوازِ پا سنائی دیتی ہے۔ تھوڑا سا انتظار اور کرلیں اور خوش مزاجی سے صبحِ فردا کی راہ دیکھتے رہیں۔

(۱۰۰)

۲۳ اگست ۱۹۵۲ء

ہمارا آخری طبی معائنہ اور ملاحظہ ہو چکا ہے (سب کچھ ٹھیک ہے) اور میں بستر بوریا باندھے بیٹھا ہوں، لیکن ابھی تک روانگی کے بارے میں کچھ طے نہیں ہوا ہے۔ غالباً کل تک انتظار کرنا پڑیگا۔ امید ہے کہ اس ہفتے کے آخر تک اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گا اس لیے انتظار کے دن کم باقی ہیں۔ اب میں یہاں سے جلد لوٹنا چاہتا ہوں اس لیے کہ تم بہت افسردہ معلوم ہوتی ہو ملیں گے تو ہم تمہیں خوش کردیں گے اس لیے جی مضبوط رکھو اور کسی بات کو بددلی کا سبب نہ بننے دو۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔

جیسے ایمان اور خوش مزاجی کے سہارے اپنے وقت پر سب کچھ گزر جاتا ہے۔ ایک تہائی سفر تو کٹ ہی چکا ہے اور ہم گیت گاتے رہیں تو باقی دو تہائی بھی جلد کٹ جائے گا

آج کل چاند نکلتا ہے، گداز اور بادلوں سے اداس اداس اور راتیں ایسی حسین ہیں جیسے کوئی درد۔ جب شام ڈھلتی ہے تو میں اپنے عقبی دروازے کے باہر جا بیٹھتا ہوں یا جا کھڑا ہوتا ہوں۔ سامنے ہسپتال کا سبزہ زار ہے اور پرے سڑک کا کچھ حصہ نظر آتا ہے جو ڈرگ روڈ کو جاتی ہے۔ مہاجروں کی جھگیوں کا ایک جُھنڈ ہے اور ایک نارنجی رنگ کے ٹیلے پر میرے سامنے ایک چھوٹا سا مینار ہے جو غالباً پانی یا گیس کی ٹنکی ہے جس کے دندانے دار پہلو میں ایک برہنہ بلب جلتا رہتا ہے۔ اس سے ذرا اونچائی پر ایک اور تیز روشنی ایک تناور درخت کے سبز سینے کو منور کرتی ہے اور اس سے آگے کے موڑ پر ایک اور روشنی سے سڑک پر نور کا ایک تالاب سا نظر آتا ہے جس میں کبھی کبھار کسی دوڑتی ہوئی کار اور کبھی کسی سست رو رہگیر کی جھلک لمحہ بھر کے لیے اُبھرتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ سر پر بادل پیچ و خم کھاتے رہتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہر حرکت کے ساتھ رات کا موڈ بدل جاتا ہے۔ رات کا چہرہ کبھی روشن مسکراہٹ سے کِھل اُٹھتا ہے اور کبھی ابدی افسردگی سے دھندلا جاتا ہے اور میں یہ نظارہ کرتا رہتا ہوں۔ کبھی رات کی معیت میں کبھی اکیلے رات سے الگ۔ اور اس میں بہت تسکین ہے اور بہت درد ہے اور دل دونوں کے لیے احسان مند محسوس کرتا ہے۔ درد کے لیے بھی۔ تسکین کے لیے بھی۔ اس لیے کہ دونوں گواہی دیتے ہیں کہ حالات کے موذی روگ کے باوجود دل زندگی سے بہرہ ور ہے اور اس روگ کے باوجود زندگی خوب اور صحت مند ہے۔

منٹگمری (ساہیوال) جیل

۳۵ خطوط

سال اور تاریخ	خط کا نمبر
۱۹۵۳	
اکتوبر	۱۰۱
۱۹۵۴	
جنوری	۱۰۲
فروری	۱۰۳، ۱۰۴
مارچ	۱۰۵
مئی	۱۰۶، ۱۰۷
جون	۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱
جولائی	۱۱۲، ۱۱۳
اگست	۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶
ستمبر	۱۱۷، ۱۱۸
اکتوبر	۱۱۹، ۱۲۰
نومبر	۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴
دسمبر	۱۲۵، ۱۲۶
۱۹۵۵	
جنوری	۱۲۷، ۱۲۸،
فروری	۱۲۹
مارچ	۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳،
اپریل	۱۳۴، ۱۳۵،

(۱۰۱)

۱۲ اکتوبر ۱۹۵۴ء

تمہیں خط لکھنے بیٹھا تھا کہ وہ خط جو میں نے چھمی کو لکھا تھا لوٹ کر یہاں آگیا معلوم ہوتا ہے مجھے بھیجے جانے والے لفافے میں چھمی کا خط رکھ دیا گیا۔ تو پھر تمہارے گھر میں ایک ہنگامہ ہی ہوا ہوگا۔ میں اس سے بہت خوش ہوں۔ مطلب یہ کہ خاندان میں ہم ہی اکیلے غائب دماغ نہیں ہیں۔

شاید تمہارا کہنا ٹھیک ہے کہ ہم اتنے زیادہ خط وصول کرتے ہیں اور اتنے کم بھیجتے ہیں جو منصفانہ بات نہیں ہے۔ لیکن قیدی کی کچھ مراعات بھی تو ہوتی ہیں ورنہ جیل خانے سے فائدہ کیا ہے۔

یہ سُن کر اطمینان ہوا کہ گزشتہ طوفان سے کسی کو گزند نہیں پہنچا۔ مجھے بہت تشویش تھی اور اچھا ہوا کہ تم نے اتنی جلد خیریت کی اطلاع بھیج دی جس سے تسلّی ہو گئی۔ جیل خانے میں اپنے عزیزوں کے بارے میں تشویش عجب طرح اعصاب پر سوار رہتی ہے اس لیے کہ اپنے بارے میں کوئی فکر ہوتی ہی نہیں۔ اگر گرمی بڑھ جائے یا جاڑوں میں شدت ہو یا پانی زیادہ برسے یا آندھی تیز چلے تو طرح طرح کے وسوسے دل کو پریشان کرنے لگتے ہیں اس لیے کہ ہم کسی کے لیے کچھ کر نہیں سکتے۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ بارش کے بارے میں ہماری قصیدہ خوانی قطعی نامعقول ہے اور جب میں نے گزشتہ بارش کی تباہ کاریوں کا سُنا تو بہت رنج ہوا یہاں تو یہ طوفان کچھ ایسا ناگوار نہ تھا (یعنی جیل خانے کے اندر) لیکن میں تصور کر سکتا ہوں کہ باہر کافی مصیبت رہی ہوگی۔

ہمارے بارے میں تمہارے مضمون لکھنے کا یہ کیا قصہ ہے۔ ہمیں تو اس خیال سے ڈر لگ رہا ہے۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے خادم کی نظر میں ہیرو نہیں ہوتا لیکن اپنی بیوی کی نظر میں لاحول ولاقوۃ۔ ان لوگوں نے تمہارے بجائے کسی دوست سے فرمائش کیوں نہیں۔ لیکن شاید میرا کوئی ایسا دوست ہے ہی نہیں جو میرے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم کوئی SLOPPY چیز نہیں لکھو گی۔

آج کل ہم بالکل قلاش ہیں اس لیے یہ خط ملے تو کچھ پیسے بھجوا دو اور آتی دفعہ کوئی سو روپے لیتی آؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ سال کے خاتمے تک کے لیے پیسے میرے پاس ہوں۔ ماہ بماہ کا حساب ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ مہینہ ختم ہونے کو آتا ہے تو الجھن ہونے لگتی ہے۔

صوفی[۱] یا مسعود[۲] سے نکلسن کی تاریخ ادبیاتِ عرب کچھ عرصے کے لیے ہمیں عاریتاً دلوا دو۔

(۱۰۲) ۱۶ جنوری ۱۹۵۴

اس ہفتے نہ تمہارا خط آیا۔ نہ ملاقات[۳] آئی۔ یوں لگا کہ کھانے کے بعد سگریٹ نہیں ملا۔ اس جگہ کی بے رونق یکسانیت میں کبھی اس طرح کی محرومی بھی اچھی لگتی ہے۔ اس لیے کہ کچھ بدلتا تو ہے۔ اس کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے دماغ کی سوئی پھر چلنے لگتی ہے اور دل آرزو سے بیدار ہو جاتا ہے۔

جیل خانے میں ذہنی کیفیات کے جو مختلف دور گزرتے ہیں ان کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں ان میں سب سے زیادہ ضدی کیفیت وہ ہے جسے طبی زبان میں PRISON COMA کہنا چاہیے۔ ایک طرح کی خمار آلود نیم بیداری۔ جب ہر چیز کہیں دور چلی جاتی ہے، اور سب کچھ غیر اہم اور بے وقعت نظر آتا ہے، جب کوئی درد باقی رہتا ہے اور نہ کوئی راحت اور عرش بریں بے آباد معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیفیت بھی گزر جاتی ہے جیسے اور سب کچھ گزر جاتا ہے۔ لیکن جب تک طاری رہتی ہے یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہو گی اور آدمی کسی ایسے کیڑے کی طرح بن جاتا ہے جو زیر زمین بے سُدھ پڑا ہو۔

چنانچہ تمہارے جانے کے بعد خیر و خبر سے محرومی اور یہاں کی بے رونقی کو پریشان

۱۔ صوفی تبسم ۲۔ ہادی کمیٹی والے

۳۔ "ملاقات آنا" جیل کی خاص اصطلاح ہے

کر رہی ہے اور اب تو یوں ہے کہ جب آنکھ کھلتی ہے تو اس کا درد نبض کی طرح پھڑکنے لگتا ہے۔ اس بار ہماری میزی کی وجہ سے بھی جلد کچھ سُننے کو جی چاہتا تھا۔ گذشتہ ملاقات میں وہ اتنی بے چین اور بے آرام تھی کہ میں گفتگو میں کچھ توجہ نہ دے سکا اور شاید تمہیں کچھ اداس رخصت کیا۔ اتنی چھوٹی عمر میں ان بے چارے بچوں کے لیے اس طرح کا دکھ درد بہت ظلم ہے جب ان کے ننھے دل یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ انہیں کیا دکھ ہے اور کیوں ہے۔ جنگ کے بارے میں جس کتاب[1] کا میں نے ذکر کیا تھا اس میں پانچ برس کے ایک بچے کی بہت دل ہلا دینے والی کہانی ہے جو اپنی تین برس کی بہن کو اٹھائے ہوئے نازیوں کے خوف سے تاریکی میں بھاگا جا رہا ہے۔ بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہے اور اپنی بہن کا بوجھ اُٹھا نہیں سکتا، مٹھائی لانے کے بہانے سے اسے نیچے اُتار دیتا ہے "اور میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا اور روتا رہا اور سوچتا رہا جسے میں اندھیرے میں اکیلا چھوڑ آیا تھا اور میں روتا رہا روتا رہا اور کوئی میری مدد کو نہیں آیا"۔ لیکن یہ خط تو بالکل رونا دھونا ہوتا جا رہا ہے۔ جو بالکل فضول بات ہے اس لیے کہ ساری تھکن کے باوجود وقت گزر رہا ہے اور سائے چھٹتے جا رہے ہیں، جیسا کہ جولیٹ[2] کہتی ہے "ہمارے آنے والے وقت میں یہ ہمارے سارے غم کتنی شیریں گفتگو کا سامان مہیا کریں گے"۔

یہاں ہواؤں میں ابھی سے بہار کی تاثیر بیدار ہو چلی ہے اور کل شام اس موسم میں پہلی بار میں نے کمرے سے باہر رات ڈھلتی ہوئی دیکھی۔ ہواؤں کوئی تیزی نہیں تھی اور چاند مدھم اور مہربان نظر آتا تھا۔ میں بہت دیر تک صحن میں گھومتا رہا۔ نیم تاریکی میں ہماری سرسوں کی باڑھ کا چمکدار سونا روپہلی نظر آ رہا تھا اور پچھواڑے میں سرنگوں درخت دست بہ دعا معلوم

---

[1] ایلیا اہرن برگ کی تصنیف STORM

[2] شیکسپیئر کے ڈرامے رومیو اینڈ جولیٹ کی ہیروئن جولیٹ

ہوتے تھے، املی کے کوتاہ قد پیڑوں میں ایک ننھا پرندہ چہچہا رہا تھا اور زندگی کا ذائقہ یکایک شیریں اور لطف انگیز تھا۔ پھر کل شام کراچی سے بہت سے باتصویر رسالوں کا ایک بنڈل آگیا۔ اس سے بھی بشاشت ہوئی۔ اگرچہ یہ نہیں معلوم کہ یہ کس مہربان نے بھیجا ہے اور کس کا شکریہ واجب ہے۔

۲۱ فروری ۱۹۵۴ء (۱۰۳)

معلوم ہوتا ہے یہ مہینہ بہت جلد گزر گیا۔ شاید موسم کی وجہ سے یا تمہارے آنے کی وجہ سے یا کتابوں کی وجہ سے میں نے ساری کتابیں کھول کر نہیں دیکھی ہیں تاکہ لطف باقی رہے۔ ٹرز کی ہسٹری آف کورٹ شپ پہلے شروع کی ہے، یہ چٹخارے کی چیز ہے کہ اسے آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہوں تاکہ جلد ختم نہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ میں نے فلسفے کا مطالعہ بھی شروع کر دیا ہے اور اگر ذہن مصفا اور تیار ہو تو فلسفہ بھی ایسی ہی مزے کی چیز ہے۔ لیکن جیل میں دماغ زیادہ دیر تک حاضر نہیں رہتا۔ لاہور کے بجلی گھر کی طرح روشنی کبھی جلتی ہے کبھی گل ہو جاتی ہے لیکن جب تک جلتی ہے زندگی یکایک پرلطف معلوم ہوتی ہے۔

موسم وقت سے پہلے گرم ہو چلا ہے اور دھوپ میں بیٹھا نہیں جاتا لیکن اب سائے میں بیٹھ کر یا بستر پر لیٹ کر پڑھ سکتے ہیں جو اچھا لگتا ہے۔ پھر بہت سے پھول بھی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پھول انسانوں کا بدل تو نہیں لیکن پھر بھی حسین چیز ہیں جو کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔ البتہ ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب آدمی ان سے بھی بیزار ہونے لگتا ہے جیسے ہر بے مقصد حسن سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے (شاعر کیٹس[1] کچھ ہی کہے) حسن سے صحیح راحت جبھی بہم پہنچتی ہے جب وہ خلاق ہو یعنی جب وہ اپنے وجود سے دیکھنے والے کے جذبے یا خیال یا عمل میں مزید حسن

---

[1] کیٹس کا مشہور مصرعہ ہے "حقیقت حسن ہے اور حسن حقیقت"

کا اضافہ کرے۔ ایک یونانی گلدان[1] جو کسی نظم کا موضوع پیدا نہ کرے اپنے حسن کے باوجود محض ایک ٹھیکرا ہے مٹی کا۔ خیر یہ اتنی سیدھی بات تو نہیں ہے جیسے میں کہہ رہا ہوں لیکن بنیادی طور سے ایسا ہی ہے۔

۲۸ فروری ۱۹۵۴ء (۱۰۴)

کل رات سے مسلسل پانی برس رہا ہے۔ تمام وقت تو خیر نہیں لیکن قریب قریب تمام وقت، یہی وہ موسم ہے جس کے گن شاعر لوگ گاتے ہیں (یعنی ہمارے شاعر، تمہارے شاعر نہیں) اور اسکول کے بچے جس کی راہ دیکھتے ہیں تاکہ چھٹی کا مطالبہ کر سکیں۔ کل جب مینہ بند تھا لیکن بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی تو دہلی بہت یاد آئی۔ وہاں ایسے دن میں حکومت کا جنگی کاروبار قریب قریب برہم ہو جاتا تھا اس لیے کہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل[2] موٹر میں بیٹھ کر دفتر سے کھسک لیتے اور چند کلیدی افسروں کو ان کے دفتر سے اغوا کر کے نہ جانے کس جنگل بیابان میں گھمانے لے جاتے اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ میرے افسر اعلیٰ[3] کرنل ڈاڑھی نے اپنی ڈاڑھی نوچ لی اس لیے کہ کوئی بہت ہی فوری اور اہم مسئلہ پیش آگیا اور ان کے سب سے قابلِ اعتماد اسٹاف افسر کا دور دور پتہ نہ تھا۔ یہ سب کچھ اب کتنا دور لگتا ہے۔ جیسے یہ کسی اور دنیا اور کسی اور زندگی کی بات ہو۔ تم نے اپنے گھر کا ذکر کیا تو اس دور دراز زمانے کے بعد کی سب اچھی باتیں یاد آئیں۔ گرم جوشی قہقہے اور وہ نیکی اور تقدس جو ہر دوستی اور محبت کا جزو ہے۔ یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ اب یہ جمگھٹ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا ہے جیسے دہلی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی ہے۔ لیکن صرف دوستی کے جمگھٹ بدلتے ہیں دوستی اور پیار کا وجود ویسے

---

[1] کیٹس کی شہرۂ آفاق نظم ODE TO A GRECIAN URN یونانی گلدان پر ہے۔ [2] پطرس بخاری مرحوم [3] فوجی محکمۂ تعلقاتِ عامہ کے انگریز سربراہ COL. BEARD

ہی قائم رہتا ہے اور کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کسی اور صورت میں پلٹ آتا ہے۔
اگر تمہیں میرے آنے سے پہلے گھر چھوڑنا پڑا تو مجھے بہت کوفت ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک بار اپنے ہی گھر لوٹ کر آؤں خواہ ایک ہی دن کے بعد یہ گھر چھوڑنا پڑے جسے بھی یہ گھر درکار ہے اُسے ایسی بھی کیا جلدی ہوگی کہ چند ماہ بھی انتظار نہ کر سکے۔

۳۰ مارچ ۱۹۵۴ء (۱۰۵)

تو ایک طرح سے ہم دوبارہ گھر لوٹ آئے۔ دراصل یہ جگہ واقعی کچھ کچھ گھر معلوم ہوتی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ ہر چیز سے پُرانی جان پہچان دلجمعی اور سکونِ خاطر بہم پہنچاتی ہے۔ چنانچہ ہماری واپسی پر باورچی، دھوبی، خدمت گار، سب لوگ خوشی کے شادیانے بجا رہے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ جیل کے اندر باہر سب چیزیں برتن، دیواریں اور دریچے کی سلاخوں میں بنے ہوئے پھول پتے بطریقِ آشنائی سلام کہہ رہے ہیں اور اب ہم دوبارہ چین سے بیٹھ کر غالب کے ہم زبان ہو کر کہہ سکتے ہیں ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہاں تک کا سفر بھی کافی خوشگوار تھا یعنی پولیس کی بند گاڑی میں جس حد تک کوئی سفر خوشگوار ہو سکتا ہے۔ آہنی جالی کی باریک درازوں سے کبھی لدے پھندے کھیتوں کا منظر دیکھنے میں آتا کبھی کوئی رُوں رُوں کرتا ہوا رہٹ نظر پڑتا اور کبھی کسی شوخ رنگ لال نیلی دیہاتی قبا کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ لیکن یہ نظارہ کرنا ایسا محنت طلب تھا کہ گردن اینٹھ جانے کا ڈر ہوتا تھا۔

لے مارچ میں طبی معائنے کی غرض سے فیض کو لاہور لے جایا گیا تھا۔ منٹگمری واپس آنے کے بعد یہ خط لکھا۔

لاہور کا قیام کافی بدمزہ تھا۔ لیکن یہ تو ہوتا ہی ہے۔ بہرحال ایک مہینہ اور کٹ گیا اور ہم چند بار مل بھی لیے اس لیے کوئی محلِ شکایت نہیں۔

۲۲ مئی ۱۹۵۴ء (۱۰۶)

یہاں اب اتنی گرمی ہے کہ خدا کی پناہ۔ لیکن میں کچھ زیادہ بے آرام نہیں ہوں، ناشتہ کرتے ہی میں اپنے کمرے میں بند ہو جاتا ہوں جو خان عبدالغفار خاں کی مہربانی سے کافی ٹھنڈا ہے (ہمارے یہاں آنے سے پہلے خان عبدالغفار خاں نظر بند تھے۔) اور جب ہمارے صحن میں سائے ڈھلنے لگتے ہیں تو باہر نکلتا ہوں۔ اس دوران میں کچھ پڑھتا لکھتا رہتا ہوں۔ اگرچہ اب بینائی ویسی اچھی نہیں۔ نظر تھک جاتی ہے تو رکنا پڑتا ہے جس سے مزے میں فرق آتا ہے لیکن خیر کام چل جاتا ہے۔ میں نے روزنؑ برگ جوڑے کے خطوط ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔ اگرچہ بار بار دل زیادہ بھر آیا تو کتاب ہاتھ سے رکھنی پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے الفاظ کا سوز اور اُن کی عظمت اُسی ادیب کو نصیب ہو سکتی ہے جس کی مرگ و حیات ایسی ہی عظیم اور درد انگیز ہو۔ اُن کا اور اُن کے بچوں کا خیال آتا ہے تو اپنی مصیبت کی بات کرنا (اگرچہ یہ مصیبت بھی کچھ کم نہیں) بیہودہ پن معلوم ہوتا ہے۔

آج کل میں فریزر کی کتاب زرین شاخ (GOLDEN BOUGH) پڑھ رہا ہوں طالب علمی کے دنوں میں سرسری نظر سے دیکھی تھی اور کبھی فراغت سے پڑھنے کو ایک زمانے سے جی چاہتا تھا (اس نوع کی فہرست میں ابھی یہ کتابیں باقی ہیں۔ ہولاک ایلس اور رچرڈ برٹن کی تصنیفات، رادھا کرشنن کی تاریخ فلسفۂ ہند اور کنفیوشس۔ دوستوں کے کتب خانوں میں ان کی تلاش جاری رکھو) میں ختم کر لوں تو فریزر کی کتاب تمہیں بھی پڑھنی چاہیے،

ؑ امریکن انقلابی کارکن جنہیں صدر ٹرومین کے عہد میں جاسوسی کے جھوٹے الزام میں موت کی سزا دی گئی

یہ کتاب ذہنی تعلیم کے لوازمات میں سے ہے۔ خاص طور سے ہمارے جیسے ملک میا۔
شاعری کا یہ ہے کہ دل میں بہت کچھ ہے، کاغذ پر بہت کم۔ جیل کے موضوعات ختم ہو چکے ہیں اور جیل خانے سے کسی نئے خیال کی توقع بیکار ہے۔ جیل سے باہر جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں اشاعت کے لیے کچھ لکھ نہیں سکتے۔ لیکن یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہم بالکل بیکار بھی نہیں بیٹھے ہیں۔ دو مختصر نظمیں بھیجتا ہوں۔ ایک[1] لاہور جیل کا تاثر ہے اور دوسری[2] روزن برگ خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ ان میں کوئی ایسی کمال کی بات نہیں لیکن شاید وکٹر کو ترجمے کے لیے پسند آئیں۔ مقامی اخبارات میں جھیمی[3] کی صورت نظر آئی۔ دل خوش ہوا۔ نہ جانے شہرت حاصل کرنے کے لیے میزی کیا کرے گی لیکن کچھ نہ کچھ تو وہ بھی کرے گی ہی اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ خانہ ہمہ آفتاب کس دن سے ہو گیا۔

(۱۰۷)

۲۹ مئی ۱۹۵۴ء

ایک مہینہ اور بیت گیا اور مدتِ فراق اتنے دن اور مختصر ہو گئی۔ مدتِ عمر میں اتنے ہی دن کم ہو گئے لیکن اس کی پرواکون کرتا ہے۔ دنوں اور لمحوں کا حساب تو صرف رنج و محرومی کے زمانے میں کیا جاتا ہے۔ خوشی اور آسودگی کے لمحات کا شمار کون کرتا ہے۔ جب تو ہر لمحہ دیر و زود سے بے نیاز اور اپنی جگہ سالم و ثابت ہوتا ہے۔ جب یہ بھیانک خواب ختم ہو گا اور زندگی نئے سرے سے شروع ہو گی تو اپنے ساتھ بھی یونہی ہو گا۔ جب تن و جان کے کٹے ہوئے رگ و ریشے دوبارہ جڑ جائیں گے اور زخم بھر جائیں گے تو ان کا داغ بھی باقی نہیں رہے گا۔
لکھنے کی کوئی خاص بات نہیں سوائے اُن باتوں کے جو لکھ نہیں سکتے۔ گرمی کی وجہ سے انسان، حیوان، دل و دماغ ہر چیز ساکن اور بے حرکت ہے۔ صرف راتوں کا سونا ہے

---

[1] اے روشنیوں کا شہر — [2] ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

[3] جھیمی کو بچوں کے ایک بین الاقوامی تصویری مقابلے میں پہلا انعام ملا تھا

اور صبح کا جاگنا ہے اور باقی اللہ ہُو۔ خیر بالکل ایسا بھی نہیں۔ اب بھی کوئی نہ کوئی پھول کھلتا ہے اور سورج کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ صبح چند لمحوں کے لیے کوئی پرندہ چہچہاتا ہے اور دل میں کہیں تھوڑی سی جنبش ہوتی ہے جیسے کوئی خواب میں کروٹ لے رہا ہو۔ تھوڑے دنوں کے بعد جادو ٹوٹ جائے گا۔ سب نشّے کے ماتے چہروں پر برسات کا پانی برسے گا اور جذبہ و خیال گرما کی بے ہوشی سے دوبارہ بیدار ہوں گے۔ چند روز یا چند ہفتے اور پھر ہم گرمی کے اس آخری منحوس موسم سے گزر چکے ہوں گے اور پھر یہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔

اور تمہیں معلوم ہے کل ہم نے روزہ رکھا تھا یعنی سچ مچ کا روزہ شروع سے آخر تک۔ اگلے خط کی باری آنے تک عید آکر گزر چکی ہوگی اس لیے تمہیں اور بچوں کو اس دن کے لیے پیار۔

۷ جون ۱۹۵۴ء (۱۰۸)

جو بہت سی اچھی چیزیں تم نے اور بچوں نے بھیجی ہیں اور جو مسرت ان کی معیت میں آئی اس کے لیے تمہارا اور بچوں کا اب سے پہلے شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ اتفاق سے مجھے ان ہی چیزوں کی ضرورت تھی اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے سبب سے اپنی عید کی ویرانی احساسِ رفاقت سے آباد ہوگئی اور یہ احساس اب تک باقی ہے۔

یہ خط میں اپنے "گھر" کے پچھواڑے صحن میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ دوسری جانب غالباً سورج طلوع ہو چکا ہے اس لیے کہ اوپر بادلوں کا رنگ بدلتا جا رہا ہے اور سامنے پیڑوں اور جھاڑیوں کے رنگ اور خدوخال نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ میں صبح ساڑھے چار بجے سے یہاں بیٹھا ہوں جب یکایک بارش رُک گئی اور سنّاٹے نے مجھے جگا دیا۔ بہت زمانے کے بعد میں نے صبح کو پھر سُست قدم آتے ہوئے دیکھا، دور سے موذن

کی دعوتِ صلوٰۃ سُنی اپنے گردوپیش "غلام بانوں" کے کواڑ کڑکڑانے اور غلاموں کو مشقّت کے لیے ہنکانے کی آوازیں آئیں اور ایک طوطے کو اپنی محبوبہ سے محوِ کلام دیکھا۔ بہت سویرے سے ایک مُنّی سی بہت چمکیلی سیاہ، لمبی چونچ والی، نازک پنجوں والی چڑیا زینیا کے پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے۔ صحن کے پیڑ خوش آیند یادوں کی دُھن پر جھوم رہے ہیں اور برساتی بادلوں کے گداز سرمئی رنگ پر بیتے ہوئے دنوں کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ میری صبح کا یہ شعر آگیں سماں اب ختم ہونے ہی کو ہے اور میں اپنی یادوں کے ساتھ اب تنہا نہیں ہوں جیل خانہ جاگ اُٹھا ہے ادھر ہمارے باغیچے میں کام کرنے والے قیدی ایک ایک کر کے چلے آرہے ہیں۔ یہ سب مجھے قدرے تعجب سے دیکھ رہے ہیں اس لیے کہ اس وقت میں عام طور سے بستر میں ہوتا ہوں۔

اور کوئی خاص بات لکھنے کی نہیں ہے۔ گزشتہ ماہ اخراجات زیادہ تھے۔ اس لیے خدشہ ہے کہ مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔ آتی دفعہ ساتھ لیتی آنا۔

۱۳ جون ۱۹۵۴ء (۱۰۹)

تمہارا خط دو دن ہوئے ملا تھا۔ اب کے یہ کچھ ایسا بشاش خط نہ تھا۔ لیکن اور مصیبتوں پر اس موسم کا اضافہ خاص مفید صحت نہیں ہے۔ لیکن آؤ اسے یوں دیکھنے کی کوشش کریں۔ دو دن کے بعد جون کا نصف مہینہ ختم ہو جائے گا۔ دو ہفتے کے بعد گرمیوں کا آدھا موسم گزر چکا ہوگا اور ایک ماہ کے بعد اس موسم کا زیادہ ناگوار زمانہ بیت چکا ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک ہفتے کے بعد دن چھوٹے ہونے لگیں گے، راتیں لمبی ہو جائیں گی اور سائے ڈھلنے لگیں گے۔ براؤ ننگ کے مصرعے یاد ہیں۔ سال کے اس مہینے میں دن بے پناہ طویل ہیں۔ لیکن راتیں۔ کم از کم راتیں ـــ تو مختصر ہیں۔ تم کہو گی کہ یہ بالکل فضول بات ہے۔ ایسی باتوں سے نہ گرمی کی شدت کم ہوتی ہے نہ اپنی مصیبت کا ازالہ ہوتا ہے۔ نہ اس سے گرہ میں پیسے آتے ہیں۔ نہ رنج و عذاب کا خاتمہ قریب آتا ہے۔ الفاظ سے نہ کچھ

بنتا ہے نہ بگڑتا ہے۔ شاید تمہارا کہنا ٹھیک ہو لیکن ہمارے پاس الفاظ کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ یا پھر جذبات ہیں جو یہ الفاظ تخلیق کرتے ہیں یعنی ایمان اور ہمت اور اُمید اور پیار اور یہ سب بیش قیمت چیزیں ہیں جن کے سہارے اپنی روح کا افتخار اور اپنے دل کی بشاشت برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ تو کیوں نہ ہم اس غرور سے سر اٹھا کر چلیں اور بشاش رہیں۔ گرچہ خالی جیب اور ویران دن جائیں جہنم میں۔

وکٹر کو خط لکھو تو بتا دینا کہ جس خرافات کا وہ ترجمہ کر رہے ہیں اس میں کوئی چیز اس قابل سمجھیں تو نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن کو بھجوا دیں۔ بہت زمانہ ہوا جبکہ کنگسلے[۱] مارٹن نے مجھ سے کچھ تراجم کی فرمائش کی تھی اور میں نے کہا تھا کہ ہمارے اشعار اس قابل نہیں ہیں۔ میری رائے تو اب بھی یہی ہے لیکن میری رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔

آجکل میں چاسر پڑھ رہا ہوں۔

۲۵ جون ۱۹۵۴ء

(۱۱۰)

یہ کچھ خود غرضی بھی معلوم ہوتی ہے اور عیاشی بھی کہ میں تمہارے تین خطوں کے جواب میں صرف ایک خط لکھ سکتا ہوں۔ لیکن قاعدے سے مجبور ہوں۔ پھر یہ ایک طرح سے محرومی بھی ہے۔ اس لیے کہ عزیز کو خط لکھنے سے بھی بہت سی تسکین اور بہت سی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خط لکھنے کی باری آنے تک بہت سے وقتی تاثرات جذبات اور خیالات جو فوری طور سے اظہار کے طالب ہوتے ہیں باسی معلوم ہونے لگتے ہیں اور انہیں رقم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جیل میں اور سب باتوں کی طرح یہ بھی غیر اہم اور چھوٹی موٹی باتیں معلوم ہیں۔ یعنی کسی صبح کی کیفیت، کسی بادل کا رنگ کوئی گریزاں یاد یا کوئی موزوں جملہ جو ایک دفعہ ہاتھ سے نکل جائے تو جیل کے بے رنگ عدم آباد سے اُسے دوبارہ وجود میں لانا مشکل ہو جاتا ہے۔

---

[۱] ممتاز انگریز صحافی ہفت روزہ نیو اسٹیٹسمین کے بانی اور پہلے مدیر۔ اب انتقال ہو چکا ہے۔

نقوش اور دستِ صبا کے نسخے ابھی تک نہیں پہنچے اُمید ہے کہ دوسری چیزوں کے ساتھ جلد بھجوا دو گی۔ مظہر کو یہ پیغام پہنچا دینا کہ اخبار کی پروف ریڈنگ اور سب ایڈیٹنگ پہلے سے بہتر ہے لیکن تمام سب ایڈیٹر حضرات ایک اور بات سے غافل ہو گئے ہیں۔ کبھی بہت پرانی خبریں چھپ جاتی ہیں اور کبھی ایجنسیوں اور نامہ نگاروں کی خبروں میں بہت سی تکرار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ۲۱ جون کے شمارے میں ایک خبر ۱۸ جون کی تاریخ سے چھپی ہے اور کم از کم پانچ دوسری خبریں دو یا تین دن پرانی ہیں۔ یہ باسی مال قطعی غیر اہم خبروں پر مشتمل ہے جنھیں حذف کر دینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اُسی تاریخ کے اِمروز میں بعض کافی ضروری خبریں ایسی ہیں جو پاکستان ٹائمز میں نہیں چھپی ہیں۔ کسی ایک خبر میں بھی سول اینڈ ملٹری گزٹ سے پیچھے رہ جانا پاکستان ٹائمز کو زیب نہیں دیتا اور مجھے امید ہے کہ مظہر میری تنقید کا بُرا نہیں مانیں گے۔

اس موسم میں سنجیدہ تحریر و مطالعے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اس لیے آج کل صرف اخبارات رسالوں اور یادوں پر گزر رہی ہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا ہے لیکن آزادی اور تجدیدِ ملاقات کی امید ہمیشہ ساتھ ہے۔ اس دن کی اُمید جب ایامِ اسیری کی بیکار تلخی دل سے دُھل جائے گی اور مستقبل محبت اور قہقہوں کو جلو میں لیے سکون و مسرت کا ضامن ہوگا۔

(۱۱۱)

۳۰ جون ۱۹۵۴ء

شفیع کو میرا سلام اور دوستانہ خط کا شکریہ پہنچا دینا۔ یہ بھی بتا دینا کہ میں خط لکھنے سے معذور رہوں۔ اس کی وجہ بتا دینا اور یہ بھی کہہ دینا کہ موسم ذرا بہتر ہو جائے تو جس شاہکار کی انہوں نے فرمائش کی ہے اسے لکھنے کی کوشش کروں گا۔ "سویرا" کے مدیر حنیف رامے کو لکھ دینا کہ جو سوالنامہ انہوں نے بھیجا ہے میں اس کا جواب خوشی سے لکھ دیتا لیکن بندش کی وجہ سے نہیں لکھ سکتا۔ اس کے علاوہ ایلیٹ کے مضامین جن پر وہ تبصرہ چاہتے ہیں میرے پاس نہیں ہیں۔

میں یہ لکھ چکا تھا کہ تمہارا خط پہنچا جس میں تم نے اپنے ناشر کے رونے دھونے

اور اس سے جدال و قتال کی بات کی ہے۔ اس سے اتنا تو ظاہر ہے کہ اور کچھ بھی ہو ہمیں کاروبار سے کبھی کچھ وصول نہیں ہوگا۔ کاروبار اور نرم دلی دونوں ایک ساتھ نہیں چلتے۔ بہتر یہ ہوگا کہ جو کتابیں بچ گئی ہیں وہ سب لاگت کے دام پر حنیف یا شفیع ہماری جانب سے خرید لیں۔ اور کچھ اپنا منافع رکھ کر بیچ دیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو کسی اور فریق سے اس کا تصفیہ کروالو۔ اگر ___ اتنے ہی قلّاش ہیں تو بہتر ہے کہ وہ کچھ ادا نہ کریں اور اقرار نامے وغیرہ کا دردِ سر میرے ذمے نہ کریں۔ خیرات خیرات ہے اور معاملہ معاملہ ہے۔ وہ خود جو چاہیں انتخاب کرلیں۔

(۱۱۲)

۲۱ جولائی ۱۹۵۴ء

تمہارے شاعر نے لکھا تھا "نومبر کے مہینے میں جون کا سا کچھ سماں ہوگا۔ جیسے تم کہیں قریب سے گزرے ہو" اور یہاں جولائی کے مہینے میں نومبر کا سا سماں ہے۔ ہر چیز کی صورت بدل گئی ہے۔ آسمان دُھلا دھلایا اور شفّاف نظر آتا ہے۔ گھاس سرسبز اور کچھ سیاہی مائل نظر آتی ہے۔ ہوا اور دھوپ میں پیار کی سی نرمی اور غروبِ آفتاب کا منظر زرق برق دکھائی دیتا ہے۔ ایسے موسم میں عمرِ عزیز کے زیاں پر دل اداس ہونے لگتا ہے لیکن اس کا شکر ادا کرنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ ہم اسے ضائع ہوتے ہوئے دیکھنے کو زندہ موجود ہیں۔ میں ایلیئٹ کی نظم پڑھ رہا ہوں۔ وقت جو قاتل ہے وقت جو پالنہار ہے۔ بہت خوبصورت نظم ہے۔ اگرچہ اس سے ایلیئٹ جو نتائج اخذ کرتے ہیں بالکل بے سر و پا ہیں، مثلاً یہ عمدہ مصرعے سُنو۔

؎ نام عمداً حذف کیا ہے۔

BETWEEN MIDNIGHT AND DAWN, WHEN THE PAST IS
ALL DECEPTION,
THE FUTURE, FUTURELESS; BEFORE THE MORNING WATCH,
WHEN THE TIME STOPS, AND TIME IS NEVER
ENDING......

شاید یہ بات بھی کچھ بوگس ہے لیکن اس قدر اثر آفریں۔

گزشتہ ہفتے اسحاق کے لیے آموں کا ایک پارسل آیا تھا جو اتنا بڑا تھا کہ ہم آج صبح تک ختم نہیں کر سکے اور آج صبح کچھ اور آم پہنچ گئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ میاں اپنے نیک بندوں سے غافل نہیں ہیں اور زندگی کی نعمتیں یہاں بھی میسر آجاتی ہیں۔

میں یہ لکھنا بھول گیا تھا کہ تمہاری امّاں کا ایک خط آیا تھا۔ جب تم انہیں جواب دو تو میرا پیار لکھ بھیجنا۔ اور یہ فرمائش کر دینا کہ جب کرسمس کے تحفے کا وقت آئے تو مجھے کچھ بڑھیا قسم کے سگریٹ بھجوا دیں۔ ہم یہاں اچھے سگریٹ کا ذائقہ بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ جیل میں دل کتنا حریص ہو جاتا ہے جیسے میز و اور اُس کے آم۔

(۱۱۳)

۲۷ جولائی ۱۹۵۴ء

کچھ انتظار کے بعد گزشتہ ہفتے تمہارے تین خط یکبارگی آگئے۔ چنانچہ دل خوش اور مطمئن ہے۔ خاص طور سے تمہارے آخری خط سے گھر کی بہت یاد آئی لیکن افسردگی سے نہیں بلکہ خوش دلی سے۔ وہ اس خیال سے کہ اس سفر کے خاتمے پر کتنی خوش آئند چیزیں اپنی منتظر ہیں۔ جب وہ وقت آئے گا ہم ایک بھرپور محفل نہیں بلکہ کئی محفلیں سجائیں گے۔ البتہ گانے والیوں کے متعلق شاید ہم میں اختلاف رائے ہو۔ اس سے آسکر وائلڈ کا مشہور مقولہ یاد آگیا کہ لالچ (TEMPTATION) پر قابو پانے کی واحد صورت یہی ہے کہ آدمی لالچ میں آجائے۔ یہ مقولہ دراصل آسکر وائلڈ کا نہیں ہے بلکہ چاسر کا ہے اور آسکر وائلڈ صاحب نے اعتراف کیے بغیر اڑا

لیا ہے۔ اگر پھر کوئی تمہارے سامنے دہرائے تو اس تصحیح سے تم اپنی علمیت جتا سکتی ہو۔ آم اور تمباکو کا ایک ٹن مل گیا ہے۔ آم اتنے میٹھے تھے کہ ہم ایک ہی دن میں چٹ کر گئے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا ورنہ ایک دردناک واقعے کے سبب سے شاید انہیں حلق سے اُتارنا مشکل ہو جاتا۔ جیل میں آنے سے پہلے ہم سمجھتے تھے کہ اسیری کوئی شجاعانہ اور بلند مرتبہ بات ہے۔ اب پتہ چلا کہ اس میں نہ شجاعت کا کوئی مضمون ہے نہ عالی حوصلگی کا۔ اس میں صرف درد ہے اور ناقابلِ بیان درد۔ اور اس درد کا صحیح احساس مجھے ایک گرفتار شکاری پرندے سے ہوا جس کی کچھ دنوں سے ہم دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ یہ چھوٹا سا ایک شکرا ہے جو کچھ دن پہلے ہمارے غسل خانے میں آ پہنچا اور ہمارے خدمت گار قیدی نے پکڑ لیا۔ سدھانے کے خیال سے قیدی نے اس کی ٹانگ میں رسّی باندھ کے ایک ٹوکرے کے اندر بند کر دیا۔ لیکن اسی شام وہ کسی طرح ٹوکرے سے نکل گیا اور اڑ کر ہمارے صحن کے ایک درخت پر جا بیٹھا۔ اس کی رسّی شاخوں میں الجھ گئی وہ بے چارا تمام رات پھڑ پھڑاتا رہا اور ہم اس کی گلوگیر فریاد سنتے رہے۔ اگلی صبح ہم نے اُسے نیچے اُتار لیا لیکن اس کی ٹانگ کئی جگہ سے ٹوٹ چکی تھی۔ اب نہ وہ لڑ سکتا ہے اور نہ شکار کر سکتا ہے۔ بیکسی کے عالم میں صحن میں دبکا بیٹھا تھا۔ ایک دن پہلے اس کی آواز سے جن کوؤں چڑیوں اور میناؤں کی جان خطا ہوتی تھی اب وہی پرے باندھ کر اس کے آس پاس جمع ہوتے ہیں اور بہ یک آواز اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور آوازے کستے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تذلیل پر شکرے کی مغرور چمکدار آنکھیں درد سے دُھندلا جاتی ہیں۔ پرندے رو تو نہیں سکتے لیکن اس بیچارے کی بے بسی دیکھ کر دل بھر آتا ہے۔ ہم اُسے اچھی طرح کھلاتے پلاتے ہیں لیکن غالباً دو چار دن میں وہ مر جائے گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نظامِ فطرت میں بے زبان مخلوق کی بیکسی کا علاج یہی ہے۔ فطرت میں ان کے درد کا دارو موت ہے۔ یہ صرف انسان کا مقدر ہے کہ وہ اپنا درد اور اپنے زخم دل میں لیے جئے جائے۔ سال ہا سال، نسل در نسل، قرن دَر قرن۔ کیونکہ اس کے درد کا علاج مرنے سے نہیں جینے ہی سے ہوتا ہے۔ اس کے مسائل

موت سے نہیں زندگی ہی سے حل ہوتے ہیں۔ اسی خاطر اُسے وہ ایمان اور وہ نظر بخشی گئی ہے جو اس کی ذات سے پرے اور اس کے عہد سے آگے دیکھ سکتی ہے اسی سہارے پر وہ دکھ اٹھائے جاتا ہے اور امید کئے جاتا ہے اس دن کی امید جو شاید اُسے کبھی دیکھنا نصیب نہ ہو۔ وہ دن جب سارے غم مٹ جائیں گے، سب درد تھم جائے گا۔ جب رونے کے بجائے ہنسنا ہوگا اور سب آنسو خشک ہو جائیں گے۔ اَن گنت صدیوں کے بعد انسان نے ہاتھ پاؤں سے کام لینا سیکھا۔ انہی صدیوں میں بولنا اور سوچنا سیکھا اور شاید اب وہ وقت قریب آرہا ہے جب وہ خوش رہنا بھی سیکھ لے گا۔ لو یہ تو قریب قریب لکچر ہو گیا۔ ہماری اسکول ماسٹری کی رگ کبھی کبھی یوں ہی پھڑکنے لگتی ہے۔

اب میں پندرہ اگست اور تمہاری آمد کے انتظار میں ہوں۔ صوفی صاحب سے کہنا کہ مجھے فیلن کی لغت تین چار ماہ کے لیے بھجوا دیں۔ آج کل میں ہومر کا ترجمہ کرنے کی فکر میں ہوں۔

۲۵ اگست ۱۹۵۴ء (۱۱۴)

ایک مہینہ اور گزر چکا اور اس کے بعد جو بھی مہینہ گزرے گا اپنی وضع کا آخری مہینہ ہوگا اور جب لوٹ کر آئے گا تو مختلف اور کہیں گوارا صورت میں آئے گا۔ چنانچہ اب ہر ماہ اپنے آپ سے یہ کہنا کیسا اچھا لگے گا کہ اگست گیا، ستمبر گیا، اکتوبر...... اور دس دن میں جب تمہاری چھُٹی شروع ہو جائے گی تو یہ گرمیوں کا موسم بھی بدل چکا ہوگا اور پھر سردیوں میں دن چھوٹے ہو جائیں گے اور جلد گزرنے لگیں گے۔

خرگوشوں کے لیے میزو کی فرمائش سُن کر ہنسی بھی آئی، دل خوش بھی ہوا جب تک دنیا میں ایسی باتیں موجود ہیں، اپنی غیر حاضری ہی میں سہی، کوئی ناخوش کیسے ہو سکتا ہے لیکن تم لوگ خرگوشوں کا خاندان کیسے سنبھالو گے۔ شاید بہتر ہوگا کہ ان کا رنگین طوطوں سے تبادلہ کر لو جو تم نے لکھا ہے کہ کوئی دوست مجھے بھیجنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ پرندے پسند ہیں

لیکن میں قید خانے میں مزید قیدیوں کا اضافہ کرنا نہیں چاہتا اور پھر اس بارے میں مجھے قاعدہ قانون بھی نہیں معلوم۔

مرزا ادیب نے لکھا ہے کہ انہیں کسی زیرِ طبع کتاب کے سلسلے میں میری تصویر اور سوانح عمری درکار ہے۔ اگر پہلے سے علم ہوتا کہ ہمیں شہرت ملنے والی ہے تو بہت سی تصویریں اتروا کے رکھ لیتے۔ افسوس! اور سوانح عمری یہ ہے۔ پیدائش سیالکوٹ ۱۹۱۱ء اور عربی میں ابتدائی تعلیم مولوی محمد ابراہیم میر اور شمس العلماء سید میر حسن صاحب کی مساجد میں حاصل کی، اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور (ایم۔ اے انگریزی ۱۹۳۳) اورنٹیل کالج (ایم اے عربی ۱۹۳۴) ملازمت ایم۔ اے او کالج امرتسر ۱۹۳۴ تا ۱۹۴۰ء۔ ہیلی کالج، لاہور ۱۹۴۰ تا ۱۹۴۲ء (اسی زمانے میں ادب لطیف کی ادارت کی)۔ فوج مئی ۱۹۴۲ تا دسمبر ۱۹۴۶ مستعفی ہوکر پاکستان ٹائمز کی ادارت شروع کی۔ مزدور تنظیموں اور صحافی تنظیموں میں کام کیا۔ تصنیفات دو مجموعے[1] (۱۹۴۲ نقش فریادی - ۱۹۵۳ دستِ صبا) متفرق تنقیدی مضامین، نشری تقاریر، ریڈیو ڈرامے وغیرہ۔ شادی شدہ۔ بہت سگریٹ پیتے ہیں (آج کل نہیں) اور اس سے بھی زیادہ تضیع اوقات کرتے ہیں۔ بس یہی کچھ ہے۔

آج کل ہر طرف سے آموں کی بارش ہو رہی ہے۔ کاش کہ کسی بہتر شے کے لیے دعا کی ہوتی۔

---

[1] اب کلام کے مجموعوں کی تعداد پانچ ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ مضامین کا ایک مجموعہ "میزان" کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

۱۱ اگست ۱۹۵۴ء (۱۱۵)

جیل میں جو بہت سی عیدیں آئیں اور گزر گئیں ان میں یہ عید غالباً سب سے زیادہ ویران تھی۔ بالکل بے رنگ اجاڑ دن تھا جس نے کوئی یاد یا آرزو بھی بیدار نہ کی۔ میں نے قیدیوں کی جماعت کے ساتھ نماز ضرور ادا کی (اور یہ کیسا دلدوز منظر ہوتا ہے) لیکن اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف ڈان کوئکزوٹ پڑھتا رہا اور اب کے سانچو پانزا[1] پر بھی ہنسی نہیں آئی۔ خیر ہٹاؤ۔ اگلے ہفتے تم آؤ گی تو ہم جھوٹ موٹ تہوار کا کچھ سماں پیدا کر لیں گے۔

تمہاری تکالیف کا بہت رنج ہے۔ لیکن اب تھوڑی دیر اور صبر کر لو۔ اگلے ہفتے تمہاری چھٹی شروع ہو جائے گی اور پھر اگلے سال تک تمہیں یوم آزادی نمبر کا دردِ سر نہ ہوگا۔ نہ گرمیوں کے برے دن گزارنے پڑیں گے۔ اگلے سال جب گرمیوں کا موسم آئے گا تو "چمگادڑ رات" پرواز کر چکی ہوگی۔ ٹینی سن یاد ہے۔

COME INTO THE GARDEN, MAUD

FOR THE BLACK BAT NIGHT HAS FLOWN

لیکن آخر ماڈ کیوں؟ سخت فضول اور غیر شاعرانہ نام ہے۔

فلم کے بارے میں کتابیں نہیں مل سکیں تو کوئی بات نہیں لیکن اب کے فیروز سنز کی دوکان پر جاؤ تو دیکھنا کہ ڈرائنگ اور مصوری پر کوئی کتابیں آئی ہیں کہ نہیں اور ہومیوپیتھک طب پر کوئی ابتدائی کتاب ہے کہ نہیں۔ دراصل یہ محض ہوسناکی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ خواہ ہم یہ کتابیں پڑھیں یا نہ پڑھیں۔

---

[1] ناول کا مزاحیہ کردار

۲۵ اگست ۱۹۵۴ء (۱۱۶)

آج خنک ہوادار دن ہے۔ راحت فزا دن۔ ہوا میں پھر بہار کی سی کیفیت ہے۔ شاید تم کہوگی کہ بہار کے بجائے خزاں کہنا چاہیے لیکن ہمارے ہاں تو صحیح معنوں میں خزاں ہوتی ہے نہ بہار۔ یہ تصورات تو اصل میں سرد ملکوں کے ہیں۔ جنہی کہ بہار اور خزاں کے الفاظ بھی ہمارے دیس کے نہیں۔ پٹھانوں اور مغلوں کے وسیلے سے افغانستان اور وسط ایشیا سے آئے ہیں۔ ان حضرات کے وارد ہونے سے پہلے ہمارے شعرا تو صرف برکھا رُت جانتے تھے جب کوئل کوکتی ہے، آم کے پیڑوں پر بجلی کڑکتی ہے اور کوندا لپکتا ہے، پھر اس زمانے میں ہمارے ہاں نہ گلاب تھا نہ نرگس نہ بلبل نہ خوبانی نہ انار صرف کوئل تھی اور تلسی اور مولسری اور صندل۔ اس اعتبار سے ہمارے شعرا کو اب تک کارنیشن اور کوکا کولا اور شنیل کا تذکرہ شروع کر دینا چاہیے تھا لیکن بدقسمتی سے اب ہمارے شاعر کو وہ مراعات حاصل نہیں جو پہلے تھیں اور تعیش کا نیا ساز و سامان اسے شاید ہی کبھی میسر آتا ہے۔

میں یہ سننے کے لیے منتظر ہوں کہ چھوٹی والی کی سالگرہ کیسے گزری اور اسے میرا تار ملا یا نہیں۔ ایسے دنوں پر اپنی غیر حاضری کا رنج ہے لیکن اگر ایسے دن میں بچوں کا دل کچھ خوش ہو گیا تو اپنی خوشی یا ناخوشی کوئی ایسی بات نہیں۔ مستقبل میں کافی وقت رکھا ہے۔ جب ماضی میں جو کچھ کھویا ہے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ یہ شاید کچھ احمقانہ سی بات ہے اس لیے کہ مستقبل کبھی ماضی کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ ماضی کبھی لوٹ کر نہیں آتا لیکن کہنے سے مراد یہ ہے کہ مستقبل میں شاید ذہنی راحت اور طمانیت نصیب ہو تاکہ ماضی کی محرومیوں کا درد و تاسف دل سے محو ہو جائے

۱؎ میزی

اگر آدمی اپنے حال سے خوش ہو تو وہ ماضی کی جانب بہت کم نظر کرتا ہے اور ماضی میں جو کچھ بھی جھیلا ہوا سے فراموش کر دیتا ہے۔

نوازش[1] کی وفات کا سن کر بہت قلق ہوا۔ صرف اتنی خبر سننے میں آئی کہ موٹر کا حادثہ ہو گیا تھا۔ تفصیلات کا پتہ نہیں چلا۔ ان کے بھائی کو میری دلی تعزیت پہنچا دینا۔ میں نے خبر سنتے ہی ان کے گھر زبانی پیغام بھجوایا تھا لیکن ممکن ہے اُسے نہ مل سکا ہو۔

اب موسم ذرا بہتر ہوا ہے تو میں نے دوبارہ کام شروع کر دیا ہے۔ ابسن کے ڈرامے PILLARS OF THE COMMUNITY کا نصف کے قریب ترجمہ کر چکا ہوں۔ لیکن یہ اُردو زبان ہے بہت دردِ سر۔ پہلے ہی لفظ کمیونٹی پر بات اٹکی ہوئی ہے۔ یعنی ایک ہی شہر یا محلے میں رہنے والے لوگوں کا گروہ۔ مہربانی سے حسرت[2] یا امتیاز[3] یا خواجہ منظور[4] سے پوچھ کر لکھو کہ کونسا لفظ موزوں ہے۔ مجھے عربی فارسی کا کوئی عالمانہ لفظ نہیں چاہیے۔ وہ تو میں خود بھی تلاش کر سکتا ہوں۔ کوئی روزمرّہ عام بول چال کا لفظ چاہیے۔ چند الفاظ اور بھی پوچھنے کے ہیں لیکن وہ پھر کبھی سہی۔

(۱۱۷)

۴ ستمبر ۱۹۵۴ء

بے چاری منیزہ اور اس کے کھٹمل۔ مجھے تمہیں پہلے سے متنبہ کر دینا چاہیے تھا اس لیے کہ ایبٹ آباد کے کھٹمل شہرۂ آفاق ہیں۔ مجھے یہ اُن دنوں سے یاد ہیں جب میں بچپن میں ایک بار ایبٹ آباد گیا تھا۔ جب سے اب تک اتنا زمانہ گزر چکا ہے۔ لیکن ابھی کل بات

---

[1] صاحبزادہ نوازش علی جنہوں نے فیضؔ کی طرف سے وکالت کی [2] چراغ حسن حسرت
[3] امتیاز علی تاج [4] سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور۔

معلوم ہوتی ہے۔ حمید بھائی کی اکلوتی بہن جو بہت خوبصورت تھیں اور جوانی میں فوت ہوگئیں اِس علاقے میں بیاہی ہوئی تھیں اور میں اور بچارے طفیل ان کے ہاں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گئے تھے۔ اُن کے شوہر[1] کے پیر صاحب ایک دن ہمیں ایبٹ آباد کی سیر کو لے گئے۔ وہاں کھٹملوں نے اس بُری طرح کاٹا کہ مجھے بخار آگیا اور کئی دن بستر میں رہنا پڑا۔ میں نے اس سے پہلے پہاڑ، پہاڑی ندیاں اور چشمے کبھی نہ دیکھے تھے اور یہ سب کچھ کتنا کیف آور تھا۔ حجرے کے صحن میں میری چچازاد بہن کے شوہر جو مقامی خان تھے پستول سے نشانہ بازی کی مشق کر رہے ہیں۔ گھر کے اندر دالان میں دیوار پر طرح طرح کی تلواریں، خنجر اور پیش قبض سجے ہیں۔ پیر صاحب کی بوڑھی امّاں تعویذ گنڈے کر رہی ہیں اور جب مرد اِدھر اُدھر ہوں تو گاؤں کی حسینائیں پہاڑی ندّی میں نیم برہنہ نہا رہی ہیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ جن لوگوں سے یہ یادیں وابستہ ہیں اُن میں اب کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔ نہ میری بہن نہ ان کے شوہر، نہ پیر صاحب نہ ان کی امّاں نہ میرا بھائی۔ لیکن شاید جب تک کوئی کسی کی یادیں زندہ ہو اُسے مردہ نہیں کہنا چاہیے۔ اور اگر یہ سب لوگ آج زندہ ہوتے تو شاید ان کی یاد اتنی روشن اور تابناک نہ ہوتی جیسی کہ اب ہے۔

السن کا ترجمہ اب تک جاری ہے لیکن اب اس سے کچھ الجھن ہونے لگی ہے۔ پوری صحت سے ترجمہ کرنا بہت ہی عرق ریزی کا کام ہے جس میں تخلیقی کام سے بھی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن امید ہے کہ اب یہ ختم ہو ہی جائے گا۔

---

[1] خان صاحب چودھری عبدالحمید فیض کے بہنوئی اور چچازاد بھائی

۲۴ ستمبر ۱۹۵۴ء (۱۱۸)

اِس وقت چھما چھم پانی برس رہا ہے۔ آج کی صبح بہت ہی نظارہ پرور صبح تھی بہت سویرے کالے، نیلے، سرمئی، فالسئی بادل گھر کر آئے اور چاروں اُور آسمان پر چھا گئے۔ پھر ہمارے سبزے پر یکایک بہت سے نئے ملاقاتیوں کا تانتا لگ گیا۔ ننھی منّی طرح طرح کی خوبصورت چڑیاں تھیں۔ کچھ سیاہ اور سرمئی موزوں رنگوں میں ملبوس جن کی دُم کے نیچے سُرخ اور زرد بندیاں سی تھیں۔ کچھ سُنہری، سبز رنگ کی جن کی دُم سے باہر ایک مہین لمبا سا پر نکلا ہوا تھا۔ اور آنکھوں کے نیچے کاجل کی سی لمبی سیاہ لکیر عجب شوخی اور طرّاری کا پتہ دیتی تھی۔ پھر طوطوں کا ایک غول آیا اور شور مچاتے ہوئے گزر گیا۔ دھیرے دِھیرے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی اور سب پیڑ پودے منتظر اور آرزومند نظر آنے لگے۔ پھر بارش آئی۔ پہلے بوندا باندی کی صورت میں اور پھر موسلا دھار۔ بہت زمانے کے بعد یہاں پر یہ پہلی بارش ہوئی ہے۔ اگرچہ بارش کے آثار کئی دن سے تھے۔ ہر روز بادل آتے، ٹھنڈی ہوا چلتی اور دن کی رنگت جیسے دُھل کر نِکھر سی جاتی۔ شام کا آسمان کسی مُصوّر کی رنگ آمیزی کا تختہ معلوم ہوتا۔ کسی زمانے میں اس طرح کے دن سے دل میں درد و حسرت کا ہجوم ہونے لگتا تھا لیکن اب کم ہی ایسا ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ سب حسن کوئی فضول اور دور از کار چیز ہے جس سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ فطرت کسی انسانی تجربے یا مقصد (جسمانی، جذباتی، مادّی یا جمالیاتی) کے واسطے ہی سے حسن افزا ہوتی ہے اور جیل خانے میں جان و تن کا رشتہ بہم رکھنے کے علاوہ نہ کوئی مقصد ہوتا ہے نہ مقصود۔ نہ ارادہ نہ عمل، تمنا نہ تسکین اور اسی وجہ سے کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہتی۔ باہر کی اہم باتوں کا ذکر نہیں، آس پاس کی چھوٹی موٹی چیزوں سے دل اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ خیر بالکل ایسا بھی نہیں ہوتا اس لیے کہ فطرت چھوٹے موٹے خوشگوار (اور کبھی ناگوار) اچنبھے پیدا کرتی رہتی ہے اور زندگی سب باتوں کے

باوجود بہر حال غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ نہ جانے اس خرافات کے کچھ معنی ہیں کہ نہیں کہنا صرف یہ تھا کہ موسم بہت خوشگوار ہے۔

[1] کے رشتے کے بارے میں یہ ہے کہ بظاہر موصوف مخلص آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بعض اوقات انسان اپنے جذبات کے بارے میں بھی دھوکہ کھا سکتا ہے اور ہر شادی کے ساتھ کوئی نہ کوئی خدشہ تو لگا ہی رہتا ہے۔ اس لیے میں تو اس رشتے کے حق میں ہوں۔ اگر خدانخواستہ شادی کامیاب نہ بھی ہو جب بھی صورت حال موجودہ صورت سے کچھ ایسی بدتر نہ ہوگی اور اگر کامیاب ہو گئی جیسے کہ ہونا چاہیے تو دونوں کو بہت سی مسرت حاصل ہوگی اس لیے تم اس بارے میں کوشش جاری رکھو۔ تم نے پوچھا ہے کہ دوسروں کی زندگی میں دخل دینا چاہیے کہ نہیں۔ میں کہتا ہوں ضرور دینا چاہیے بشرطیکہ آدمی دیانت داری سے محسوس کرے کہ اس سے کسی کا بھلا ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر نیک نتیجہ برآمد ہو تو شکریے یا احسان مندی کی توقع نہ رکھنی چاہیے اور نتیجہ برعکس ہو تو سب الزام اپنے سر لینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میرے ساتھ ایسا کئی بار ہو چکا ہے لیکن مجھے اس کا ذرا بھی تاسف نہیں۔ اس کھیل میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے آدمی یہ کھیل کھیلنے پر مجبور نہیں لیکن یوں دیکھئے تو آدمی اپنے سوا کسی کے لیے کچھ بھی کرنے پر مجبور نہیں اور اس کے باوجود کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔

۹ اکتوبر ۱۹۵۴ء (۱۱۹)

آج صبح جب میں ناشتہ کرنے بیٹھا تو یکایک بدر کی یاد آئی اور دل بلبلا اٹھا، میں بہت دیر تک کچھ افسردگی سے سوچتا رہا کہ انسانی دوستی کیسی فانی اور بے حقیقت شے ہے اور انسان کا دل کتنا

---

[1] نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔

ناشکرا ہے۔ بدؔر[1] غالباً ہمارا واحد مخلص دوست تھا لیکن ہم نہ کبھی اس کے گھر گئے ہیں نہ کبھی اس کی بیوی بچّوں کی خبر لی ہے، یوں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے اور ایسے ہی ہونا چاہیے۔ مرنے والے کیسے بھی عزیز کیوں نہ ہوں بہرحال زندگی سے لاتعلق ہیں اس لیے انہیں بھول جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ یہ صحیح ہے۔

جو مرنے والے یاد میں زندہ ہوں کیا وہ جینے والوں کی زندگی ہی کا جز نہیں ہوتے اس لیے کہ یاد ایسی ہی حقیقی شے ہے جیسے کوئی دور ذہنی تجربہ یا واقعی ملاقات، پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ مرنے والوں کی نیکی جینے والوں کی یادداشت میں ایک مثبت اور موثر عنصر کے طور سے زندہ رہے بشرطیکہ اس یاد سے جو درد وابستہ ہو اُسے کسی طور سے الگ کیا جا سکے یہ شرط اس لیے ضروری ہے کہ جو درد موت جیسی لاعلاج چیز سے وابستہ ہو وہ بے کار اور بے مقصد شے ہے اور بے مقصد دکھ اُٹھانا حوصلہ شکن بھی ہوتا ہے، غیر اخلاقی بھی۔ بہرحال کسی دن صوفی یا حسرت کو ساتھ لے کر بدر کے گھر والوں سے مل آنا،

تم نے آنے میں اتنی تاخیر کی ہے تو جرمانے کے طور پر ایک آدھ اور فرمائش بھی ہے۔ ایک تو ہمیں دیسی کھانے پکانے پر کوئی کتاب چاہیے، اگر کوئی اور ملازمت نہ ملی تو شاید باورچی بننا پڑے اور جیسے میں لکھ چکا ہوں مستقبل کے بارے میں خاطر جمع رکھو۔ ہم ساتھ ہونگے تو کوئی بھی ایسی مشکل نہیں جس کا ہم سامنا نہ کر سکیں یا جس پر قابو نہ پا سکیں، اگر تھوڑا سا بھی امن، سلامتی اور پڑھنے لکھنے کی آزادی میسّر ہو تو میں کہیں بھی ملازمت کو تیار ہوں ٹمبکٹو ہی میں کیوں نہ ہو، خیر مجھے روزی کمانے کی فکر نہ کبھی پہلے دامن گیر ہوئی ہے نہ اب ہے اس کے لیے صرف صحیح دماغ درکار ہے اور دو ہاتھ اور یہ لوازمات اپنے پاس موجود ہیں۔

---

[1] بدر الدین بدر: مرحوم ادیب اور صحافی پرانے دوست

۱۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء (۱۲۰)

نہ جانے یہ خط تمہارے روانہ ہونے سے پیشتر پہنچ سکے گا یا نہیں۔ خیر کچھ ایسا فرق نہیں پڑتا، بہت سے اُردو رسائل مل گئے ہیں جن سے کچھ وقت اچھا کٹ جائے گا اگرچہ یہ سب افسردگی کا سامان ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ تحریروں کا معیار اچھا نہیں وہ تو اچھا ہے اور ہمارے نوجوان لکھنے والے کافی ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں نمائش اور تکلف کچھ زیادہ ہے۔ لیکن یہ سب کے سب اتنے اداس اور دل شکستہ کیوں ہیں؟ بیشتر افسانوں اور بہت سی نظموں میں وہی ویران زندگیوں اور ٹوٹے ہوئے دلوں کا ماتم ہے اور اس بات کا رونا کہ ہر شے ایسی لعنتی اور مکردہ کیوں ہے۔ یہ پڑھ کر چلانے کو جی چاہتا ہے کہ خدا کے لیے کبھی تو خوشی کی بھی کوئی بات کرو، ہر شے مکردہ اور جہنمی ہی سہی، ساتھ ہی کچھ الزام اپنے کو دینا پڑتا ہے کہ ان میں سے بعض فیشن تو ہمیں نے ہی چلائے ہیں لیکن ہم تو جیل خانے میں ہیں اور یہ لوگ آزاد ہیں، یہ جوان ہیں، ہم بوڑھے ہیں، اور ان کے سامنے امید اور یقین کے ایسے بنے بنائے نقشے موجود ہیں جو ہم نے برسوں کی ذہنی اور جسمانی اذیت اور کاوش کے بعد دریافت کیے تھے۔ پھر یہ لوگ اتنے مایوس اور ملول کیوں ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ اپنے گرد و پیش زندگی کافی اجاڑ اور بے رونق ہے لیکن اپنے حال میں ماضی بھی شامل ہے اور مستقبل بھی اور اپنی دنیا کی حدود ساری سرزمینوں اور سارے سمندروں پر محیط ہیں، ان سب پر نگاہ کی جائے تو یقیناً دل میں کچھ ولولہ پیدا ہونا چاہیے اور اپنے وقتی اور ذاتی دکھ کے اُفق سے پرے دیکھ سکنے کی توفیق میسر آنی چاہیے۔ خاص طور سے اگر آدمی تندرست اور نوجوان ہو۔ کچھ لوگ کبھی کبھی یہ بات بھی کرتے ہیں لیکن محض عقیدے یا نظریے کے طور سے جس میں خلوص اور صداقت کا ثبوت نہیں ملتا۔ میں خود ہی کچھ لکھنا چاہتا ہوں لیکن ٹھیک سے اس کا ڈھب نہیں آتا۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اور ایسے مضامین لکھ کر دکھائے تو پھر ہم بھی لکھیں اور وہ غالباً اس انتظار میں ہیں کہ ہم لکھیں تو وہ بھی لکھیں جو بہت کوفت کا مضمون

ہے - خیر!

آج کل پھر جیل کی نیم بے ہوشی کا سا عالم ہے دن جیسے سر کے اوپر سے گزر رہے ہیں اور اکثر یاد نہیں رہتا کہ ہفتے کا کونسا دن اور مہینے کی کونسی تاریخ ہے، خیر یہ کیفیت بھی جلد گزر جائے گی۔

۴ نومبر ۱۹۵۴ء

(۱۲۱)

۳۱ تاریخ کو حسبِ وعدہ سرور اور بچے آئے تھے، وہ بہت کم وقت ٹھہریں اور ہم زیادہ بات نہ کرسکے لیکن مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ بہت غمزدہ نہیں ہیں اور ہم نے اپنے اپنے غم کا ذکر بھی نہیں کیا، صرف بچوں کو دیکھ کر دکھ ہوا اس لیے کہ ماں باپ کا تو کوئی بدل دنیا میں نہیں ہوتا اور یہ کتنے ظلم کی بات ہے کہ ننھّے ننھّے دل اس فراق کا داغ عمر بھر کے لیے اپنے ساتھ لیے پھریں۔

ہاں مجھے ۲۸ اکتوبر کی تاریخ یاد تھی (ہماری شادی کی سالگرہ) میں نے یہ دن یوں منایا کہ تمہیں پیار اور ان سب خوشیوں کا شکریہ بھیج کر جو ہمیں ایک ساتھ نصیب رہی ہیں، سرِ شام سو گیا۔ اب مجھے پہلے سے بھی زیادہ پکّا یقین ہے کہ بہترین دن ابھی دیکھنے باقی ہیں۔ موجودہ رات کے سائے ڈھل جانے کے بعد لمبے روشن دن جب "راوی چین ہی چین لکھتا ہے" ایسے دنوں کا سوچتا ہوں تو مجھے اتوار کا وہ دن یاد آتا ہے جو میں نے صبح سے شام تک لاج[1] میں گھاس پر لیٹے گزارا تھا، یہ یاد اس وقت زیادہ روشن اس لیے ہے کہ آج پرانے کاغذات میں سے اے ایس بی کا ایک خط برآمد ہوا جو انہوں نے لندن سے تمہیں لکھا تھا، جب تم آؤ تو یاد سے ساتھ لیتی جانا، میں چاہتا ہوں کہ یہ محفوظ رہے۔

---

[1] پرنسپل گورنمنٹ کالج کی اقامت گاہ جہاں ایک زمانے میں بطرس مقیم تھے۔

۱۱ نومبر ۴ ۱۹۵ء

(۱۲۲)

اس وقت شام کے پانچ بجے ہیں، دن ڈھل رہا ہے اور چند ہی لمحوں میں دیواروں اور درختوں پر تانبے اور کانسی کے رنگ کی روشنی کی آخری کرن بُجھ جائے گی۔ پھر پرندوں کی آوازیں گنگ ہو جائیں گی، اور وقت ٹھہر جائے گا، جس دن بیڈمنٹن کا کھیل نہ ہو یہ کافی برا وقت ہوتا ہے، نہ اتنی روشنی موجود ہوتی ہے کہ باہر بیٹھ کر پڑھ سکیں نہ اتنا اندھیرا کہ بجلی روشن کر سکیں (ویسے یہ ہم کر بھی نہیں سکتے اس لیے کہ دن میں بجلی بند رہتی ہے اور شام میں کافی دیر سے کھلتی ہے) اس وقت اگر آنکھیں الفاظ شناخت بھی کر سکیں تو دماغ ان کے معنی وصول کرنے سے انکار کر دیتا ہے، اس وقت سوچ بچار کرنا بھی اچھا نہیں اس لیے کہ گزرے ہوئے دن کی خاموش جانکنی خیالات کو افسردگی میں رنگ دیتی ہے۔

ہمارے ہاں اس وقت کے تعلق سے جو تصورات وابستہ ہیں اب میں انہیں زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ یہ وہ وقت ہے جب ہمارے محاورے میں "دونوں وقت ملتے ہیں"۔ دن کی پُراسرار گھڑی جب کنواریوں کو کھلے میں ننگے سر کھڑے ہونے سے منع کیا جاتا ہے، جب کوئی نیا کام شروع نہیں کیا جاتا، نہ کوئی مردہ دفنایا جاتا ہے حتیٰ کہ بعض لوگ تلاوت بھی نہیں کرتے، یہ عقائد تو اس زمانے سے چلے آ رہے ہیں جب سورج ایک زندہ دیوتا مانا جاتا تھا اور اندھیرا ایک زندہ عفریت۔ اب یہ دیوتا اور عفریت تو مر مرا چکے لیکن جاں بلب دن کی افسردگی اب بھی حقیقت ہے جو اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک رات اس کی موت کا یقین اور اگلی صبح کی پیدائش کی اُمید ساتھ لیے آنہیں پہنچتی۔

چنانچہ جس دن بیڈمنٹن نہ ہو میں مسلسل چلتا رہتا ہوں اور صحن کے چکر کاٹتا رہتا ہوں بالکل کولھو کے بیل کی طرح اور اپنا ذہن بھی ویسے ہی خالی ہوتا ہے۔ آج یہ وقت ذرا جلد گزر گیا اس لیے کہ میں یہ خط لکھ رہا ہوں اور اب اندھیرا اتنا بڑھ گیا ہے کہ زیادہ نہیں

لکھ سکتا، بجلی آئے گی تو باقی لکھوں گا یا کل صبح سہی،

جمعرات

میں کل رات یہ خط ختم نہ کر سکا، اس کے بجائے میں لڑکیوں کے لیے ایک پرانی کلاسیکی کتاب پڑھتا رہا جو میں نے چھیمی کے لیے تجویز کی تھی، پرانی وضع کی کتاب ہے لیکن بہت دل آویز، افسوس کی بات ہے کہ بچّوں کے لیے جو بھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب نصف صدی یا اس سے زیادہ پُرانی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کتابیں ایک مختلف ماحول اور فکر و خیال کی مختلف فضا میں لکھی گئی تھیں اس لیے ہر چند تحریر بہت عمدہ ہے بعض خیالات اب بالکل اوٹ پٹانگ معلوم ہوتے ہیں۔ بچّوں کا ادب ایسی اہم چیز ہے کہ میں سنجیدگی سے سوچتا ہوں خود ہی لکھنا شروع کر دوں، لیکن آج کل تو میں سنجیدگی سے بہت کچھ بننے کا سوچ رہا ہوں، مدرس، آرٹسٹ، باورچی، مالی، فلم پروڈیوسر، کسان مزدور وغیرہ وغیرہ جس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ بھی بننے کا کوئی خاص خطرہ نہیں ہے اور ہم وہی رہیں گے جو کہ ہیں، اور وہ کیا ہے؟ خیر جو کچھ بھی ہے۔

تو ہماری چھوٹی مٹلو اب اسٹار بن گئی ہے؟ جیمخانہ کلب میں اس کا رقص کسی طور میرے تصور میں نہیں آتا، نہ جانے کیسے لگ رہی تھی، پبلک کے سامنے آنا بچّوں کے لیے اچھا ہے لیکن صرف ایک حد تک، اس میں زیادتی اعصاب پر برا اثر ڈالتی ہے، خیر تمہیں بہتر معلوم ہے لیکن تم کوئی ذمہ داری سر نہ لو جو خواہ مخواہ دردِ سر ثابت ہو۔

۱۔ میزی

۲۵ نومبر ۱۹۵۴ء **(۱۲۳)**

یہ سُن کر افسوس ہوا کہ تمہارا سفر بہت بُرا گزرا اور تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ مجھے اسی کا ڈر تھا اس لیے کہ اس شام میری طبیعت بھی بہت مضمحل تھی اور مجھے تو کوئی سفر بھی درپیش نہیں تھا۔ میرے خیال میں آئندہ بہتر یہی ہے کہ روانگی سے پہلے ایک دو گھنٹے آرام کر لیا کرو خواہ اس کی خاطر ملاقات کے کچھ ضمنی لمحوں کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ امید ہے اب تمہیں افاقہ ہوگا اور تم اپنے علاج وغیرہ میں غفلت نہیں کروگی۔

تو اب ہمیں پھر ایک نئی نویلی حکومت عطا ہوئی اور پُرانا طائفہ غالباً ہمیشہ کے لیے رخصت ہوا۔ واہ جی واہ! افسوس کہ یہ تماشہ دیکھنے کو ہم وہاں موجود نہیں، بہرحال امید رکھنی چاہیے کہ اس سے ملک کی بھلائی کی کوئی صورت نکلے گی، کم ازکم لوگوں کی کچھ آس تو بندھ جائے گی،

یہ خط جلدی میں لکھ رہا ہوں تاکہ اس ڈاک سے چلا جائے۔ میں خوش اور تندرست ہوں، دن پھسلتے جا رہے ہیں اور گھر کا خیال، آرزو بھی اپنے ساتھ لاتا ہے اوٗ اطمینانِ خاطر بھی۔

۲۹ نومبر ۱۹۵۴ء **(۱۲۴)**

اب کے تمہارے جانے کے بعد مجھے ڈر تھا کہ اُمید رہائی کے التوا[1] نے تمہیں بہت رنجیدہ نہ کیا ہو لیکن تمہارے خط سے تشفّی ہوگئی، میں نے تو اس خُبر کو قطعی قابل توجہ ہی نہیں جانا ایوان اسیری میں شب و روز کے جو آسیب قطار اندر قطار کھڑے ہیں میں تو انکی جانب کبھی دیکھتا بھی نہیں میں تو ان سے پرے اس روشن منظر پر نگاہ جمائے رکھتا ہوں جہاں بچّے کھیل رہے ہیں

---

[1] اُن دنوں عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل مُسترد ہوگئی تھی۔

اور لوگ باگ محنت کر رہے ہیں، دُکھ اُٹھا رہے ہیں اور پیار کر رہے ہیں۔ لیکن شاید یہ بھی پوری طرح صحیح نہیں، اب مجھے اِن آسیبوں کی قطار سے ڈر نہیں لگتا۔ میں کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لیتا ہوں اور ان پر لعنت بھیجتا ہوں۔ لیکن سب دن ایسے بد وضع بھی نہیں ہوتے، بیچ میں ایسے دن بھی آتے ہیں جب تم سے اور بچوں سے ملاقات ہو جاتی ہے، یا کسی کتاب سے کوئی اچھوتا نگینہ برآمد ہوتا ہے یا کوئی اچھا خیال ذہن میں تشکیل پاتا ہے یا کوئی دن ویسے ہی خوبصورت ہوتا ہے اور کسی نغمے کی طرح کیف انگیز۔ ایسا ہی ایک دن گزشتہ ہفتے کی جمعرات کا دن تھا، سنہری، نیم خنک۔ نیم گرم دن جب ہلکے رنگ کے آسمان کے نیچے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی، ایسے سرور کی کیفیت تھی کہ تمہیں خط لکھنے کو جی چاہا لیکن پھر دل میں آس پاس کی سب چیزوں کی فہرست بننے لگی (ہمارا دل ہے ہی بہت حسابی) پرندے اور پودے اور روشنیاں اور سائے لیکن یہ فہرست گنوانا تو مقصود نہ تھا اس لیے میں نے چھوڑ دیا اور خط لکھنے کے بجائے دن بھر کافکا KAFKA کے عاشقانہ خطوط پڑھتا رہا، کوئی اجاڑ اور بے رونق دن ہوتا تو شاید انہیں پڑھنا اپنی برداشت سے باہر ہو جاتا، اچھا ہوا تم نے یہ کتاب بھیج دی۔ اس سے نہ صرف کافکا کی دوسری تصنیفات کو سمجھنے میں امداد ملتی ہے بلکہ نفسیاتی اُلجھنوں سے ایذا طلبی کا وہ شدید جذبہ بھی سمجھ میں آتا ہے جس نے بہت سے دوسرے درجے کے ادیب پیدا کیے ہیں، ان کا مرض تو وہی ہے جو کافکا کا تھا لیکن کافکا سا خلوص اور کمال ان کے حصّے میں نہیں آیا۔

ہمارا باغ لہک رہا ہے۔ نسترشیم اور کوسموس کے کچھ کچھ پھول کھلنے لگے ہیں اور گل داؤدی اور گیندا پوری بہار پر ہیں، افسوس کہ منٹگمری میں پھولوں کی کوئی نمائش نہیں ہوئی ورنہ ہم ضرور ایک آدھ انعام جیت لیتے۔

یکم دسمبر ۱۹۵۴ء
(۱۲۵)

تمہارا اتوار کا لکھا ہوا خط اتوار ہی کو مل گیا جس سے غیر متوقع خوشی ہوئی تمہارے پچھلے دو خطوط پڑھ کر زیادہ فرحت ہوئی کہ بچوں نے خود اپنی خریداری کی اپنی خریدی ہوئی چیزوں سے خوش ہوئے اور نئے جوتے بستر میں ساتھ لے کر سوئے، کیسی پیاری بات ہے، صرف اس لیے نہیں کہ وہ ہمارے بچے ہیں اگرچہ یہ بھی کچھ کم اہم نہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ بچے ہیں اور جب ہنستے ہوئے بچوں کا تصوّر کرو تو یوں لگتا ہے کہ ساری دنیا روشن ہو گئی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کی خوشی یا ہنسی میں یہ بات نہیں ہوتی اس لیے کہ اوّل تو ان میں بچوں کا خلوص اور بے فکری نہیں ہوتی اور دوسرے بڑی عمر کے لوگ الگ الگ افراد ہوتے ہیں لیکن بچے تو پھولوں یا پرندوں کی طرح فطرت کا جزو ہوتے ہیں، چنانچہ ان کی خوشی یا ناخوشی یہی تاثر پیدا کرتی ہے کہ ساری دنیا ہنس رہی ہے یا آنسو بہا رہی ہے۔ یہ خیال کافی دور تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن رہنے دو، بس اتنا ہے کہ انہیں جس قدر خوشی ہم پہنچا سکتے ہیں پہنچائیں اور یہ اُمید رکھیں کہ جب یہ بڑے ہوں گے تو ان کی دنیا ہماری دنیا سے بہتر ہو گی اور ان کے ستارے ہمارے ستاروں سے زیادہ مہربان ہوں گے۔ اگرچہ ہمارے بھی کچھ ایسے نامہربان نہیں تھے۔

صبح نو بجے سے ذرا اوپر وقت ہے، دھوپ کُھلی ہوئی ہے اور ہوا میں حرارت ہے۔ میں ناشتے کے بعد سے برآمدے میں بیٹھا دو طوطوں اور ایک گلہری کا تماشا دیکھ رہا ہوں، صبح سے یہ گلہری برآمدے کی چھت پر باہر دھوپ والی طرف کود پھاند رہی ہے اور دوسری جانب طوطوں کا ایک جوڑا ٹھونگیں مار مار کر اُسے بھگانے کی کوشش کر رہا ہے گلہری ذرا بھی نوٹس نہیں لیتی اور بدستور اپنی چُہل بازی میں مصروف ہے۔ کبھی کبھی ذرا اکڑ کر اپنے حریف کو گھور بھی لیتی ہے، دونوں فریق اتنے ڈرپوک ہیں کہ کھل کر سامنا کرنے سے کترا رہے ہیں صرف گیدڑ بھبکیوں پر زور ہے۔ اگلے دن میں یہیں بیٹھا تھا کہ یکایک میرے پیچھے بہت زور

کا شور بلند ہوا، مڑ کر دیکھا تو کوؤں، طوطوں اور شارکوں کا ایک متحدہ محاذ بیک آواز آسمان سر پر اٹھائے تھا، نیچے نظر پڑی تو دیکھا کہ ایک بلی بہت کھسیانے انداز میں جھاڑیوں کی طرف کھسک رہی ہے ؟ مجھے یکایک خیال آیا اسے کہتے ہیں "رائے عامہ کی طاقت" تو جیل خانے میں ہمارا سینما اور تھیٹر اور کھیل تماشہ بس یہی کچھ ہے، جو کچھ نہ ہونے سے بہر حال بہتر ہے۔ پھر پھول بھی ہیں، کتابیں بھی، خیال بھی اور یادیں بھی اور وقت کبھی تھمتا نہیں ہے اور ایک سال قریب قریب بیت چکا ہے۔

(۱۲۶)

۳۱ دسمبر ۱۹۵۴ء

نئے سال کی شام۔

ابھی شام نہیں ہوئی ہے، صرف نصف صبح گزری ہے۔ چند گھنٹے اور باقی ہیں اور پھر یہ برس بھی ہمارے گرد آلود دیروز میں مل کر خاک ہو جائے گا، شاید اسی وجہ سے اس دن کے لیے کوئی جذبہ دل میں محسوس نہیں ہوتا، نہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جادۂ وقت میں یہ دن کوئی اہم سنگِ میل ہے، یہ دن ویسا ہی ہے جیسے جیل خانے کے باقی دن ہیں جس سے صرف اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ پیمانۂ عمر میں بے رونقی کی مے ایک درجہ اور نیچے اتر آئی ہے جب سائے ڈھلنے لگیں گے تو شاید یہ تاثر بدل جائے اور اس دن کی کچھ اس طرح شناخت ہو سکے کہ یہ آخری درد کے آخری سال کا آخری دن ہے (آخری درد اس لیے کہ ہر خوشی کی طرح ہر درد بھی اپنی جگہ آخری ہوتا ہے جو گزر جائے تو کبھی پلٹ کر نہیں آتا پھر یہ درد صرف یاد میں واپس آسکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر درد کی یاد سے کچھ محسوس ہو جیسے یہ ضروری نہیں کہ جو بھی خوشی یاد کی جائے اس سے راحت پہنچے) اور پھر دل اس یقین سے خورسند ہوگا کہ کل بیدار ہوں گے تو ایک نئے سال کا نیا دن طلوع ہو چکا ہوگا جس سال کے دوران میں اُمید ہے کہ زندگی جدوجہد کی جانب اور دل و دماغ کسی بامقصد عمل کی طرف رجوع کر سکیں گے۔

تو آؤ دعا کریں کہ یہ نیا سال اور اس کے بعد آنے والا ہر سال ہمارے لیے ہمارے بچوں کے لیے اور ساری انسانیت کے لیے امن و مسرت کا پیغام لائے اور عہدِ ماضی کا بھی شکر ادا کریں۔ ان سب نعمتوں کے لیے جو ہمارے حصے میں آئیں اور جو کچھ چھن گیا یا جس سے محروم رہے اس سے درگزر کریں اس لیے کہ یہ درد و محرومی برداشت کرنے کی سکت بھی ہمیں میسر تھی۔

کیا میں کسی پادری صاحب کی سی گفتگو کر رہا ہوں؟ لیکن اس دن کچھ دین دار اور کچھ جذباتی محسوس کرنا تو قدرتی بات ہے۔

کتابوں کے بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ جو کتاب آسانی سے دستیاب نہ ہو سکے یا بہت قیمتی ہو اس کے لیے تردّد کی ضرورت نہیں، میں تو یونہی بے قاعدگی سے پڑھتا رہتا ہوں اور جو کتاب بھی ہاتھ آجائے غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ دراصل بے کار لوگوں کا دماغ تو کچھ الھڑ چھوکری کا سا ہو گیا ہے جس میں طرح طرح کے لالچ لپکے بھرے رہتے ہیں اور ہر چیز جو ہاتھ آسکے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے زیادہ بگاڑنا نہیں چاہیے۔ آسکر وائیلڈ کی کتاب کا وہی نام ہے جو تم نے لکھا یعنی HOUSE OF PROME- GRANATES- لندن یونیورسٹی کا کوئی پرانا کیلنڈر مل سکے تو اس سے بھی کام چل جائے گا اور عربی لغت کی کچھ ایسی جلدی نہیں۔

(۱۲۷)

۷ جنوری ۱۹۵۵ء

کل صبح جب میں اپنی سالگرہ[۱] کے دن بیدار ہوا تو میرا خیال تھا کہ یہ بے رنگ ابر آلود دن بھی ایسے ہی کسی ہنگامے یا قابلِ ذکر بات کے بغیر گزر جائے گا۔

۱۔ میٹرک کے سرٹیفیکٹ میں تاریخ پیدائش ۷ جنوری ۱۹۱۱ء لکھی ہے اور جب تک صحیح تاریخ کا علم نہیں ہوا تھا اس وقت تک فیضؔ کی سالگرہ ۷ جنوری ہی کو منائی جاتی تھی۔ بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کہ صحیح تاریخ ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء ہے۔

لیکن یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔ بسم اللہ یوں ہوئی کہ ابھی میں بستر ہی میں تھا کہ اسحاق نے بہت سے گلاب کے پھول لاکر ڈھیر کر دیے۔ بستر سے اٹھ کر باہر نکلا تو دیکھا کہ سورج چمک رہا ہے اور آسمان پر بادل کا نام و نشان تک نہیں۔ پھر ہم ناشتے پر بیٹھے تو تمہارا تار آگیا۔ گیارہ بجے کے قریب کافی کے لیے صحن میں گئے تو تمہارا تحفہ موصول ہوا (لیکن ہم اسے کریں گے کیا؟ ایسے خوبصورت کاغذ پر کچھ لکھنا تو ظلم ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اسے دیکھ کر عروسِ سخن جو بہت دن سے غائب ہے لوٹ آئے) کوئی ایک گھنٹے کے بعد دفتر سے پیغام آیا کہ کچھ کھانے کی چیزیں آئی ہیں۔ دیکھا تو ایک پوری فوج کا پیٹ بھرنے کو کافی تھا جیل میں ایک خرابی یہ ہے کہ نہ کوئی ضیافت کر سکتے ہیں نہ مہمان بلا سکتے ہیں اور ہم تین نفر اس دسترخوانِ نعمت سے کیسے نپٹ سکتے تھے۔ خیر جتنا کھا سکے کھایا۔ میرے دونوں ساتھیوں کا شکریہ قبول کرو۔ خوب سیر ہو کر ہم دھوپ میں گھاس پر لیٹ گئے کہ اب کچھ ہونے کا نہیں۔ اتنے میں چمپا کا بہت دوستانہ تار آگیا۔ اُسے میرا پیار پہنچا دینا۔ ہم خود تو لکھ نہیں سکتے۔ غرض کہ بہت بھرپور اور مسرت بھرا دن تھا جس میں کبھی کبھی یاد اور اداسی کا سایہ بھی دل پر پڑتا رہا ہے لیکن بس یوں ہی تھوڑی سی دیر کے لیے۔

میں آج کل گوگل کے افسانوں سے دل بہلا رہا ہوں۔ پرانے زمانے کے عربوں سے بھی تجدیدِ ملاقات ہو گئی ہے اور اس میں کافی لطف آرہا ہے مثلاً یہ قصہ سُنو۔

ایک بار اُموی سپہ سالار مُہلّب نے خارجی باغیوں کے خلاف لشکر کشی کی۔ اُن دنوں عرب میں دو شاعروں کا چرچا تھا اور اُن کی ہجویں اور قصیدے زبان زدِ خاص وعام تھے۔ ایک کا نام جریر تھا۔ دوسرے کا فرزدق۔ دونوں میں سخت رقابت تھی اور دونوں کے بہت سے طرفدار تھے ایک شام مُہلّب نے دیکھا کہ اُس کی چھاؤنی میں بہت شور شرابہ ہو رہا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ فوج میں بغاوت ہونے والی ہے۔ پتہ یہ چلا کہ ان دو شعراء کے دو قصائد پر بحث ہو رہی ہے۔ فریقین نے مُہلّب سے کہا کہ آپ

فیصلہ دیجیے کہ ان میں کون بہتر ہے اور ہمیں آپ کا کہا تسلیم۔ مُہلّب بولے میں ان دو کتوں کے بارے میں ہرگز کوئی فیصلہ نہیں دوں گا جس کے خلاف فیصلہ ہوگا وہ اپنی ہجووں میں مجھے نوچ کر کھا جائے گا۔ یہ بات تم اُن جنونی لوگوں سے پوچھو جن سے تم لڑنے جا رہے ہو۔ کیونکہ ان کو دونوں کی کچھ پروا نہیں ہے۔ خیر صبح ہوئی اور دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں۔ اُموی فوج سے ایک بہادر نکلا اور جیسا کہ دستور تھا اس نے صفِ اعدا میں سے کسی کو مقابلے کے لیے للکارا۔ اُدھر سے ایک خارجی جوان نکلا۔ اُموی نے کہا۔ دیکھو ہمیں لڑنا تو بہرحال ہے لیکن لڑائی سے پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو۔ خارجی نے کہا سوال کرو لیکن شتابی کرو۔ اُموی نے کہا اچھا تو بتاؤ ان دو قصائد میں سے کونسا بہتر ہے۔ خارجی بولا لعنت ہے تمھاری صورت پر۔ تم لڑنے آئے ہو یا مشاعرہ کرنے؟ ہم لوگ صرف قرآن اور احکامِ رسول جانتے ہیں۔ ہمیں ان جہنمی قصیدوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن پہلا عرب ضد کرتا رہا کہ بھئی بتا دو نا۔ آخر خارجی نے کہا اچھا تو پھر میری رائے میں جریر کا قصیدہ بہتر ہے۔ اُموی سپاہی بھی اتفاق سے جریر کا طرف دار تھا۔ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور کہنے لگا بھئی ذرا دم لو، میں اپنے ساتھیوں کو بتا آؤں۔ اگر میں مارا گیا تو انہیں کیسے پتہ چلے گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے لشکر کی طرف بھاگا انہیں خارجی کا فیصلہ سنایا اور واپس آکر لڑنے لگا۔

اچھی کہانی ہے کہ نہیں؟

(۱۲۸)

۲۷ جنوری ۱۹۵۵

غالباً لاہور شہر آج کل کرکٹ[1] کے بخار میں مبتلا ہوگا۔ یہ (DISPLACEMENT) کی بہت اچھی مثال ہے۔ اس سے مراد ہے دبی ہوئی اور ناآسودہ خواہشات کی تسکین کے

---

[1] ان دنوں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کے ٹیسٹ میچ ہو رہے تھے۔

لیے کسی بالکل مختلف دائرۂ عمل میں سرگرم ہونا جس کا ان خواہشات سے کوئی علاقہ نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی قومی مسئلہ۔ سنسر نے کاٹ دیا۔ ایسا نہیں جیسے کسی غریب — سنسر نے کاٹ دیا — کلرک نے وہ اہمیت دی ہو جو آج کل کرکٹ کو حاصل ہے۔ گویا اس نے کرکٹ کے میدان کو زندگی کے میدان کا بدل بنالیا ہے اس لیے کہ زندگی کے محنت طلب میدان میں اس کے لیے کیف و ولولے کا کوئی سامان موجود نہیں لیکن کرکٹ میچ کے ہر سنسنی خیز مرحلے میں وہ کلرک برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ خیر اگر بجائے کو اسی میں مزہ ملتا ہے تو ہم حرف گیری کیوں کریں۔ لیکن مجھے یہ رویّہ کچھ غیر صحت مند اور قابلِ افسوس نظر آتا ہے۔ شاید بڑھاپے کا اثر ہے۔

منٹو کی وفات کا سُن کر بہت دکھ ہوا۔ سب کمزوریوں کے باوجود مجھے نہایت عزیز تھے اور اس بات پر مجھے کچھ فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے۔ اگرچہ یہ شاگردی کچھ برائے نام ہی تھی اس لیے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی آتے ہوں۔ البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی تھی اور چیخوف فرائڈ اور موپساں اور نہ جانے کس کس موضوع پر گرم مباحثے ہوتے تھے۔ بیس برس گزر چکے لیکن یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ ہمارے شرفا جنھیں دورِ حاضر کے فنکار کی شکستِ دل کا نہ احساس ہے نہ اس سے کوئی ہمدردی غالباً یہی کہیں گے کہ منٹو مر گیا تو اس کا اپنا قصور ہے۔ بہت پیتا تھا۔ بہت بے قاعدہ زندگی بسر کرتا تھا۔ صحت کا ستیاناس کر لیا تھا وغیرہ وغیرہ لیکن یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ ایسے ہی کیٹس نے بھی اپنے کو مار رکھا تھا۔ برنز نے بھی۔ موزارٹ نے بھی۔ اور بھی کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب معاشرتی حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ دوسری صورت سمجھوتہ بازی کی ہے جس میں دونوں کا کچھ حصّہ قربان کرنا پڑتا ہے اور تیسری صورت ان دونوں کو یکجا کر کے جدوجہد کا مضمون پیدا

کرنے کی ہے جو صرف عظیم فنکاروں کا حصّہ ہے۔ منٹو عظیم نہیں تھا لیکن بہت دیانتدار بہت ہنرمند اور قطعی راست گو ضرور تھا۔ میرے خیال میں اس کا گھر تمہارے راستے ہی میں ہے گزرتے ہوئے وہاں سے ہو آنا اور میری طرف سے بہت پیار اور دلی تعزیت پہنچا دینا۔

۲۲ فروری ۱۹۵۵ء (۱۲۹)

میں تمہیں پرسوں بھی لکھنا چاہتا تھا اور کل بھی۔ اس لیے کہ آج کل صبحیں حسین ہیں ارغوانی گھٹائیں چھائی رہتی ہیں جیسے کسی سوچ میں غرق ہوں، ہوا کسی گم گشتہ راہ کی طرح ہولے ہولے پیڑوں کے اِردگرد گھومتی رہتی ہے اور صبح کے سست رو سورج کے ساتھ ساتھ سبزے پر سائے دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ یہ دن DANDELION[1] DAYS پڑھنے کے لیے بہت ہی موزوں دن تھے اور یہ کتاب میں نے قریب قریب ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی، بہت لطف آیا، صرف اِس کتاب کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے دور دراز بچپن کے محسوسات کے تصور سے بھی گنّے کے کھیتوں کی نشیلی باس، لیموں اور سنگترے کے نوشگفتہ پھولوں کی یاد اور خوشبو، املتاس کے پیڑوں پر جھومتے ہوئے طلائی جھومر VANGOGH[2] کی تصاویر کے ہمرنگ گندم اور سرسوں کے کھیت اور بارش کے بعد دھوپ کی حنائی رنگت، شیشم کے درختوں تلے گرم ہوا میں ٹھنڈک کی لہر، بدن کے نیچے نرم گھاس کا لمس، وہ ولولہ جو ریلوے انجن کی سیٹی اور چھک چھک سے یا پانی میں کاغذ کی کشتیاں بہانے سے ہمیشہ دل میں اُٹھتا تھا، ایسے دن جن میں خوشی سے سانس رُکنے لگتا تھا، ایسے دن بھی جو کبھی خوف اور ڈر سے سیاہ رنگ نظر آتے تھے

اور کبھی درد اور بیماری سے تلوار کی طرح کٹیلے، جب میں یہ کتاب پڑھ رہا تھا تو ذہن میں یہ دوسری کتاب بھی لکھتا جا رہا تھا، لیکن میری کتاب غالباً کبھی لکھی نہیں جائے گی، یا شاید لکھی بھی جائے۔

نقوش کا شخصیات نمبر مل گیا ہے، تمہارا خاکہ بھی پڑھ لیا ہے، بہت اچھا ہے اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے اپنے میاں کی کچھ طرفداری کی ہے، باقی لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے، اگر ان مرقعوں سے اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سبھی ادیب فرشتے اور ولی اللہ ہیں، سوائے بچارے منٹو کے جس کا اس کے بھانجے حامد جلال نے شاید کچھ زیادہ سختی سے محاسبہ کیا ہے، اب خیال آتا ہے کہ اس شمارے کے لیے مجھے بھی کچھ لکھنا چاہیئے تھا، اس لیے کہ کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہیں جو بڑے ادیب نہ سہی لیکن جن کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا۔ جیسے رشید جہاں تھیں اور کچھ ایسے تھے جن کی صحیح اہمیت کا لوگوں کو اندازہ نہیں جیسے تاثیر تھے، خیر کچھ مضائقہ نہیں، پھر کبھی سہی۔

(۱۳۰)

۶ مارچ ۱۹۵۵ء

ایک مہینہ اور گزر گیا اور تھوڑے دنوں میں ایک اور گزرنے پر آجائے گا، آج کل کچھ احساس نہیں ہوتا کہ وقت جلدی گزر رہا ہے یا آہستہ گزر رہا ہے، یوں لگتا ہے کہ وقت کا وجود ہی باقی نہیں، ایسے ہے کہ جیسے ایک ہی دن اور ایک ہی رات بار بار گردش کر رہے ہیں، وہی دن جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سے وہی رات شروع ہو جاتی ہے اور رات کے خاتمے پر وہی دن پھر لوٹ آتا ہے، گویا فردا و دی کا تفرقہ ہی باقی نہیں رہا، لیکن ہر چیز کو حقیقت تو وقت ہی بخشتا ہے اور جب وقت غیر حقیقی ہو جائے تو ہر چیز بے حقیقت ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اپنے دل کا درد بھی، اس سے کبھی تسکین ملتی ہے اور کبھی بوریت ہوتی ہے، ویسے ذہن میں ہر وقت یہ احساس ضرور رہتا ہے کہ یہ غیر حقیقی کیفیت بھی غیر حقیقی ہے اور وقت بظاہر جمود کے باوجود بہر حال گزر رہا ہے اور زندگی کی اچھی چیزیں مسلسل

قریب آتی جارہی ہیں۔ اس خیال کا سلسلہ شاید ابھی اور آگے چلتا لیکن ہماری درست گلہری نے بیچ میں ٹوک دیا جو مجھ سے دو قدم پر پھول دار پودے سے کشتی لڑ رہی ہے۔
اس نے پچھلے پنجوں پر کھڑے ہو کر اپنے سر کے برابر ایک پھلی تو بیج گرا ئی اور اپنے سے تین گنا اونچی شاخیں جھکانے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ باقی خزانہ بھی ہاتھ آجائے۔ اگر ہم میں شہریت کی حس زیادہ ہوتی تو شاید یوں بیٹھ کر دیکھتے رہنے کے بجائے ہم اسے بھگا دیتے، آخر یہ باغیچہ پبلک کی ملکیت ہے۔ اور ہیڈ مالی کی اجازت کے بغیر پھول توڑنا سخت منع ہے، پھر جیل میں پودوں کو نقصان پہنچانا جرم جس کی ضابطہ نمبر فلاں فلاں کے تحت مجھے فوراً رپورٹ کرنی چاہیے۔ لیکن کچھ کرنے کے بجائے میں صرف اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں اور یہ ٹھیک بھی ہے، ہمارے عالم فاضل لوگ کہتے ہیں کہ ادیب کا کام صرف لکھنا ہے، ایسے عملی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ البتہ جب ہیڈ مالی آکر اس پودے کا حال دیکھیں گے تو یقیناً ہمارے فلسفے پر بہت برہم ہونگے۔

(۱۳۱)

۱۷ مارچ ۱۹۵۵ء

یہ خط پہلے لکھنا چاہیئے تھا لیکن موسم ایسا اچھا تھا کہ کاہلی طاری رہی اور خط لکھنے کے بجائے ہم رادھا کرشنن[2] کی ہندو دیویوں اور دیوتاؤں سے اختلاط کرتے رہے۔ موصوف نے بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ انساں نے اپنی فطرت کے مطابق دیوتا کیسے ایجاد کئے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان ہی دیوتاؤں کے وہ خود بھی قائل ہیں۔ استدلال ان کا یہ ہے کہ چونکہ مذہب کا وجود لازمی ہے اس لیے کوئی نہ کوئی ایسی ہستی بھی لازم ہے جس کی پرستش کی جاسکے، اس لیے کسی کو کوئی نہ کوئی ذاتی معبود ضرور چاہیے، خواہ عقل اور فلسفہ کچھ ہی

۱؎ سابق میجر اسحاق

۲؎ سابق صدر ہند، اور کتاب ہندو فلسفے کے مصنف۔

کہیں ۔ غالباً جس چیز کو بھی ہم عزیز رکھتے ہیں یا جس کی طلب ہوتی ہے (جیسے مجھے سگریٹ کی ہے) اس کے لیے ہم ایسے ہی جواز پیدا کر لیتے ہیں۔

افتی سے بہت مختصر ملاقات ہوئی اور زیادہ بات نہ ہو سکی۔ مجھے بالکل یاد ہی نہیں رہا کہ وہ دو برس سے مجھ سے ملنے نہیں آئے اس لیے کچھ گلہ وشکوہ کرنا چاہیے تھا۔ اب وہ اگلے مہینے آنے کا وعدہ کر گئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اب جیل خانے سے باہر ہی ملاقات ہو گی دراصل اس کا مجھے کوئی گلہ بھی نہیں ہے جو کسی سے بن پڑے بہت ہے

(۱۳۲)

۲۶ مارچ ۱۹۵۵ء

مجھے افسوس ہے کہ کل ہم خدا حافظ نہ کہ سکے مجھے امید ہے کہ تم اس نئے قضیے[1] کا اپنے دل پر بہت زیادہ اثر نہیں لو گی، قانون جو بھی حق دیتا ہے اسی پر بہر صورت اصرار کرنا چاہیے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نئی صورت حال سے کچھ ایسا فرق بھی نہیں پڑے گا، اس لیے میں تو مطمئن ہوں البتہ تمہارے بارے میں کچھ پریشانی ضرور ہے، کرس کی علالت کے بارے میں بھی تشویش ہے، اس لیے مجھے اپنی اور ان کی خیریت سے بذریعہ تار مطلع کر دینا (خط تاخیر سے ملے گا)

اب ہماری ملاقات ہر دوسرے ہفتے جمعرات کے دن ہو سکے گی اور اس کے لیے ڈی آئی جی، سی آئی ڈی کی اجازت درکار ہو گی، گزشتہ بار ہماری ملاقات نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم جلد سے جلد یہاں آؤ۔ ۷ اپریل کو بھی۔

---

[1] ۲۵ مارچ ۱۹۵۵ کو لاہور ہائی کورٹ نے فیض کو ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا تھا جو ایلیس اپنے ساتھ لے کر لاہور سے منٹگمری پہنچیں لیکن فیض کو جیل خانے کے اندر ہی سیفٹی ایکٹ کے تحت دوبارہ گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ چنانچہ خط ۱۳۲ تا ۱۳۵ سیفٹی ایکٹ کے اسیر کی حیثیت میں لکھے گئے۔

۳۰ مارچ ۱۹۵۵ء (۱۳۳)

آج پیر ہے۔ دو دن پہلے جو خط لکھا تھا نہ جانے تم تک پہنچا کہ نہیں۔ کاش میں تمہاری پریشانی کا بوجھ کم کرنے کے لیے کچھ کر سکتا لیکن سوائے پیار بھیجنے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا اور پیار میں شب و روز ارسال کرتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ انصاف اور نیکی دنیا میں پلٹ آئیں اور دکھی دلوں کی دلجوئی کا سامان بہم پہنچائیں۔ جب تک صبر کرو مری جان اور زیادہ پریشان نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل لیکن تمہارے وکلاء بہت اچھے ہیں اور جو وہ مشورہ دیں اس پر عمل کرو۔ میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ غالباً جب ہماری ضمانت منسوخ ہو جائے گی تو ہم پھر سزا یافتہ ملزم بن جائیں گے اور ہمارے وکلاء جب چاہیں ہمیں نظر بندی کے منصب اعلیٰ سے (اس کے تکلیف دہ قواعد و ضوابط سمیت) چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔ اس لیے ہماری صورت احوال نہ پہلے سے اچھی ہے نہ بری۔ تو مسکراتی رہو۔ میں خوش و خرم ہوں۔

۳ اپریل ۱۹۵۵ء (۱۳۴)

تمہارا خط اور تار پہنچے اس لیے دل پہلے سے بشاش ہے۔ شاید اسی رعایت سے موسم بھی بہتر ہو گیا ہے اور گزشتہ چند دن کافی خوشگوار گزرے۔ البتہ اس قانونی قصے کی وجہ سے جیل کی زندگی کا خاموش توازن کچھ گڑبڑ ہو گیا۔ امید ہے کہ یہ قصہ جلد نپٹ جائے گا۔ اب جو یہ ہنگامہ گزر چکا ہے تو یوں لگتا ہے کہ یہ بھی جیل کے معمولات ہی کا حصہ تھا۔ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ کرس کی علالت تشویشناک نہیں ہے۔ اگرچہ ان سے ملاقات نہ کر سکنے کا افسوس ہے۔ یہ بھی افسوس ہے کہ یہ سب گڑبڑ بچوں کے امتحانات کے دوران میں ہوئی۔ امید ہے وہ زیادہ پریشان نہ ہوئے ہوں گے۔

سُنا ہے حفیظ جالندھری صاحب نے پھر شادی رچالی ہے۔ سینسر کا قصہ بیچ میں نہ ہوتا تو انہیں ضرور مناسب سہرا لکھ بھیجتا لیکن اب تو اپنے تک ہی رکھنا پڑیگا۔

(۱۳۵)

۹ اپریل ۱۹۵۵ء

امید ہے تم خیریت سے گھر پہنچ چکی ہو گی۔ ملاقات غنیمت تھی لیکن تمہیں اس قدر دل برداشتہ دیکھ کر رنج ہوا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ نئی دل شکنی بہت تکلیف دہ تھی لیکن بہتری کی اُمید رکھنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ ہمارے لیے تو یہ اختیاری بات نہیں امرِ مجبوری ہے۔ اگرچہ ہماری عمر کے چند بیش قیمت سال برباد ہو گئے لیکن زندگی میں پھر بھی بہت دیکھنے کو باقی ہے۔ یہ بہت عام سی بات ہے اور میں کئی بار دہرا بھی چکا ہوں لیکن اس کے باوجود صحیح ہے اور جب تک زندگی باقی ہے صحیح رہے گی اور ہماری زندگی کے خاتمے پر اوروں کے لیے ویسی ہی سچ ہو گی۔ تو آؤ دل کو سنبھالیں اور اگلی فصلِ گل کا اس وقت تک انتظار کریں جب کہ ہجومِ گل پر سے خزاں کا سایہ اُٹھ چکا ہو گا۔ اب رہائی کے دنوں کا شمار ختم ہو چکا تو دل ایک بار پھر ٹھہر گیا ہے البتہ ذہن کسی مشقّت پر آمادہ نہیں ہوتا اس لیے میں نے تاریخ اور فلسفے کی کتابیں طاق پر رکھ دی ہیں اور آج کل محض خرافات سے دل بہلا رہا ہوں۔ یہ تفریح تو اچھی ہے لیکن کبھی کبھی دل ملامت کرنے لگتا ہے اگر ڈرائنگ اور ڈیزائن کے اصولوں پر کوئی ابتدائی کتاب مل سکے (جیسی میٹرک کے طلبہ استعمال کرتے ہیں) تو بھجوا دو۔

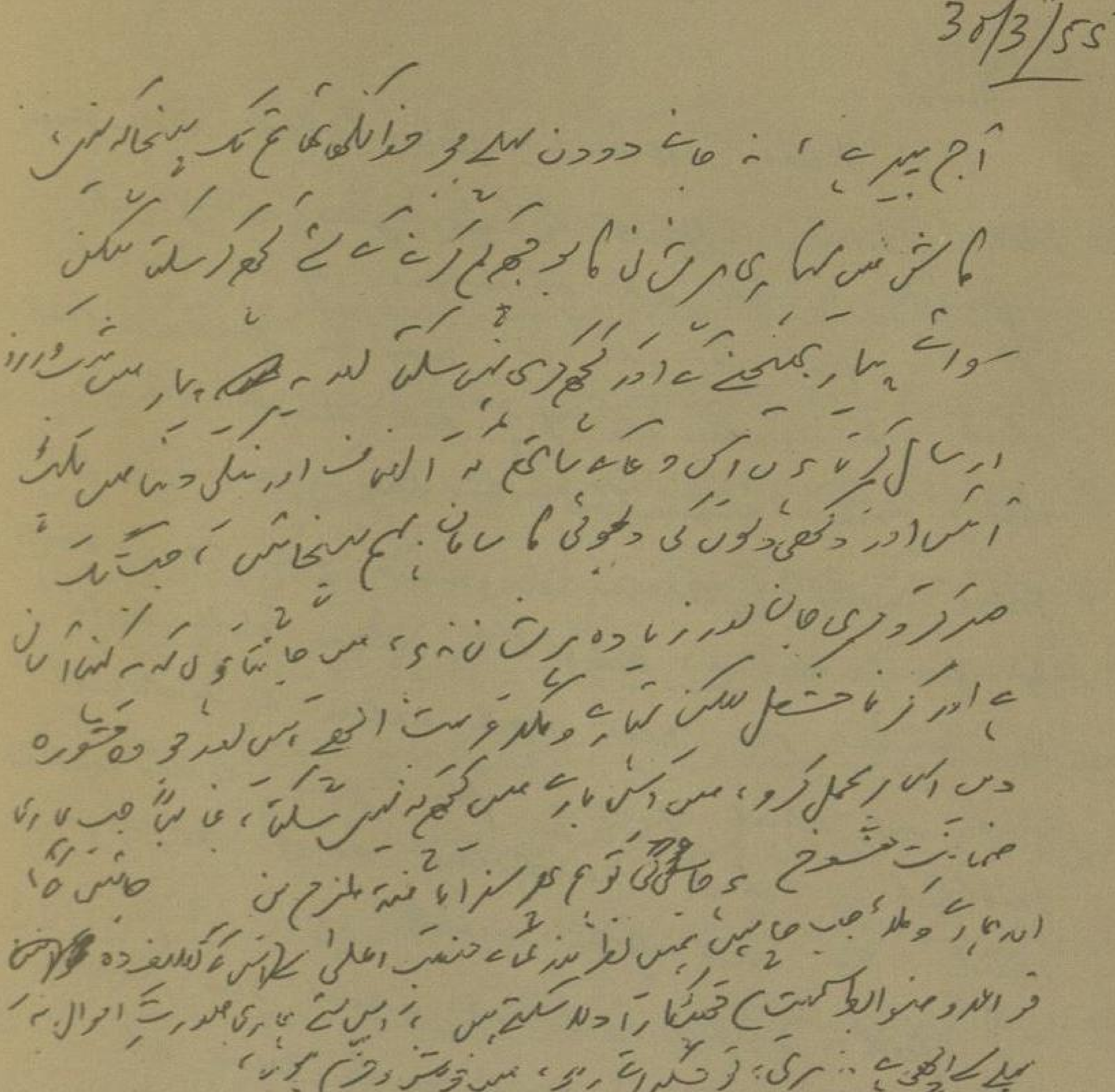
Sunday

Dearest

I have received your letters. I am sorry that mine appears to have gone astray - it is difficult to tell at which end. If it hasn't got to you so far it may be presumed lost which is rather a pity even though I had nothing very momentous to say. You need not grieve over it, however, because you can accept this one as a substitute. I can still write the routine one next week unless the 'mulaqat' turns up, which judging from your letter appears doubtful. I shall nevertheless wait for it until the end of the week.

I feel a bit disturbed about your house situation as I don't quite know what is going on. But as there is nothing I can do about it I am hoping for the best — or trying to. Perhaps you should also get some

بخطِ فیض ـــــــ انگریزی خط (اصل)

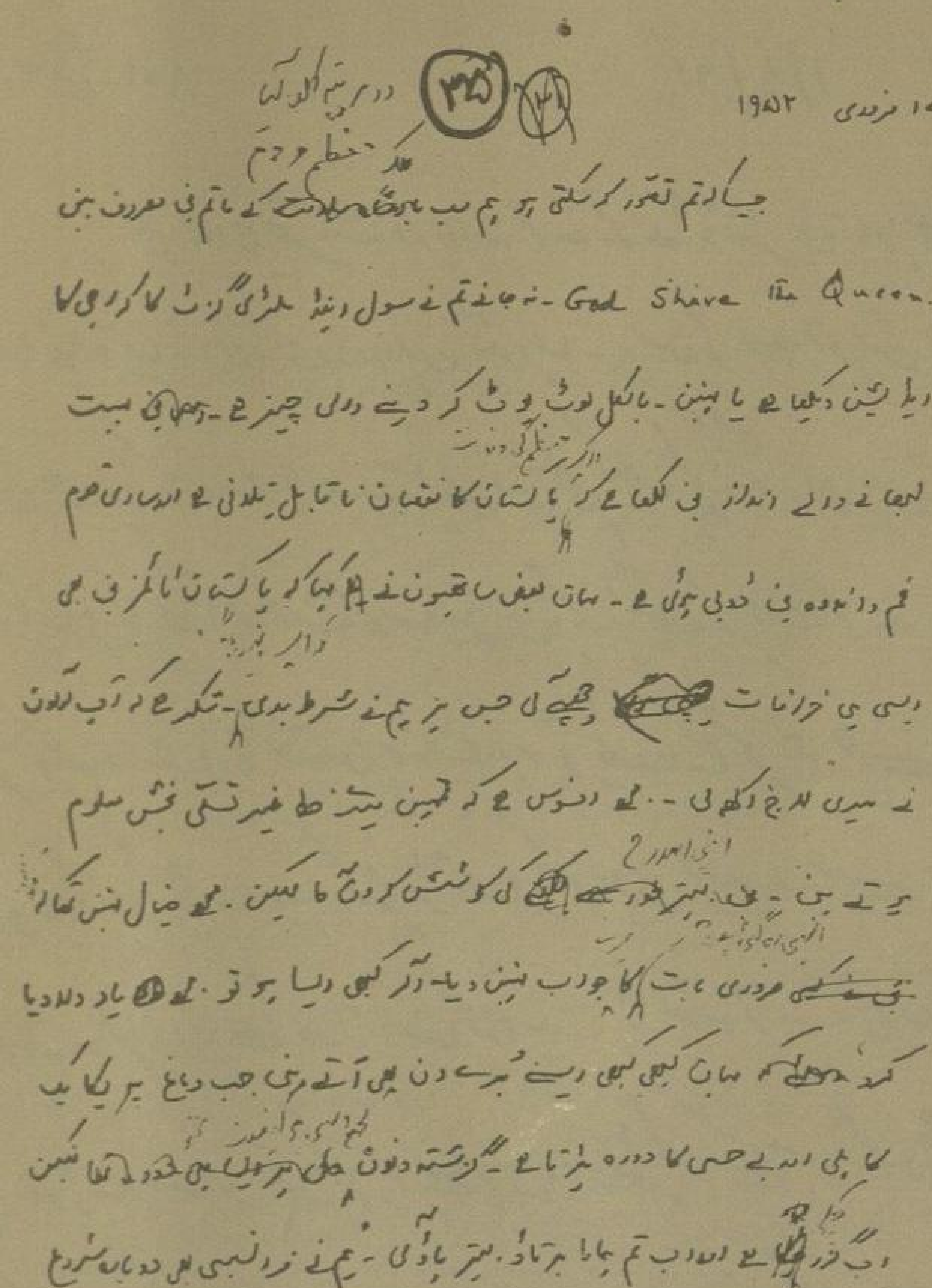


بخطِ فیض ——— انگریزی سے اردو ترجمہ

۲۰ مئی ۱۹۵۲ ۱/۶/۶۱

کل تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لیے دفتر میں تار بھجوایا ہی تھا
کہ تمہارا خط آ گیا۔ اس لیے میں نے واپس منگوا لیا۔ یہ سن کر بہت خوشی بھی ہوئی اور
تسکین بھی ہوئی کہ تمہاری طبیعت اچھی نہیں تو پھر بھی ایسی زیادہ بری بھی نہیں۔ میں نے شروع
سے کتنا اور ایسا سوچا کہ صحت کے معاملے میں ایک ہلکے پن کی بات کرنے سے۔
پیشتر دیکھ بھال کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم جیسے لوگ جب
تو کون اور کیا ہے کا حساب لگانا پڑتا ہے لیکن اسی سبب سے ہمیں ایسی
زیادہ توقع کرنی چاہیے ورنہ اس کفایت کا شعور ختم ہو جاتا ہے
جب ہم تھوڑے بہت رنج میں رہتے ہیں اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ہم گھاٹے میں
کہ کل خوراک میں کسی چیز کے نہ ہونے کا بھی حرج ہے۔ ڈاکٹر اس کا اثر ہی لگاتے
تیار کر سکتے ہیں کہ خوراک بالکل متوازن کیسے رکھا جائے۔ لاہور میں
چیزیں خرید کر اس کو اس طرح میری کتابوں میں ... سے
متوازن اور صحت بخش غذا اس سے کہیں زیادہ مختلف نہیں ہو جاتی

ترجمے کا پہلا مسودہ —— فیض کے تصحیح کرنے سے پہلے



۱۷ فروری ۱۹۵۲

جیسا تم تصور کر سکتی ہو ہم سب بادشاہ سلامت کے ماتم میں مصروف ہیں

God Save the Queen۔ نہ جانے تم نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کا کارٹون

دیکھا ہے یا نہیں۔ بالکل لوٹ پوٹ کر دینے والی چیز ہے۔ مجھے بھی بہت

لبھانے والے انداز میں لکھا ہے کہ پاکستان کا نقصان ناقابل تلافی ہے اور ساری قوم

غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہاں بعض ساتھیوں نے کہا کہ پاکستان ٹائمز میں بھی

ویسی ہی خرافات چھپی تھی جس پر ہم نے شرط بدی۔ شکریہ کہ آپ لوگوں

نے میری لاج رکھ لی۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں پیٹر کے خط غیر تسلی بخش معلوم

ہوتے ہیں۔ میں بہتر ... کی کوشش کروں گا لیکن۔ مجھے خیال نہیں تھا

کہ کسی ضروری بات کا جواب نہیں دیا۔ اگر کبھی ویسا ہو تو مجھے یاد دلا دیا

کرو۔ ... کہ یہاں کبھی کبھی ایسے برے دن بھی آتے ہیں جب دماغ پر ایک ایک

کا ہی اور بے حسی کا دورہ پڑتا ہے۔ گزشتہ دنوں جیل ... حدود ... تھا لیکن

اگر ... ہے اور اب تم جانا ہو تو ... بہتر ہوگئی۔ ہم نے ... دوبارہ شروع

کر دی ہے۔ اب اس زبان کے متعلق بات ذہن نشین ہونے لگی ہیں۔ ...

ترجمے کا دوسرا مسودہ ——— فیض کی تصحیح کے بعد

چھیمی اور میزی کے نام خطوط

(خط ۱) تمہارے بہت اچھے خطوں کا بہت شکریہ۔ ان سے ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ امّی کہتی ہیں کہ وہ تمہیں ایبٹ آباد بھیجنا چاہتی ہیں۔ اگر لاہور میں بہت گرمی ہے تو اچھا ہے کہ تم چلی جاؤ۔ یہاں گرمی زیادہ نہیں ہے ہر وقت ہوا چلتی ہے اور ہر روز کھانے کو آم ملتے ہیں۔ بہت سا پیار۔

(خط ۲) ہم راضی خوشی ہیں۔ امّی نے لکھا ہے کہ تم دونوں بہت اچھی بچیاں ہو۔ یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی۔ یہاں ہمارے بہت سے دوست ہیں اور سب بہت خوش رہتے ہیں۔ جب گھر آئیں گے تو تم سے مل کر خوب مزے کریں گے۔ اُمید ہے کہ ہم جلد آجائیں گے۔ تم اپنی امّی کا ہاتھ بٹاتی رہو اور زیادہ شرارت نہ کرو۔

(خط ۳) تمہارے پیارے خط کا بہت شکریہ۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ اب تمہاری امّی اور میرے پاس ایک بیٹی کے ساتھ ایک بیٹا بھی ہے۔ بیٹوں کو بہت بہادر اور بہت اچھا ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ انہیں اپنی ماں اور بہنوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم بہت اچھے اور بہادر ہو گے۔ میرا کرسمس کا تحفہ بہت اچھا تھا سب لوگوں نے پسند کیا۔ کل ہمارے ہاں کرسمس پارٹی ہوگی، پھر ایک مشاعرہ بھی ہوگا۔ بہت سا پیار۔

(خط ۴) تمہارا بہت اچھا خط ملا، آجکل تمہیں چھٹی ہوگی، ہمیں بھی چھٹی ہے۔ تھوڑے دنوں میں امّی آئیں گی، تم بھی آؤ گی، پھر ہم خوب باتیں کریں گے۔ امّی تمہیں کراچی بھی لے جائیں گی، وہاں سمندر بھی ہے جہاز بھی ہیں اور چڑیا گھر بھی ہے، میں نے سُنا ہے وہاں کے چڑیا گھر میں مگرمچھ بھی ہوتے ہیں۔ ہماری بلی اور اُس کا بچّہ بھاگ گئے تھے۔ بلّی آگئی ہے لیکن بچّہ نہیں آیا، شاید وہ بھی آجائے۔

ہم شام کو خوب کھیلتے ہیں، کبھی کبھی باہر سے آئس کریم بھی آتی ہے۔ جب تم آؤ گی تو تمہیں بھی کھلائیں گے، بہت سا پیار۔

(خط ۵) امّی تمہارے خط لائی تھیں۔ بہت اچھے خط تھے۔ امّی اب گھر پہنچ گئی ہوں گی۔ امّی پھر آئیں گی تو شاید تم کو بھی لے آئیں۔ اگلے مہینے میں گرمی کم ہوجائے گی تو تم آسکو گی۔ تمہارے اسکول میں چھٹی بھی ہوجائے گی۔ ہم تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ بہت سا پیار۔

(خط ۶) تمہیں سالگرہ مبارک ہو۔ اُمید ہے کہ سالگرہ کی دعوت اچھی ہوئی ہوگی۔ تم نے بہت اچھا خط لکھا تھا جس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔

(خط ۷) تمہارا بہت پیارا خط ملا۔ تمہاری تصویریں بھی ملیں۔ تم دونوں کتنی بڑی ہوگئی ہو۔ خیر یہاں آؤ گی تو دیکھیں گے۔ ہم تمہیں عید کے دن بہت اچھا کھانا کھلائیں گے۔ اور بھی بچے آئیں گے۔

شاید ہم تمہیں گانا بھی سنائیں گے۔ ہنسی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم لوگ بہت اچھی قوالی کرتے ہیں۔ تمہارا لطیفہ بہت اچھا تھا، تمہارے امتحان کا نتیجہ سن کر خوشی ہوئی، حساب میں کم نمبر آئے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ حساب تمہارے ابّا کو بھی نہیں آتا تھا۔ یہاں موسم اچھا ہے اور گرمی بہت کم ہے۔ رات کو کافی ٹھنڈک ہوتی ہے اور دن کو بھی بہت ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔

یہاں سب لوگ اچھی طرح ہیں اور تم دونوں کو پیار بھیجتے ہیں۔

(خط ۸) تمہارے محبت بھرے خط کا شکریہ۔ اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب تم بہت اچھی طرح لکھتی ہو۔ اردو میں خط لکھنا بھی تمہیں سیکھ لینا چاہیے۔

آجکل یہاں بہت گرمی ہے۔ ہمارے باغیچے کے پھول ختم ہو گئے ہیں۔ دوسروں کے پاس تو ایک آدھ بھی نہیں البتہ ہمارے پاس چند ایک پھول ابھی موجود ہیں۔ کچھ تو سفید پیٹونیا ہیں۔ کئی رنگوں کے کچھ زینیا ہیں۔ سورج مکھی کے پھول بھی نکلنے لگے ہیں۔ سویٹ ولیم اور ہالی کاک کے چند ایک درختوں میں بھی پھول کھلتے ہیں بس چند روز بعد بارشیں شروع ہو جائیں گی۔ تب ہمارا باغیچہ پھر خوبصورت ہو جائے گا۔ تم جانتی ہو کہ جب گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے تو لوگ باہر نہیں نکلتے اور اس وجہ سے پھولوں کو نہیں دیکھتے۔ اور یہ پھول اُن سے خفا ہو کر چلے جاتے ہیں۔ جب کچھ ٹھنڈک ہو جاتی ہے اور لوگ باگ چلتے پھرتے رہتے ہیں تو پھول بھی نکل آتے ہیں (انہیں خوش کرنے کے لیے)۔

اُمید ہے کہ تمہاری دعوتیں مزیدار ہوئی ہوں گی۔ ہمارے ہاں کوئی دعوت نہیں ہوئی ہے کیونکہ سب روزے رکھتے ہیں۔ بتاؤ تمہیں کیا تحفہ دیا جائے؟ جو تحفہ مانگو گی ملے گا۔

میں نے چھیمی کی تصویر اخباروں میں دیکھی۔ بہت اچھی تھی۔ اگلے سال تم بھی کوئی انعام پاؤ گی۔ تب تم دونوں کے ہنس مکھ چہرے اخباروں میں چھپیں گے۔

تمہارے اور چھیمی کے لیے ایک لطیفہ لکھ رہا ہوں "جب حضرت نوحؑ کی کشتی سے جانور اُتر رہے تھے تو ہاتھی نے پسّو سے کہا جو ہاتھی کے پیچھے تھا، بھئی مجھے مت ڈھکیلو!"

تصحیح فرمالین

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۲	۹	یاد نہین آتی ہین	یاد مین آتی ہین
۵۳	۱۲	یاد کے تکلیف‌دہ پہلو یاد مین نہین آتے	تکلیف‌دہ پہلو یاد نہین آتے
۹۲	۱۱	نظر جمائے رکھین گے	نظر جمائے رکھین
۱۴۴	۱	ایک طرف جزباتی نہین ہین	ایک طرف جزباتی بہنین ہین
۱۷۱	۱۷	باتین معلوم ہین	باتین معلوم ہوتی ہین

پاک پبلشرز لمیٹڈ